

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں  
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔



منجانب۔

سیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان



۷۸۶  
۹۲۱۱۰  
یا صاحب الزماں اور کئی

DVD  
Version

# لبیک یا حسینؑ

نذر عباس  
خصوصی تعاون: رضوان رضوی

## اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری -

SABIL-E-SAKINA

Unit#8,

Latifabad Hyderabad  
Sindh, Pakistan.

[www.sabelesakina.page.tl](http://www.sabelesakina.page.tl)

[sabelesakina@gmail.com](mailto:sabelesakina@gmail.com)



# انسانِ کامل

اُستاد شہید مرتضیٰ مطہری

jabir.abbas@yahoo.com

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

# انسانِ کامل

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

سبیلِ سکینہ  
چھوڑا باولعیش آباد، پونٹ نمبر ۷۶-۸

یکے از مطبوعات

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان  
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی ۲



تالیف	آیۃ اللہ شیخ مرتضیٰ مطہری
ترجمہ	محمد فضل حق
اصلاح و نظر	کاظم علی گجراتی
کتابت	اشرف راحت
طباعت	مقصود پبلیکیشنز لارچی

طبع ہفتم ۲۰۰۸ء مطابق ۱۴۲۹ھ

جلد حقوق حق ناشر محفوظ ہیں۔ یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ ہذا کی پیشگی اجازت حاصل کئے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل، تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریہ کر ائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لئے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

# اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدد ندیاں بھڑکتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما میثار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اسے اعلیٰ احکام، بلند اصولوں، محکم دلائل، ناقابل تردید تفویق اور مسلمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمہارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوص دل سے عمل کرو اس کے معتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

## کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ سید ابوالقاسم موسوی خوی<sup>ؒ</sup> کا قائم کردہ یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان اب حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیستانی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں دنیا بھر میں معتبر اسلامی لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرنا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلیتِ رسل<sup>ؑ</sup> نے ایک مقدس ایانت کے طور پر ہمارے پر دیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں متعدد کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مضمولات، اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ ادارہ ہذا تقریباً ۵۰۰ مدارس و مکاتب میں زیر تعلیم بچوں اور جوانوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

دعوتِ اسلام ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لئے ہم سب کو باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کار خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں عام کیا جاسکے۔

دعا ہے کہ خداوند منان بحق محمد و آل محمد<sup>ؑ</sup> ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نفیسی

وکیل حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیستانی دام ظلہ العالی



# فہرست

- ۹ کامل اور غیر کامل انسان
- ۱۰ اسلام کی رو سے کامل انسان کو پہچاننے کا معیار
- ۱۳ کامل سے کیا مراد ہے ؟
- ۱۴ اَکْمَلْتُ اور اَنْعَمْتُ میں فرق
- ۲۳ آفاتِ رُوح
- ۳۶ مختلف موجودات کا کمال
- ۷۴ انسان کی ماہیت
- ۱۰۱ خود شناسی خدا شناسی کی تمہید ہے
- ۱۱۰ انسان کو کس چیز سے نجات چاہیے ؟

- ۱۳۸ کمال اور اخلاق کا رابطہ
- ۱۶۲ مکتبِ انتفاع
- ۱۷۰ کامل انسان اور مختلف نظریات (۱)
- ۱۹۳ کامل انسان اور مختلف نظریات (۲)
- ۲۲۰ کامل انسان کے بارے میں اسلامی نظریہ
- ۲۳۵ انسان کا فطرت سے رابطہ
- ۲۴۶ کامل انسان اور مختلف نظریات (۳)
- ۲۷۴ مختلف مکاتیبِ فکر کے نظریات کی تفصیل (۴)
- ۳۰۲ مختلف مکاتیبِ فکر کے نظریات کی تفصیل (۵)
- ۳۲۰ دنیائے مغرب میں ایثار و محبت

## تعارف

زیر نظر کتاب میرے 'انسانہ کاملہ' کے موضوع پر گفتگو  
 کہ گئی ہے۔ یہ استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ کی ۱۱ تقریر  
 کا مجموعہ ہے جو ایران میں اسلامی انقلاب کے کامیابی سے  
 قبل کہ گئی تھیں۔

انہی تقریر میں استاد شہید نے 'انسانہ کاملہ'  
 کے بارے میں مختلف مکاتب فکر کے افکار و نظریات کا تجزیہ  
 کرتے ہوئے اسلام کے 'انسانہ کاملہ' کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔  
 اپنے امام علیہ السلام کے ذاتِ اقدسہ کو اسلام کے 'انسانہ کاملہ'  
 کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس کتاب کے تیاری میں اس بات کو ملحوظ رکھا  
 گیا ہے کہ استاد شہید کی تقریر کو حرف بہ حرف لکھا  
 جائے، اس لیے آپ کو کہیں کہیں جملہ بندہ میں غامض  
 محسوس ہوگا اگرچہ ہم نے بعض جگہ پر بہ اقتضائے ضرورت  
 معترضہ میں تبدیلیاں کیے بغیر جملہ بندہ میں تبدیلیاں کی ہیں

واللہ اعلم



[jabir.abbas@yahoo.com](mailto:jabir.abbas@yahoo.com)

## پہلی نشست

# کامل اور غیر کامل انسان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ بَارِئُ الْخَالِقِ أَجْمَعِينَ وَالصَّلَاةُ  
وَالسَّلَامُ عَلَى عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَحَبِيبِهِ وَصَفِيٍّ وَحَافِظِ سِرِّهِ وَمُتَلَمِّ  
رِسَالَتِهِ سَيِّدِنَا وَنَبِيِّنَا وَمَوْلَانَا أَلِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَالِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ الْمُعْصُومِينَ أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَمِيدُ  
فِي الْقُرْآنِ الْمَجِيدِ : وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ  
إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنْتَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ.

جب براہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ انہوں  
نے پوری کر دی تو خدا نے فرمایا : میں تمہیں لوگوں کا امام بناتا ہوں انہوں  
نے عرض کیا کہ بارالہا! میری ذریت میں سے بھی امام مقرر فرما۔ خدا نے  
فرمایا کہ میرا یہ عہدہ متمکروں کو نہیں ملے گا۔ (سورۃ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

ہمارا موضوع بحث ہے اسلام کے نقطہ نگاہ سے کامل انسان۔ کامل  
انسان سے مراد وہ انسان ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ اور ان کے  
مقابلے میں اعلیٰ اور ارفع ہو۔ اب آپ اسکو جن الفاظ سے بھی چاہیں تعبیر کریں۔  
بہت سی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی کامل اور غیر کامل بلکہ معیوب اور

سالم ہوتا ہے یعنی انسان معیوب بھی ہوتے ہیں اور سالم بھی ہوتے ہیں پھر سالم انسان کی بھی دو قسمیں ہیں:

- ① سالم انسان جو کامل ہوتا ہے
- ② سالم انسان جو غیر کامل ہوتا ہے

اسلام کے نقطہ نگاہ سے کامل یا مثالی انسان کا پہچانا ہم مسلمانوں پر اس لیے واجب اور لازم ہے کیونکہ وہ عالم انسانیت کے لیے نمونے اور مثال کا حکم رکھتا یعنی اگر ہم کامل انسان بننا چاہیں (کیونکہ اسلام ہمیں کامل انسان بنانا چاہتا ہے) اور اپنے آپ کو انسانی کمال کے درجے تک پہنچانا چاہیں تو فقط اسلامی تعلیم و تربیت کے تحت ہی ممکن ہے۔

چنانچہ ہمیں بتانا چاہیے کہ کامل انسان کیسا ہوتا ہے؟ کامل انسان کا چہرہ (یعنی اس کا روحانی اور معنوی چہرہ) کیسا ہوتا ہے؟ کامل انسان کا معنوی وجود کیسا ہوتا ہے اور کامل انسان کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ — تاکہ ہم اپنے معاشرے، اپنے افراد اور خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی بنائیں۔ لیکن اگر ہم اسلام کی نظر میں ایک کامل انسان کو نہ پہچانیں تو ہم اسلام کی رو سے قطعاً ایک نام کامل مسلمان یا دوسرے لفظوں میں ایک کامل انسان نہیں بن سکتے، خواہ وہ کابلت اعتباری ہی کیوں نہ ہو۔

## اسلام کی رو سے کامل انسان کو پہچاننے کا معیار

اسلام کے نقطہ نگاہ کے مطابق کامل انسان کو پہچاننے کے دو طریقے ہیں: پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں قرآن نے اور پھر سنت نے اپنے بیانات میں



کامل انسان کی تعریف کیسے کی ہے۔ اگرچہ قرآن اور سنت میں ”کامل انسان“ کا نہیں بلکہ ”کامل مسلمان“ اور ”کامل مومن“ کا ذکر آیا ہے لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ کامل مسلمان کے معنی ایک ایسے انسان کے ہیں جو اسلام میں کمال کو پہنچا ہو اور کامل مومن سے مراد وہ انسان ہے جو ایمان کی بدولت کمال کو پہنچا ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن اور سنت نے کامل انسان کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں اور اس کے چہرے، سرے کے لیے کونسے خطوط کھینچے ہیں؟ حسن اتفاق سے قرآن اور سنت میں اس موضوع پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم انسانوں میں سے معیاری افراد کو مچا نہیں اور انہیں اپنے لیے نمونہ بنائیں۔ ان افراد کو جن کے بارے میں ہمیں اطمینان ہو کہ وہ درجہ کمال پر پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو اسی انداز میں ڈھالا ہے جیسے خدا چاہتا ہے اور جیسے اسلام چاہتا ہے۔ یعنی وہ معیاری شخصیت کے مالک اور کامل انسان بن گئے ہیں۔ اسلام کا مطلب یہ کامل انسان فقط ایک نشو و نما، خیالی اور ذہنی انسان نہیں کہ جس کا کوئی ٹکا ہری وجود نہ ہو ایسا اس لیے نہیں کہ بہت سے انسواء ایسے گزرے ہیں جو انسانیت کے بلند ترین مدارج پر فائز ہوئے یا اس سے ایک یا دو درجے نیچے تک پہنچے۔ خود حضرت رسول اکرم اسلام کے کامل انسان کا ایک نمونہ ہیں۔

اور امام علیؑ کامل انسان کا ایک اور نمونہ ہیں۔

اس لیے علیؑ کی پہچان۔ اسلام میں کامل انسان کی پہچان ہے لیکن یہ علیؑ کی پہچان ہونی چاہیے نہ کہ یہ ان کے نام و نسب سے ان کی رسمی پہچان ہو۔

بعض اوقات ایک انسان علیؑ کو شناختی کارڈ کے اندراجات کی حد تک ہی پہچانتا ہے یعنی — ان کا نام علیؑ تھا — وہ ابوطالب کے بیٹے تھے اور ابوطالب — عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ مزید یہ کہ علیؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن عبدالمطلب تھیں۔ وہ فاطمہ زہراؑ کے شوہر اور حسنؑ و حسینؑ کے والد تھے۔

بہت ہوا تو یہ جان لیا کہ علیؑ کس سال میں پیدا ہوئے — کس سال میں شہید ہوئے اور انہوں نے کون کونسی جنگیں لڑی تھیں۔ یہ سب باتیں شناختی کارڈ کی سی پہچان میں آتی ہیں۔ یعنی اگر ہم علیؑ کے لیے ایک شناختی کارڈ جاری کرنا چاہیں تو اس کے لیے ان کے یہی کوائف معلوم کرنا ضروری ہوں گے۔ یعنی یہ علیؑ کی یعنی اسلام کے کامل انسان کی پہچان نہیں ہوگی۔ کیونکہ علیؑ کی پہچان کے معنی ان کے ”شخص“ کی پہچان نہیں بلکہ ان کی ”شخصیت“ کی پہچان ہے۔ گویا کہ ہمارے لیے علیؑ کی جامع شخصیت کا جس حد تک پہچانا ممکن ہو اتنا ہی ہم نے اسلام کے ایک کامل انسان کو پہچانا ہے۔ پھر جہاں تک ہم اس کامل انسان کو اپنے لیے نمونہ قرار دیں اس کی راہ یہ چلیں اور زبانی نہیں، عملی طور پر اسے اپنا امام اور پیشوا قرار دیں، خود اس کے تابع اور پیرو بنیں اور ہمیشہ کوشش کریں کہ اپنے آپ کو اس نمونے کی طرح رہیں۔ ڈھالیں تو پھر ہم اس کامل انسان کے شیعہ کہلا سکتے ہیں کیونکہ بقول شہید ثانیؒ: ”شیعہ وہ ہے جو امام علیؑ کی مشابعت کرے“ (لمعہ — کتاب الوقت)

کوئی انسان فقط زبانی تعریفیں کرنے اور تعلق جتانے سے شیعہ نہیں بن جاتا بلکہ شیعہ تو امام علیؑ کی مشابعت سے بنتا ہے۔ مشابعت کے معنی ہمراہ ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ کوئی کہیں جانے لگتا ہے تو آپ اس کی مشابعت کرتے ہیں اس کے ہمراہ ہوتے اور اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں کسی کے ہمراہ ہو کر اس طرح چلنے کو

مشابعت کہتے ہیں شیعہ علیؑ کے معنی بھی علیؑ کی عملی طور پر مشابعت کرنے والے کے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ کامل انسان کو پہچاننے کے دو طریقے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اس پہچان کے مفاد کا بھی علم ہو گیا ہے لیکن یہ لفظ ایک فلسفیانہ اور علمی بحث نہیں ہے کہ اس کا حاصل محض ایک علمی نکتہ ہو۔ بلکہ اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور اگر ہم اسلام کے کامل انسان کو قرآن کے بیان سے یا قرآن کی پروردہ شخصیتوں کی شناخت کے ذریعے سے پہچانیں تو ہم اسلام کے معین کردہ رستے پر نہیں چل سکتے، حقیقی اور سچے مسلمان نہیں بن سکتے اور ہمارا معاشرہ۔۔۔ ایک اسلامی معاشرہ نہیں بن سکتا۔ لہذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے کامل اور بلند مرتبہ انسان کو پہچانیں۔

## ”کامل“ سے کیا مراد ہے؟

یہاں ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ درحقیقت ”کامل“ کے معنی کیا ہیں؟ بعض چیزیں بہت واضح ہوتی ہیں۔ لیکن جب انسان غور کرتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ دراصل ایسا نہیں ہے اور اس ”واضح چیز“ کے لیے بہت سی مشکل اور غیر واضح چیزوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے۔

عربی زبان میں ”کمال“ اور ”تمام“۔۔۔ دو الگ الگ الفاظ ہیں جو اپنے مفہوم میں ایک دوسرے کے نزدیک تو ہیں لیکن بعینہ ایک جیسے نہیں ہیں۔ البتہ ان دونوں الفاظ کی صد میں ایک ہی لفظ آتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان اس ان کی ضد کے مفہوم میں ایک سے زیادہ لفظ موجود نہیں اور وہی لفظ بھی ان



میں سے ایک کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے اس میں خود یہ دو الفاظ بھی نہیں ہیں۔ اس لیے فارسی میں بھی یہی عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ عربی کے ان دو الفاظ میں سے ”کمال“ اور دوسرا ”تمام“ ہے۔ پھر عربی میں بھی ان دو الفاظ کی بجائے بعض اوقات ”کامل“ کہا جاتا ہے اور بعض اوقات ”تام“ کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں اور ان کے برعکس جو لفظ بولا جاتا ہے وہ ہے ”ناقص“ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ کامل ہے اور وہ ناقص ہے یا کہا جاتا ہے کہ یہ چیز تام (تمام) ہے اور وہ ناقص ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

لَہُ آج کے دن میں لے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا  
اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ (سورۃ مائدہ - آیت ۳)  
قرآن مجید نے یہ نہیں فرمایا کہ ”اَتَمَمْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ“  
کیونکہ اگر ”اَتَمَمْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ“ فرمایا تو یہ عربی قواعد کی رو سے درست  
نہ ہوتا اسی طرح یہ بھی نہیں فرمایا کہ ”اَتَمَمْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ“ بلکہ فرمایا  
ہے کہ ”اَتَمَمْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ“

## اَتَمَمْتُ اور اَتَمَمْتُ میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں الفاظ میں فرق کیا ہے؟ اگر ہم ان دونوں کا باہمی فرق بیان نہ کریں تو اپنی بحث شروع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہماری بحث کی ابتدا ان دو لفظوں کے معانی سمجھتے ہی سے ہوتی ہے۔

## تمام

”تمام“۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے جب ایک چیز میں وہ سب کچھ وجود میں آچکا ہو جو بنیادی طور پر اس کے لیے لازم ہو۔ یعنی اگر اس میں بعض چیزیں وجود میں نہ آئی ہوں تو بنیادی طور پر یہ چیز اپنی ماہیت میں ناقص ہے کیونکہ اس کا تمام (پورا جسم) وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کا کچھ حصہ وجود میں آیا ہے اور اس میں کچھ کسر باقی ہے یعنی کہا جاسکتا ہے کہ اس کا نصف وجود ہے، اس کا تہائی حصہ موجود ہے یا اس کا دو تہائی حصہ موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ مثلاً اگر ایک بلڈنگ یا مسجد ایک نقشے کے مطابق تعمیر کی جاتی ہو اور اگر مسجد بنائی جائے تو اسکے لیے ایک ہال کی ضرورت ہوگی۔ پھر اس ہال کو دیواروں، دروازوں، پچھت اور بہت سی چیزیں درکار ہونگی۔ اسی طرح جب تک ایک بلڈنگ کو وہ تمام چیزیں میسر نہ ہو جائیں جن کی اسے حاجت ہے، اس سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ جن چیزوں کے نہ ہونے سے وہ بلڈنگ مکمل نہیں ہوتی جب وہ مہیا ہو جائیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ بلڈنگ تمام یا تمام ہے اور تمام کے بالمقابل صورت کو ناقص کہتے ہیں۔

## کمال

”کمال“۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے جب ایک چیز ”تمام“ ہو جانے کے بعد ایک درجہ بلند تر جاسکتی ہو اور پھر اس بلند تر درجے سے بھی ایک درجہ بلند تر جاسکتی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس میں یہ کمال نہ بھی ہو تو بھی ”تمام“ اپنی جگہ پر

موجود رہتا ہے اور اگر کمال ہو تو وہ چیز ایک درجہ بلند تر ہو جاتی ہے۔

”کمال“ کو عمودی سمت میں اور ”تمام“ کو افقی سمت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ یعنی جب کوئی چیز افقی سمت میں اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ تمام ہو گئی اور اگر عمودی سمت میں حرکت کرے اور آخر تک پہنچے تو کہا جاتا ہے کہ وہ کمال کو پہنچ گئی۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی عقل کامل ہو گئی ہے، یعنی وہ پہلے بھی عقل رکھتا تھا لیکن اب اس کی عقل ایک درجہ بلند تر ہو گئی ہے یا کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا علم کامل ہو گیا ہے، یعنی وہ پہلے بھی علم رکھتا تھا اور اس سے استفادہ کرتا تھا لیکن اب اس کا علم ایک درجہ بلند تر اور کامل ہو گیا ہے اور اس نے کمال کا ایک مرحلہ طے کر لیا ہے۔

پس ہمارے معاشرے میں کوئی تو ”تمام“ انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک انسان وہ ہوتا ہے جو اقلی نقطہ نگاہ سے نامتام ہے۔ یعنی اس میں کسر ہے اور درحقیقت وہ نیم انسان ہے، انتہائی انسان ہے، چوتھائی انسان ہے۔ یعنی وہ ایک ”تمام“ انسان نہیں ہے لیکن ایک ”تمام“ انسان اس آخری حد تک کامل اور کامل تر ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان اس سے بلند تر نہیں ہو سکتا۔ اسے ہم ”انتہائی کامل انسان“ کہتے ہیں جو انسانیت کی بلندی کی آخری حد ہے۔

”کامل انسان“ کی اصطلاح اسلامی ادبیات میں ساتویں صدی ہجری سے استعمال ہونے لگی ہے۔ اس سے پہلے اسکا کوئی وجود نہ تھا۔ اگرچہ موجودہ دور میں یہ اصطلاح یورپ میں بھی عام ہو گئی ہے۔ تاہم یہ سب سے پہلے دنیائے اسلام میں ہی ظاہر ہوئی تھی۔ وہ پہلا شخص کہ جس نے کامل انسان کا مسئلہ

اٹھایا اور اسے کامل انسان کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔۔۔۔۔ وہ مشہور عارف محی الدین عربی اندلسی طائی ہے۔

محی الدین عربی اسلامی عرفان کا باوا آدم ہے۔ یعنی اسلامی دنیا کے تمام عرفاء کہ جنہیں آپ جانتے ہیں، وہ سب کے سب محی الدین ہی کے مکتب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایرانی اور فارسی بولنے والے عرفاء بھی شامل ہیں جو ساتویں صدی کے شروع میں اور کچھ ساتویں صدی کے بعد بھی ہوئے ہیں۔ مولوی معنوی کو ہی بھیجیے۔۔۔۔۔ وہ اپنی تمام عظمت کے باوجود عرفان کے معاملے میں محی الدین عربی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

محی الدین عربی قرآن اور حاکم طائی کی اولاد میں سے تھے اور اندلس (موجودہ اسپین) کے رہنے والے تھے۔ لیکن انہوں نے تمام اسلامی ممالک کے سفر کیے اور آخر شام میں فوت ہو گئے، جہاں ان کی قبر اس وقت بھی موجود ہے۔ صدر الدین قونوی۔۔۔۔۔ محی الدین عربی کے ایک شاگرد تھے، جن کا شمار محی الدین کے بعد بڑے بڑے عارفوں میں ہوتا ہے۔

اسلامی عرفان کو بڑی دقیق علمی صورت میں پیش کرنے کا کام محی الدین نے کیا اور صدر الدین قونوی نے اس کی تشریح اور توضیح کرنے کا فرض انجام دیا۔ مولوی معنوی۔۔۔۔۔ صدر الدین قونوی کے ہم عصر تھے۔ صدر الدین قونوی کی ایک مسجد میں امام جماعت تھے اور مولوی معنوی وہاں جا کر ان کی اقتدا میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔

محی الدین عربی کے نظریات و تصورات انہی صدر الدین قونوی کے وسیلے سے مولوی معنوی کو منتقل ہوئے۔ یہ انوکھی اور زلی باتیں جو آپ اس بارے میں سنتے

ہیں ان کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے کیونکہ اسلامی عرفان کے اصول کچھ اور ہیں  
ادروہ ان ڈھکوسلوں سے بالکل الگ ہیں جو آجکل بعض لوگ گھڑ گھڑ کر روزناموں  
اور رسالوں میں چھپواتے ہیں۔

محمی الدین عربی نے جو مسائل پیش کیے ہیں، ان میں سے ایک ”کامل  
الانسان“ کا مسئلہ ہے۔ لیکن اس نے یہ مسئلہ عرفان کے نقطہ نگاہ سے پیش کیا  
ہے۔ اگر آئندہ مجالس میں اس بارے میں بحث کرنا ضروری ہوا تو میں اس  
موضوع پر قدرے زیادہ مفصل گفتگو کروں گا۔

اگرچہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے نظریے سے کامل انسان کے  
بارے میں گفتگو کی ہے لیکن محمی الدین عربی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سب  
سے پہلے انسان کامل کی اصطلاح کو استعمال کیا اور اسے خاص عرفانی  
نقطہ نگاہ کے ساتھ بیان کیا۔

اب جب کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ”کامل انسان“ قرآن کے نقطہ نگاہ  
کے مطابق کیسا ہوتا ہے؟ لہذا مجبوراً اپنی بحث ”مقام الانسان“ اور  
”ناقص الانسان“ سے شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ جب تک ہم یہ مرحلہ طے نہ کریں  
اُس مرحلے تک نہیں پہنچ سکتے۔

کیا ہمارے معاشرے میں سالم انسان اور معیوب انسان موجود ہیں؟  
ان میں سے ایک پورا اور ایک ادھورا ہے، اس کا تعلق انسان کے تن اور بدن  
سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض انسان جسم کے لحاظ سے سالم ہیں اور  
بعض دوسرے معیوب یا مریض ہیں یا ان کے کسی عضو میں کوئی نقص ہے۔ ممکن ہے  
کہ ایک شخص اندھا وغیرہ ہو، لیکن ان چیزوں کا تعلق ذات انسان (یعنی وجود) سے ہے۔



کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر ایک انسان اندھا ہو یا بہرا ہو یا مفلوج ہو یا بد شکل ہو یا پست قد ہو تو آپ اس چیز کو اس کے لیے خامی یا نقص نہیں سمجھتے؟ ہاں! ان خامیوں کو آپ اسکی شخصیت اور انسان کے لحاظ سے نقص شمار نہیں کرتے۔ مثلاً سقراط ہی کو پیچھے۔۔۔ یونان کا یہ معروف فلسفی جسے پیغمبروں کے راستے پر چلنے والا سمجھا جاتا ہے، دنیا کے انتہائی بد صورت افراد میں سے تھا۔ لیکن کوئی بھی اس کی بد صورتی کو انسان کی حیثیت سے سقراط کے لیے عیب نہیں سمجھتا یا جیسا کہ ابو العلامہ معری نابینا تھا اور خود ہمارے زمانے میں ڈاکٹر طحطاہ حسین بھی نابینا تھے۔ کیا یہ اندھا پن تو اس کے جسم اور شخص (وجود) کا عیب ہے؟ یہ اس کی شخصیت کا عیب اور نقص بھی شمار ہونا ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔۔۔ تو پھر یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ انسان دو چیزیں رکھتا ہے۔۔۔ ایک شخص اور دوسرے شخصیت! وہ ایک تن رکھتا ہے اور ایک روح۔۔۔ ایک جسم رکھتا ہے اور ایک روان! روح کا نظام جسم سے الگ ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی روح اس کے جسم کی تابع ہے، یہیں انھوں نے سو فیصد دھوکا کھا ہا ہے۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ جب انسان کا جسم سالم ہو تو کیا اس کی روح بیمار ہو سکتی ہے یا نہیں؟۔۔۔۔۔ یہ چیز بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ جو لوگ روح اور اس کی خفیت کے منکر ہیں اور انسان کے تمام روحانی خواص کو اس کے سلسلہ اعصاب کا براہ راست اور بلا واسطہ نتیجہ سمجھتے ہیں، ان کے نظریے کے مطابق ہر چیز جسم کے تابع ہے اور روح کوئی اختیار نہیں رکھتی۔ اگر روح بیمار ہو تو لازمی طور پر جسم بیمار ہوگا کیونکہ روح کی بیماری جسم ہی کی بیماری ہے۔

خوش فہمتی سے موجودہ زمانے میں یہ بات بڑی حد تک ثابت ہو گئی ہے۔

یعنی ممکن ہے کہ ایک انسان — جسم، خون، خون کے سفید اور سرخ خلیوں کی تعداد، سلسلہ اعصاب، بدن کی حیاتیات اور میٹابولزم METABOLISM کے لحاظ سے بالکل صحیح و سالم ہو۔ یہاں تک کہ ماہر طب اور ماہر عصبیات کی رائے کے مطابق یعنی طبی اور عصبی لحاظ سے بھی رتی بھر بیماری نہ رکھتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود نفسیاتی نقطہ نگاہ سے بیمار ہو۔ مثلاً آجکل کی اصطلاح میں اسے عقدہ روانی (نفسیاتی گرہ) COMPLEX کا مرض لاحق ہو۔ جو انسان عقدہ روانی رکھتا ہو، اس کے بارے میں آجکل کا علم بتاتا ہے کہ وہ واقعی بیمار ہے۔ یعنی بغیر اس کے کہ اس نے جسمانی نظام میں کوئی خلل واقع ہو اس کے نفسیاتی نظام میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔ اس بنا پر ایسے نفسیاتی مریضوں کا علاج مادی دواؤں سے نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ایک ایسے شخص کو لیجیے جو ”تکبر“ کا عقدہ روانی رکھتا ہے۔ اس کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ واقعی یہ ایک بیماری ہے۔ — واقعی روح اور روان کا خلل ہے۔ کیا اس کے لیے دوا خانے سے ایسی دوائی حاصل کی جاسکتی ہے کہ اگر وہ انسان اسے کھائے تو اس کا تکبر تو اضعاف میں بدل جائے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایک قسبی انقلاب انسان یا ایک جیلاد کو پیٹکے لگا کر اور گولیاں کھلا کر ایک مہربان اور شفیق انسان میں تبدیل کر دیں؟ اس کا علاج تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کے علاج کا طریقہ مختلف ہے۔ جیسا کہ بعض اوقات جسمانی بیماری کا علاج نفسیاتی طریقے سے اور نفسیاتی بیماری کا علاج جسم کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب مسئلہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیماری تو جسمانی ہوتی ہے لیکن کچھ ذہنی تحریکوں اور روحانی تقویتوں کے وسیلے سے انسان دوبارہ تندرست ہو جاتا ہے۔

یہ اس بات پر قطعی دلائل ہیں کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو جسم اور روح سے مرکب ہے لیکن روح جسم سے آزاد ہے اور اس کا تابع مطلق نہیں ہے اور حکماً کے قول کے مطابق یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

روح — جسم پر اثر کرتی ہے — اور جسم روح پر اثر ڈالتا ہے۔  
یہ بات اس امر پر دلیل ہے کہ انسان کا نفسیاتی نظام بذات خود ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

ہم کامل انسان کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق مفصل بحث کرنے سے پہلے ہم نے سالم انسان اور معیوب انسان کا جو ذکر کیا ہے یہ اس بحث کی تمہید کے طور پر ہے اور یقیناً لازم اور ضروری تھا۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس عیب اور سلامتی کا روح اور جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہاں طبی اعتبار سے بحث کریں اور پھر تجزیے کے بعد معلوم ہو کہ کونسا انسان سالم ہے اور فی الواقع اس کے بدن کے تمام اعضاء سالم ہیں۔ کیونکہ اس بات کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں اور بنیادی طور پر ہماری گفتگو بدن سے متعلق نہیں ہے۔ پس واقع میں یہ ممکن ہے کہ انسان نفسیاتی نقطہ نگاہ سے مرعوض و معیوب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صحیح و سالم ہو۔ قرآن نے بھی اس اصول کو پذیرائی بخشی ہے۔ جیسا کہ ایک مقام پر آیا ہے:

”ان کے دلوں میں مرض تو تھا ہی اب خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا ہے“  
(سورہ بقرہ: آیت ۱۰)

یعنی ان کے دل اور روح میں مرض ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ان کی آنکھیں بیمار ہیں۔ قرآن نے جس قلب کا ذکر کیا ہے وہ بھی وہ قلب نہیں جس کا

ذکر علم طب میں ہے۔ بلکہ اس مقام پر انسان کے قلب سے مراد اس کی روح اور نفس ہے۔

نیز خدا قرآن کے بارے میں فرماتا ہے :

”اور ہم تو قرآن میں وہی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔ مگر وہ نافرمانوں کیلئے تو گھائے کے سوا کچھ نہ سالتا ہی نہیں۔“ (سورہ نبی اسرائیل آیت ۸۲)

یعنی ہم نے قرآن مومنین کے لیے شفا اور رحمت کے طور پر بھیجا ہے۔  
ایہ المومنین فرماتے ہیں :

”تقویٰ تمہارے دلوں کے مرض کی دوا ہے۔“

(منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین - خطبہ ۱۹۶)

نیز فرماتے ہیں :

”بلاؤں اور مصیبتوں میں سے ایک فقر ہے۔ اور فقر سے بدتر بدن کی بیماری ہے۔ اور بدن کی بیماری سے شدیدتر انسان کے قلب کی بیماری ہے۔“

(منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین - حکمت ۳۰۵)

قرآن مجید کا ایک مقصد انسان کو سالم انسان بنانا ہے لیکن اس سے پیشتر کہ ہم اپنے متعلق کامل انسان ہونے کی توقع رکھیں یا ایک کامل انسان کے نزدیک ہونا چاہیں۔ ہمیں اپنا محاسبہ کرنا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم بنیادی طور پر سالم انسان ہیں یا معیوب انسان ہیں۔



## آفاتِ روح

جو چیزیں انسان کی روح پر آفت لاتی ہیں ہم یہاں ان کے حقیقی مآخذ کا مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں :

علمِ نفسیات کی رو سے انسان کی محرومیاں اس کی بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں۔ یعنی اپنی محرومیوں کا احساس انسان کی بہت سی نفسیاتی گمراہیوں اور نفسیاتی بیماریوں کا مآخذ ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں فراہم کرنے والے مخصوص جنسی امور میں نہ بادہ تراشی محرومیت کے مسئلے پر انحصار کیا ہے۔ ہم حال یہ چیز بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ انسان کی محرومیاں ان کے اندر بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ بعض اوقات انسان اپنے دل میں کسی شخص کے بارے میں کینے کا احساس کرتا ہے، اس سے انتقام لینا چاہتا ہے اور جب تک اسے طیامیٹ نہ کر لے آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ انسان کے اندر کینہ اور انتقام جوئی کی جس کیا چیز ہے؟ یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔

ایک حاسد انسان جو دوسروں کے پاس کوئی نعمت دیکھتا ہے تو وہ اپنے لیے فکر نہیں کرتا، اس کی تمام تر آرزویہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں سے وہ نعمت چھین جائے۔ سالم انسان حسد نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیشہ اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ کیونکر آگے بڑھے۔ اگر ایک انسان ہمیشہ اس فکر میں ہو کہ خود آگے بڑھے تو یہ اس کا عیب نہیں اور وہ سالم ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہے کہ دوسرا اس سے پیچھے رہ جائے تو وہ نفسیاتی بیمار اور مریض ہے۔ حتیٰ کہ آپ دیکھیں گے کہ حاسد لوگ بعض اوقات اس مرحلے پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ خود

سودرجے نقصان اٹھائیں تاکہ دوسرے کو پچاس درجے نقصان پہنچے!  
 ایک مشہور تاریخی داستان ہے جو تاریخ کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔  
 کہتے ہیں کہ کسی حلیفہ کے زمانے میں ایک دو متمند شخص نے ایک غلام خریدا۔  
 اس نے پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ ایک غلام جیسا نہیں بلکہ ایک آقا  
 جیسا سلوک کرنا شروع کیا۔ یعنی وہ اس غلام کو بہترین خوراک اور بہترین  
 پوشاک دیتا اور ہر قسم کی آسائش ہم پہنچاتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اپنے بیٹے  
 بلکہ اس سے بھی بڑھ کر محبت سے پیش آتا تھا اور اسے وافر مقدار  
 میں روپیہ بھی دیتا تھا۔

وہ غلام دیکھتا تھا کہ اس کا آقا ہمیشہ سوچے بچار میں اور پریشان پریشان  
 رہتا ہے۔ آخر ایک دن اس نے اپنے غلام کو بت سی رقم دینے اور آزاد کرنے  
 کا فیصلہ کر لیا۔ تب ایک رات اس دو متمند شخص نے اپنے غلام سے اپنا  
 دکھڑا بیان کیا اور کہا:

”اے غلام! میں چاہتا ہوں کہ تمہیں آزاد کر دوں اور اتنی ساری رقم  
 بھی تمہیں دیدوں۔ لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارا اس قدر خیال  
 کیوں رکھتا ہوں؟“

غلام نے پوچھا: ”کس لیے؟“

دو متمند شخص نے جواب دیا: ”فقط ایک فرمائش کی خاطر۔۔۔ کہ  
 اگر تم وہ ایک فرمائش پوری کر دو تو جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے وہ تمہارے  
 لیے حلال ہوگا۔ لیکن اگر تم میری وہ فرمائش پوری نہ کرو گے تو میں  
 تم سے راضی نہیں ہوں گا۔ اگر تم مان جاؤ اور میری فرمائش پوری کر دو تو میں



تمہیں کچھ اور مال بھی دوں گا۔“

غلام نے کہا: ”آپ میرے لیے دلی نعمت ہیں — آپ نے مجھے خوشگوار زندگی دی ہے — آپ جو کچھ بھی کہیں گے میں وہ ضرور کروں گا۔“ اس نے کہا: ”نہیں! بلکہ تمہیں قطعی وعدہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہارے سامنے اپنی تجویز پیش کروں اور تم انکار کر دو۔“ غلام نے کہا: ”آپ کی جو بھی تجویز ہے وہ بتائیے!“

جب آقائے اس سے پختہ قول لیا تو کہا: ”میری تجویز یہ ہے کہ ایک خاص مقام اور وقت پر جس کے بارے میں میں تمہیں حکم دوں۔ تم

میرا سرتن سے الگ کر دو اور

غلام نے کہا: ”کیا مطلب؟“

آقائے اس نے کہا: ”میں یہی چاہتا ہوں۔“

غلام نے کہا: ”یہ تو ناممکن ہے۔“

آقائے اس نے کہا: ”بہر حال میں نے تم سے قول لے لیا ہے اور بات صرف

اتنی ہی ہے اور ....“

چنانچہ اس نے غلام کو آدھی رات کے وقت جگایا — ایک تیز چھری اس کے ہاتھ میں دی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسے ہمسائے کے گھر کے پچھواڑے لے گیا۔ پھر وہ وہاں لیٹ گیا اور نقدی کی ایک قھیلی غلام کو دی اور کہا: ”تم یہیں میرا سر کاٹ دو اور — جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔“ غلام نے پوچھا: ”آخر کیوں؟“

اس نے جواب دیا: ”اس لیے کہ اب جینے جی میں اس ہمسائے کو نہیں

دیکھ سکتا۔ کیونکہ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے آگے نکل گیا ہے۔ بس اب میرے لیے زندہ رہنے کی بجائے مرجانا ہی بہتر ہے۔ میں اس کا رقیب تھا اور وہ میرا رقیب تھا۔ لیکن اس نے مجھ پر سبقت حاصل کر لی ہے اور میں گویا آگ میں جل رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے سے ایک قتل اس کے ذمے لگ جائے اور اس کے نتیجے میں وہ قید خانے میں پہنچ جائے تو مجھے سدا کا چین مل جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا رقیب وہی ہے۔ اگر میں یہاں مارا جاؤں گا تو کل پوچھا جائے گا کہ اسے قتل کس نے کیا ہے۔ تب کہا جائیگا لازماً اس کے رقیب نے ہی قتل کیا ہے۔ کیونکہ اس کی لاش بھی اسی کے چھوٹے سے ملے ہے۔ اس کا بیٹھو یہ ہو گا کہ وہ بکڑا جائے گا اور بالآخر اسے جیسا ہی چڑھا دیا جائے گا۔ جب یہ صورت بن جائے گی تو میرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔“

غلام نے سوچا: یہ اتنا احمق آدمی ہے تو میں یہ کام کیوں نہ کروں؟  
\_\_\_\_\_ ہاں تم فقط قتل کیے جانے کے قابل ہو (حاضرین کی ہنسی) یہ کہہ کر غلام نے اس احمق حاسد کا سر کاٹا اور نقدی کی تھیلی لیکر چلتا ہوا۔

صبح ہوتے ہی قتل کی یہ خبر یہ جگہ پھیل گئی۔ اس دو ٹمنڈ آدمی کے رقیب کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں کہا گیا کہ اگر یہ قاتل ہوتا تو اسے اپنے گھر کے پچھواڑے میں قتل نہ کرتا۔ اس طرح قتل کا معاملہ ایک معما بن کر رہ گیا۔ دوسری طرف اس غلام کے ضمیر نے اسے چین نہ لینے دیا۔ وہ حاکم وقت کے دربار میں حاضر ہوا اور حقیقت حال بیان کرتے ہوئے کہنے لگا:

”امر واقعہ یہ ہے کہ اسے میں نے قتل کیا ہے اور خود اس کے تقاضا کرنے پر قتل کیا ہے۔ وہ حسد کی آگ میں اس طرح جل رہا تھا کہ موت کو زندگی

پر ترجیح دینا تھا۔“

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اصل ماجرا کیا ہے تو غلام کو بھی چھوڑ دیا گیا اور اس پہلے قیدی کو بھی آزاد کر دیا گیا۔

ہاں! یہ ایک حقیقت ہے کہ حسد واقعی ایک بیماری ہے اور انسان حسد کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

قرآن فرماتا ہے :

۴؎ جس نے اپنے نفس کو پاک صاف رکھا وہ کامیاب ہوا اور جس

نے اسے اگناہ کر کے (وہ) زیادہ نامراد رہا۔ (سورۃ شمس۔ آیت ۱۰-۹)

پس قرآن مجید کا پہلا عقیدہ تنزیہ نفس ہے۔ یعنی قرآن مجید نفس کی بیماریوں، گریہوں، تارکیوں، پریشانیوں اور سرکشیوں سے الگ رکھنا بلکہ مسخ ہونے سے بچانا چاہتا ہے۔

نفس کے مسخ ہونے کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے، مگر سوال یہ ہے کہ مسخ ہونے سے کہا مراد ہے؟ جیسا کہ کہا جاتا ہے اور آپ نے سنا ہوگا کہ گزشتہ امتوں میں کچھ ایسے لوگ ہوئے کہ جنہوں نے بہت گناہ کیے۔ اس وقت کے پیغمبر نے ان پر لعنت کی اور اس کے نتیجے میں وہ مسخ ہو گئے۔ یعنی وہ حیوان کی صورت میں تبدیل ہو گئے۔ مثلاً بند بن گئے یا بھیڑیے، ریکھ یا کسی دوسرے حیوان کی صورت میں بدل گئے اور اسے کہتے ہیں ”مسخ ہونا“۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی انسان مسخ ہو گئے۔ یعنی حیوان بن گئے؟ یہاں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ اگر انسان جسمانی لحاظ سے مسخ نہ ہو اور ایک حیوان کی شکل میں تبدیل نہ بھی ہو، تو بھی اس کا روحانی اور معنوی لحاظ سے مسخ

ہو جانا ممکن ہے۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ روحانی طور پر ایک حیوان میں تبدیل ہو جائے۔ بلکہ ایک ایسے حیوان میں تبدیل ہو جائے کہ اتنا بڑا اور مکروہ حیوان ساری دنیا میں موجود نہ ہو۔

چنانچہ قرآن مجید بھی ان لوگوں کی بات کرتا ہے کہ جو چوپایوں سے بھی گھٹیا ہیں۔ (سورہ اعراف - آیت ۱۷۹)

کیا یہ ممکن ہے کہ روح کے لحاظ سے انسان واقعی ایک حیوان میں تبدیل ہو جائے؟ جی ہاں۔ انسان کی شخصیت اس کی اخلاقی اور روحانی خاصیتوں سے بنتی ہے۔ اگر انسان میں روحانی خاصیتیں نہ ہوں بلکہ اس میں ایک دوندے اور ایک چوپائے کی عادتیں اور خاصیتیں ہوں تو وہ واقعی مسخ شدہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی روح واقعی مسخ ہو جاتی ہے اور وہ ایک حیوان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

حیوانوں میں سے سور ہی کو بھیجے۔ اس کا جسم اس کی روح سے نسبت رکھتا ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ایک انسان کی تمام خصلتیں سور کی سی ہوں۔ اگر ایسا ہو تو وہ انسانیت کے رتبے سے گر چکا ہے۔ یعنی اپنے باطن میں حقیقت کی نگاہ میں اور عالم بالا میں وہ سور ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

پس ایک معیوب انسان بعض اوقات مسخ شدہ انسان کے مرحلے پر پہنچ جاتا ہے۔ ہم ان مسخ شدہ لوگوں کے متعلق کم سنتے ہیں اور شاید بعض لوگ یہ خیال کریں کہ یہ حجاز ایسا کہا گیا ہے اور اس پر انہیں دیر سے یقین آئے گا

— لیکن یہ حقیقت ہے۔

ایک شخص کا بیان ہے :

ہم امام سجاد علیہ السلام کے ساتھ مکہ گئے۔ جب ہم نے صحرائے عرفات پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ وہاں زیادہ سے زیادہ تیس چالیس ہزار حاجی ہیں جب اس نے اس سے اوپر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ اس صحرائیں حاجیوں کا سمندر تھا جیسا مارہا ہے۔ اس نے امام علیہ السلام سے عرض کیا : یعنی الحمد للہ کہ اس سال کتنے زیادہ حاجی ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا : ”شور کرے گئے زیادہ اور حج کرے گئے کم ہیں۔“ سفینۃ البحار جلد ۳ صفحہ ۱۷، اثبات الہدایہ جلد ۵ صفحہ ۳۹۔  
وہ شخص مزید کہتا ہے :

مجھے اس کا علم نہیں کہ امام نے کیا کیا، مجھے کیسی بصیرت دی اور کونسی آنکھ میرے اندر بینا کر دی۔ پھر اچانک آپ نے مجھ سے فرمایا : ”اب دیکھو! میں نے اچانک نگاہ کی اور دیکھا کہ صحرائے عرفات جاؤ رزل کی ہنات سے ایک چڑیا گھر بنا ہوا ہے“ جہاں فقط چند انسان جوانوں کے درمیان چل پھر رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا : ”اب تم نے دیکھ لیا؟ یہ ہے اس معاملے کا باطن!“  
اہل معنی اور اہل باطن کی نظر میں یہ چیز روز روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے۔ اب اگر ہمارے تجدد پسند اشخاص کا ذہن اسے قبول نہ کرنا چاہے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔

خود ہمارے زمانے میں ایسے افراد ہوئے اور ہیں جو انسانوں کی حقیقت

کا ادراک کر سکتے ہیں اور اسے دیکھ سکتے ہیں۔ جو انسان ایک چوپائے کی طرح کھائے، سوئے اور جنسی عمل کے علاوہ کچھ نہ جانتا ہو، اس کی روح بنیادی طور پر ایک چوپائے کی طرح ہے اور اس کا باطن واقعی مسخ ہو چکا ہے۔ یعنی انسانی حقیقتیں اور انسانیت اس سے مکمل طور پر چھین گئی ہے اور اس نے خود اپنے لیے حیوانی خصوصیات اختیار کر لی ہیں۔

جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

۱۰ جس دن صور پھونکا جائے گا اور تم لوگ گروہ در گروہ حاضر ہو گے۔ آسمان کھلے گا، یہ جاؤں گے تو ان میں دروازے بن جائیں گے۔ پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائیں گے۔ (سورہ نبا- آیت ۱۸ تا ۲۰)

قیامت کے دن لوگ گروہ در گروہ محصور ہوں گے۔ پیشوایان دین نے بار بار کہا ہے کہ لوگوں کا فقط ایک گروہ انسان کی شکل میں محصور ہوگا اور دوسرے گروہ حیوانات کی شکل میں محصور ہوں گے۔ چنانچہ کچھ گروہ چوٹیوں کی شکل میں، کچھ گروہ سانپوں کی شکل میں، کچھ گروہ بچھوؤں کی شکل میں، کچھ گروہ بندروں کی شکل میں اور کچھ گروہ انسان کی شکل میں اکٹھے جائیں گے کیوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدائے تعالیٰ بلاوجہ ایک انسان کو حیوان کی شکل میں تبدیل کرے؟ نہیں۔ بلکہ جو شخص دنیا میں بچھو بن کر رہا، سوائے ڈنک مارنے کے اس نے کوئی کام نہ کیا اور دوسروں کو ایذا پہنچانے میں ہی لذت محسوس کرتا رہا وہ اپنی حقیقی شکل یعنی بچھو کی شکل میں محصور ہوگا۔ جو شخص اپنی خصلت میں بندر ہوا اور اس نے دنیا میں بندروں جیسی حرکتوں کے علاوہ کچھ



تہ کیا — وہ قیامت کے دن یقیناً ایک بندر کی شکل میں محسوس ہوگا۔ نیز جو شخص اپنے طور طریقے میں ایک کتا ہے، وہ ایک کتے ہی کی شکل میں محسوس ہوگا۔ قیامت کے دن لوگ اپنی نیتوں، مقصدوں، خواہشوں، خصلتوں اور اپنی حقیقی عظمتوں کے ساتھ محسوس ہوں گے۔ آپ اس دنیا میں کیا ہیں، کب بننا چاہتے ہیں اور کس چیز کی خواہش رکھتے ہیں؟ کیا آپ کی خواہشات ایک انسان کی خواہشات ہیں یا ایک دندے یا ایک پرندے کی ہیں؟ آپ کی خواہشات جس حیوان کی سی ہیں آپ وہی ہیں اور جیسے سمجھ ہیں آپ ویسے ہی محسوس ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں خدا کی پرستش کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ہم جس چیز کی پرستش کرتے ہیں۔ وہی بن جاتے ہیں۔ اگر ہم زبردست بن جائیں تو روپیہ ہماری ذات اور ہمارے وجود کا جزو بن جاتا ہے۔ یہی روپیہ پیسہ قیامت کے دن کی وہ گھنٹی ہوئی دھات ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ دھات دنیا میں جن کے وجود کا جزو بن گئی اور اس دھات کی ملکیت اور اس کی پرستش کے علاوہ ان کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ وہ آخرت میں بھی اس دھات کی شکل میں ہوں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

”جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو دے رسول! ان کو دناک عذاب کی خبر سنا دو۔ جس دن وہ مال جہنم کی آگ میں تپا یا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشیتیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشتیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا: یہ جیسے تم نے اپنے

لیے جمع کر رکھا تھا“ (سورہ توبہ- ۳۴-۳۵)

آپ یہ نہ کہیے کہ اب دھات کے سکے تو ناپید ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ کرنسی نوٹوں نے لے لی ہے۔ کیونکہ دوسری دنیا میں ہر چیز کی ماہیت مختلف ہے اور وہاں کے نوٹ بھی ایسی آگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو انسان کو زرد اور سفید دھاتوں سے زیادہ جلاتی ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو مسخ کر دیتی ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ آج رات معیوب انسان اور سالم انسان کے مسئلے کی جانب مجمل طور پر اشارہ کرتے ہوئے بتاتا چلوں کہ جو انسان اپنے اندر کوئی نفسیاتی عقدہ اور بیماری رکھتا ہو، وہ معیوب انسان ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو کسی مادی چیز کی پرستش کرتا ہے۔ یعنی وہ اسے اپنے استعمال میں نہیں لانا۔ بلکہ اس مادی چیز کو جمع کرنے میں لگا رہتا ہے۔ وہ ایک معیوب اور مسخ شدہ انسان ہے۔

ماہ رمضان کی یہ راتیں دعا اور احیاء کی راتیں ہیں، بلکہ اس بابرکت مہینے کی تمام راتیں احیاء اور دعا کے لیے خاص ہیں۔ کیونکہ اس مہینے کا بنیادی مقصد انسان سازی ہے۔ یعنی اس مہینے کا مقصد یہ ہے کہ ان دنوں اور راتوں میں معیوب انسان اپنے آپ کو سالم انسانوں میں اور سالم انسان اپنے آپ کو کامل انسانوں میں تبدیل کریں۔

ماہ رمضان کا مقصد تزکیہ نفس کے ذریعے سے افراد انسانی کے عیوب اور نقائص رفع کرنے کے علاوہ معاشرتی خرابیوں کی اصلاح بھی ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں عقل، ایمان اور ارادہ نفسانی خواہشات پر قابو پا لیتے ہیں۔ یہ خدا کی پرستش کرنے، دعائیں مانگنے، خدا کی جانب پر واز اور بالآخر

روح کی بندی اور ارتقار کا مہینہ ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایک انسان ماہ رمضان کے تیس دن بھوک، پیاس برداشت کرے اور ایک سے دوسری مجلس میں شریک ہو، یہاں تک کہ عید انقضا آجائے۔ پھر ہم دیکھیں کہ مہینے کے آخر میں اس میں رتی بھر تبدیلی بھی نہیں آئی یا یہ کہ وہ پہلے سے بھی بدتر ہو گیا ہے تو ایسے روزے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ لوگ فقط اپنے منہ باندھے رہیں، بلکہ روزے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان اپنی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہماری روایات میں آیا ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں روزے سے سوائے بھوک کے کچھ نہیں ملتا۔ انسان کا حلال غذا کو چھوڑ دینا اس لیے ہے کہ وہ تیس دن تک غذا کی مشق کرے تاکہ پھر وہ حرام بات کہنے سے اپنی زبان کو بند کرے یعنی وہ غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، بدگلائی نہ کرے اور حلال غذا استعمال کرے۔

کیا آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا کہ ایک عورت رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئی اور وہ روزے سے تھی۔ رسول اکرمؐ نے اسے دودھ یا کوئی اور چیز اسے دی۔ اور فرمایا: اس کو پی لو!

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں روزے سے ہوں۔  
آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں — تم روزے سے نہیں ہو۔ یہ پکڑو اور

پی جاؤ۔

اس نے دوبارہ کہا: یا رسول اللہؐ! میرا روزہ ہے۔  
آنحضرتؐ نے اصرار کیا اور فرمایا: لو یہ پی لو!  
اس عورت نے پھر یہی کہا کہ میرا روزہ ہے۔ کیونکہ اپنے شہم کے مطابق وہ

واقعی روزے سے تھی۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: تم روزے سے کیسے ہو سکتی ہو جب کہ ایک ساعت پہلے تم نے اپنے مومن بھائی یا مومن بہن کا گوشت کھیا یا ہے، کیونکہ تم نے اس کی غیبت کی ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں ابھی تمہیں دکھا دوں کہ تم نے اس کا گوشت کھیا یا ہے؟ تم یہاں ابھی قے کرو!

جب اس عورت نے قے کی تو اچانک گوشت کا ایک لوتھڑا اس کے منہ سے گرا۔ اُف! ایک آدمی روزہ بھی رکھے اور غیبت بھی کرے؟ یعنی وہ اپنے جسم کا منہ تو حلال غذا سے بند کر لے اور ایسی روح کا منہ حرام خدا کے لیے کھول دے! جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب کوئی انسان ایک جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے بدبو بلند ہوتی ہے جو سانوں، آسمانوں تک جاتی ہے اور اس سے فرشتوں کو تکلیف پہنچتی ہے لیکن یہ سات آسمان یہ ظاہری آسمان نہیں ہیں بلکہ وہ سب کے سب بطون عالم اور ملکوت عالم ہیں۔ بعض اوقات پوچھا جاتا ہے کہ جہنم میں اتنی بدبو کیوں ہے؟ ہاں تو جہنم میں بدبو وہی ہے جو ہم اپنی دنیا میں پیدا کرتے ہیں، وہ وہی جھوٹ ہیں جو ہم بولتے ہیں۔ یہی کیفیت گالی بکھنے کی ہے۔ پھر نعمت لگاتا تو سب سے بڑھ کر ہے۔ نعمت لگانے میں جھوٹ کی برائی کے ساتھ غیبت کی برائی بھی شامل ہے جو آدمی غیبت کرتا ہے وہ لوگوں کی خامیاں جو ان میں موجود ہوتی ہیں بیان کرتا ہے۔ جس آدمی کا لہجہ سخت ہو وہ پیٹھ پیچھے برائی نہیں کرتا اور جو آدمی جھوٹ بولتا ہے وہ اس میں کسی کی بدگوئی نہیں کرتا لیکن جو آدمی اُمت لگاتا ہے وہ آن واحد میں جھوٹ بھی بولتا ہے اور غیبت بھی کرتا ہے یعنی وہ بیک وقت دو کبیرہ گناہ کرتا ہے۔

۳۵

و لئے ہے اس دن پر کہ ایک ماہ رمضان گزر جائے اور اس میں ہم نے  
ایک دوسرے پر کئی ایک نعمتیں لگائی ہوں۔  
ماہ رمضان اس لیے آتا ہے کہ اس مدت میں زیادہ سے زیادہ مسلمان  
جمع ہوں اور اجتماعی عبادات انجام دیں، نہ یہ کہ ماہ رمضان تفرقہ کا  
باعث ہو۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ  
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

## دوسری نشست

### مختلف موجودات کا کمال

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ انہوں نے پوری کر دیں۔ تب خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کی اور میری اولاد میں سے۔۔۔۔۔ خدا نے فرمایا کہ ہاں مگر میرے اس عہد سے پہلے لوں میں سے کوئی شخص فاسق نہیں ہو سکتا۔

(سورہ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

ہر موجود کا کمال دوسرے موجود کے کمال سے مختلف ہے مثلاً ”کامل انسان“ ”کامل فرشتہ“ سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایک فرشتہ اپنے فرشتہ ہونے میں کمال کی ممکن اعلیٰ اور آخری حد تک پہنچ جائے تو وہ اس سے مختلف ہے کہ ایک انسان اپنے انسان ہونے میں کمال کی آخری حد تک پہنچ جائے۔ کیونکہ وہی ہستیاں جنہوں نے ہمیں فرشتوں کے وجود سے آگاہ کیا ہے، انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ



۳۷

فرشتے وہ موجودات ہیں جو عقل محض، اندیشہ محض اور فکر محض سے پیدا کیے گئے ہیں۔ یعنی ان میں خاکی، مادی، شہوانی، غضبی وغیرہ کیفیات وجود نہیں رکھتیں۔ ایسے ہی حیوانات ہیں کہ وہ محض خاکی ہیں اور جس چیز کو قرآن مجید روحِ خدائی کہہ کر متعارف کراتا ہے وہ اس سے بے بہرہ ہیں۔

بس انسان ہی ایک ایسا موجود ہے جو ان اوصاف سے مرکب ہے علوی جو فرشتوں اور خاکوں میں وجود رکھتے ہیں۔ انسان ایک ایسا موجود ہے جو ملکوتی بھی ہے اور ملکی بھی۔ ”علوی“ بھی ہے اور ”سقطی“ بھی۔ یہ تعبیر ایک حدیث کے متن سے ماخوذ ہے جو اصول کافی میں آئی ہے۔

بے شک خدائے فرشتوں کو عقل دی اور شہوت نہیں دی حیوانوں کو شہوت دی اور عقل نہیں دی اور انسانوں کو عقل و شہوت دونوں دی ہیں۔ پس جس انسان کی عقل اس کی شہوت پر غالب ہو — وہ فرشتے سے بہتر ہے اور جس انسان کی شہوت اس کی عقل پر غالب ہو وہ حیوان سے بدتر ہے۔

اعلیٰ الشرائع باب ۶ صفحہ ۴۴۴ الوسائل جلد ۱۱ صفحہ ۱۴۴

یہ روایت اہل سنت کے ہاں بھی اس سے ملتی جلتی عبارت کے ساتھ موجود ہے اور مولوی معنوی نے بھی مثنوی میں اس حدیث کو نظم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

① حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے دنیا میں تین قسم کی مخلوق پیدا کی ہے۔

② ایک گروہ کو پوری عقل اور وجود کا علم عطا کیا اور وہ فرشتہ ہے جو رکوع و سجود کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔

③ فرشتے کے مختصر ہیں حرص و ہوا نہیں ہے اور وہ نورِ مطلق ہے جو خدا کے عشق سے زندہ ہے۔

④ ایک دوسرا گروہ ہے جو دانش سے خالی ہے اور وہ حیوان ہے جو گھاس کھا کر موتا ہوتا ہے۔

⑤ وہ اصطبل اور گھاس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا وہ شقاوت اور شرافت سے بے خبر ہے۔

⑥ تیسرا گروہ آدم زاد اور بشر ہے۔ جس میں اُدھے اوصافِ فرشتے کے اور اُدھے کدھے کے ہیں۔

⑦ کدھے کے اُدھے اوصاف سے وہ پستی کی جانب مائل ہوتا ہے اور فرشتے کے اُدھے اوصاف سے بلندی کی جانب مائل ہوتا ہے۔

⑧ دیکھیے اس بلندی اور پستی کی جنگ میں کون غالب آتا ہے اور ان دونوں میں سے کون بازی لے جاتا ہے۔

(شہنوی مولانا روم۔ صفحہ ۳۱۶)

پھر کہتے ہیں کہ ایک گروہ نورِ مطلق سے پیدا کیا گیا ہے اور ایک گروہ غصے اور شہوت سے کہ جس سے مراد حیوانات ہیں، لیکن انسان کو خدا نے مرکب پیدا کیا ہے۔ کامل انسان اور کامل حیوان میں فرق ہے۔ ایک اعلیٰ، مثالی اور کمال کی حد تک پہنچا ہوا اگھوڑا ایک کامل انسان سے مختلف ہے۔ ایک کامل انسان ایک کامل فرشتہ بھی باہم مختلف ہیں۔ ان دونوں جنسوں سے کامل انسان کا فرق اس کی ذاتی ترکیب کی بنا پر ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے :

۳۹

کہ ”ہم نے انسان کو ایک نطفے سے پیدا کیا ہے۔ جس میں  
 (آجکل کی اصطلاح کے مطابق) بہت سے اجزاء آئے  
 ہوئے ہیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں بہت زیادہ صلاحیتیں ہیں اور وہ اس  
 مرحلے میں پہنچ چکا ہے کہ ہم اسے آزما کر دیکھیں۔ یعنی وہ مرکب نطفہ انسان کی شکل  
 میں کمال کی اس حد پر پہنچ گیا ہے کہ ہم نے اسے آزاد، مختار اور ذمہ داری اٹھانے  
 کے لائق قرار دیا ہے۔ پھر اس کی اسی صلاحیت کی بدولت اسے امتحان اور آزمائش  
 میں ڈالا اور سزا و جزا کے قسائل ٹھہرایا۔ لیکن دوسری مخلوقات میں یہ صلاحیت  
 نہیں ہے۔

”پس ہم نے اُسے سنتا، دیکھتا بنایا، ہم نے اس کو راستہ بھی  
 دکھا دیا۔ اب وہ خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکر اہو“

(سورۃ دھیر۔ آیت ۳۰-۲)

انسان کی آزادی و اختیار اور اس آزادی و اختیار کی بنیاد کو اس سے  
 بہتر اور نیا وہ خوبصورت طریقے سے بیان کرنا ممکن نہیں کہ۔ ”ہم نے اسے آزمائش  
 کے قابل سمجھا۔“ ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا اور جاننے والا قرار دیا۔  
 ”ہم نے اسے راستہ دکھایا۔“ اور..... پس یہ خود انسان ہی ہے جسے اپنے  
 راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔

لہذا کامل انسان وہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ ہم نے  
 اس کو ایک نطفے سے پیدا کیا ہے جس میں بہت سے اجزاء آئے ہوئے ہیں۔ یعنی  
 اس کے کامل ہونے کی وجہ اس کا مخلوط نطفہ سے پیدا ہونا ہی ہے۔

۴۰

کامل انسان اور فرشتے میں فرق ہے۔ کامل انسان کا کمال اس کے تعادل اور توازن میں ہے یعنی ان مختلف استعدادوں میں تعادل اور توازن جو اس میں موجود ہیں۔ ایک انسان اس وقت کامل انسان بنتا ہے جب اس کا جھکاؤ فقط ایک استعداد کی جانب نہ ہو اور دوسری استعدادوں کی طرف سے غفلت نہ کرے۔ بلکہ اس کے اندر جتنی صلاحیتیں اور استعدادیں ہوں وہ ان سب کو ترقی دے۔ یعنی ان میں تعادل اور توازن قائم رکھے۔ علماء کا کہنا ہے کہ حقیقی عدل۔۔۔ توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ یہاں ہم آہنگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی تمام استعدادوں کے ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ترقی ہم آہنگ ہو۔

اس نکتے کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہم ایک سادہ مثال پیش کرتے ہیں مثلاً جب ایک لڑکا بڑھتا ہے تو اس کے ہاتھ ہوتے ہیں، پاؤں ہوتے ہیں۔ سید ہوتا ہے، آنکھیں ہوتی ہیں، ناک ہوتی ہے، منہ ہوتا ہے، دانت ہوتے ہیں اور اس کے اندر دنیوی اعضاء اور آئیتیں ہوتی ہیں۔

پس ایک سالم لڑکا وہ ہے جس کے تمام اعضاء بڑھیں اور ان کے بڑھنے میں ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہو۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک انسان ایسے بڑھتا ہے جیسے مضحکہ خیز کارٹون CARICATURE یعنی ایسا ہو کہ اس کے بدن کے باقی حصے نو نہ بڑھیں اور فقط اس کی ناک اتنی بڑھے کہ اس کے باقی بدن کے برابر ہو جائے یا اس کی آنکھیں یا سر بڑھے یا اس کے ہاتھ بڑھیں لیکن پاؤں نہ بڑھیں یا پاؤں بڑھیں مگر ہاتھ نہ بڑھیں تو ایسا شخص بڑھتا ضرور ہے لیکن اس کے بڑھنے میں ہم آہنگی نہیں۔ اس لیے وہ

سالم انسان نہیں ہوتا۔

کامل انسان وہ ہے جس کی تمام انسانی قدیریں اکٹھی بڑھیں اور ان میں سے کوئی ایسی نہ ہو جو بڑھنے سے رہ جائے۔ یعنی وہ سب ایک دوسری کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بڑھیں اور بڑھ کر اعلیٰ درجے تک پہنچ جائیں۔ جب ایسا ہو جائے تو وہ انسان کامل ہو جاتا ہے اور یہ وہی شخص ہے جسے قرآن مجید امام سے تعبیر کرتا ہے اور فرماتا ہے :

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ انہوں نے پوری کر دیں۔ تب خدائے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بناتے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کی اور میری اولاد سے خدائے فرمایا کہ ہاں مگر میرے اس عہدے پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔ (سورہ بقرہ - آیت ۱۲۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام خدائے تعالیٰ کی جانب سے آنے والی بڑی بڑی آزمائشوں سے سرخرو نکلے، ان کاموں کو پورا کر دکھایا اور ان تمام امتحانوں میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ وہ کوئی ایک دو، تین یا چار باتیں نہیں بلکہ وہ ایسے بڑے بڑے امتحان تھے کہ جن میں سے ایک امتحان خدا کی راہ میں اپنے ہاتھوں اپنے فرزند کا سر کاٹنے پر آمادہ ہو جانا تھا۔

انہوں نے خدا کی مرضی کے آگے جہاں تک تسلیم خم کیا کہ جب وہ سمجھ گئے کہ خدا اس بارے میں حکم دے رہا ہے تو بے چون و چرا ذبح فرزند پر تیار ہو گئے۔ یا لآخر عمل کا وقت آگیا۔

۴۲

۱۵۔ پس دونوں نے ٹھان لی اور باپ نے بیٹے کو مانتے  
کے بل لٹایا۔ (سورۃ صافات۔ آیت ۱۰۳)

ابراہیمؑ بیٹے کو ذبح کرنے اور اسماعیلؑ ذبح ہونے کے  
لیے جب مکمل طور پر آمادہ ہو گئے تو

۱۶۔ ہم نے آواز دی اے ابراہیمؑ! تم نے اپنے خواب کو سچ  
کر دکھایا۔ (سورۃ صافات۔ آیت ۱۰۴-۱۰۵)

یعنی اے ابراہیمؑ ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ جو کچھ ہم چاہتے تھے وہ  
مہین تک تھا۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ سچ جُت تم اپنے بیٹے کا سر کاٹ دو۔  
جو کچھ ہم تم سے چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ ہمارے حکم اور ہماری مرضی کے مقابل  
تمہاری اطاعت کس حد تک ظاہر ہوتی ہے۔ یوں ابراہیمؑ آگ میں ڈالے  
جانے سے لے کر بیٹے کو قربانگاہ میں لے جانے تک تنہا تمام امتحانوں  
سے کامیاب گزرتے ہیں۔

۱۷۔ اس میں شک ہی نہیں کہ ابراہیمؑ ایک امت خدا کے  
قربا بزرگ اور بندے اور باطل سے کترا کر چلنے والے تھے۔ وہ ہرگز  
مشرکین میں سے نہ تھے۔ (سورہ نحل۔ آیت ۱۲۰)

انہوں نے اکیلے ہی ایک قوم اور ایک ملت سے مقابلہ کیا تو اس فتنہ  
ان سے کہا جاتا ہے:

۱۸۔ میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

(سورۃ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

یعنی اے ابراہیمؑ! اب تم اس مقام پر پہنچے ہو کہ تمہیں دوسروں کیلئے

مثال، نمونہ پیشوا اور امام ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اب تم ایک کامل انسان بن گئے ہو اور دوسرے انسانوں کو چاہیے کہ وہ کامل ہونے کے لیے تمہاری پیروی کریں اور تمہارے ساتھ مطابقت پیدا کریں۔

امام علی علیہ السلام بھی ایک کامل انسان ہیں۔ وہ اس لیے کامل ہیں کہ ان کے اندر تمام انسانی قدیں پروان چڑھیں۔ ترقی کے اعلیٰ درجے تک پہنچیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر پھیلی پھولی ہیں۔ پس ان انسانی قدروں نے ان تین شرطوں کے ساتھ ان کی ذات میں اعلیٰ درجے تک اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہاں ہم آہنگی کے اس مسئلہ کی سمجھ اور وضاحت کر دیں۔

ہم آپ نے سمندر کا مدو جزر دیکھا ہوگا یا کم از کم اس کے بارے میں سنا ہوگا۔ چنانچہ سمندر ہمیشہ مدو جزر کی حالت میں رہتا ہے۔ یعنی کبھی اس طرف کھینچا جاتا ہے اور کبھی اس طرف کھینچا جاتا ہے۔ یہ بات زمانہ قدیم سے ثابت ہو چکی ہے کہ چاند سمندروں کے مدو جزر میں بہت زیادہ تاثر رکھتا ہے۔ سمندر ہمیشہ اچھلتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ عموماً مدو جزر کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ کبھی ادھر کو کھینچا جاتا ہے اور کبھی اُدھر کو کھینچا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر انسان کی روح اور انسانی معاشرہ بھی سمندر کی طرح ہمیشہ مدو جزر کی حالت میں ہوتا ہے۔ انسان کی روح ہمیشہ مدو جزر کی حالت میں ہوتی ہے اور اس طرف سے اس طرف کو کھینچی جاتی ہے۔ معاشروں کا بھی یہی عالم ہے اور وہ بھی کبھی اُدھر اور کبھی اُدھر کھینچے جاتے ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ معاشروں کے کھینچے جانے کا سبب افراد یا دوسرے واقعات ہوں! لیکن صورت یہی ہے



اور بالفعل ہمیں ان حیوانی نشانیوں سے حتیٰ کہ انسانی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں خود انسان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یعنی آپ ایسے افراد کو دیکھتے ہیں جن کا میلان واقعی انسانی میلان ہوتا ہے لیکن بعض اوقات وہ انسانی جبلتوں میں سے کسی ایک کی جانب ایسا ہی چڑھاؤ پیدا کر لیتے ہیں جیسے ادھر کو کھینچے جا رہے ہوں۔ پھر وہ یوں لڑھکتے چلے جاتے ہیں کہ تمام دوسری قدریں بھول جاتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ایسے آدمی کی مانند ہیں جس کا فقط کان یا ناک یا ہاتھ پڑھتا جاتا ہے۔

معاشرہ میں زیادہ تر اشخاص ہم آہنگی نہ مہمے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تاہم مارا معاشرہ کسی وقت بھی باطل کی طرف گمراہی کے باب نہیں بڑھتا۔ بلکہ لوگ حق بات میں انحراف کی وجہ سے بھی غلط راستے پر لگ جاتے ہیں اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی قدروں میں سے ایک عبادت ہے کہ جس کی اسلام سو فیصد تائید کرتا ہے۔ گو عبادت سے اپنے خاص معنوں میں خدا کا ذکر مراد ہے لیکن اسلام میں ہر وہ کام عبادت ہے جو ایک انسان خدا کی خاطر انجام دیتا ہے۔ چنانچہ حیب وہ کام کا سج کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنا اور اپنے خاندان والوں کا پیٹ پالے اور اپنے معاشرے کی خدمت کرے تو وہ عبادت میں مشغول ہوتا ہے لیکن عبادت اپنے خاص معنوں یعنی خدا کے ساتھ خلوت کے معنوں میں نماز، دعا، مناجات اور تہجد وغیرہ ہی ہے جو اسلام کے اجزاء ہیں اور اس میں سے حذف نہیں ہو سکتے۔ یہ عبادت بجائے خود ایک حقیقی قدر ہے۔ لیکن اگر اس میں احتیاط نہ برتی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ابک معاشرہ فقط اس قدر کی جانب کھینچا جاتا ہے پھر

آپ ملاحظہ فرمائیے گے کہ فقط عبادت کرتا، مسجد میں جانا، مستحب غسل کرنا، مستحب نماز پڑھنا، دعا مانگنا، تعقیب پڑھنا اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا ہی اسلام بن جاتا ہے۔ یعنی وہ معاشرہ فقط ان چیزوں کی طرف کھینچا جاتا ہے اور اگر وہ اس راستے پر حد سے زیادہ بڑھ جائے تو اس کی تمام دوسری قدریں مسخ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم تاریخ اسلام میں دیکھتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں اس قسم کا رجحان پیدا ہو گیا تھا اور خالصتاً بے عرض اشخاص کہ جن پر کوئی تہمت نہیں لگائی جاسکتی — وہ اس راستے پر چل کھڑے ہوئے اور پھر اس میں توازن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک ایسا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں انسان ہوں۔ کیونکہ اس نے صرف ایک ہی چیز کی طرف توجہ دی ہے۔ لہذا ہر انسان کو اپنے اندر مختلف خیالات کو ترقی دینا چاہیے اور وہ ان سب کو ایسی ترقی دے جس میں ہم آہنگی پائی جائے۔

رسول اکرمؐ کو اطلاع دی گئی کہ آپ کے کچھ اصحاب صرف عبادت میں محو ہو گئے ہیں۔ ان حضرات یہ سن کر بڑے بے چین ہوئے — مسجد میں تشریف لائے اور با توازن بلند فرمایا:

یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ میری امت میں کچھ ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ میں خود جو تمہارا پیغمبر ہوں — ایسا نہیں ہوں اور کبھی بھی رات سے صبح تک عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ رات کے کچھ حصے میں آرام کرتا ہوں، سوتا ہوں اور اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ اسی طرح میں ہر روز قطعاً روزہ بھی نہیں رکھتا، بلکہ کچھ دنوں کے روزے

رکھتا ہوں اور باقیماندہ دنوں میں غذا تناول کرتا ہوں۔

پس جن لوگوں نے (عبادت میں ٹھوہنے کا) یہ راستہ

اختیار کیا ہے وہ میری سنت سے دور ہیں ....!

ہاں تو جب پیغمبر اکرمؐ بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی قدروں میں سے ایک دوسری قدروں کو اپنے اندر گم کر لینا چاہتی ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے کا حِجَان ایک طرف ہو گیا ہے تو وہ اس کا سختی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

عمر بن عاصؓ کے ایک بیٹے کا نام عبداللہ اور دوسرے کا نام محمد تھا۔ ان میں سے ایک (یعنی محمد) اپنے باپ کی مانند بنیادار و بنیارسنت اور حکومت کا خواہش مند تھا۔ اور اس کے تیسرے بیٹے کا نام جبیب تھا۔

عمر بن عاص جب کبھی اپنے اولاد کو دو بیٹوں سے کوئی مشورہ طلب کرتا تو پہلا یعنی عبداللہ اسے امام علیؓ کی جانب دعوت دیتا اور کہتا کہ علیؓ کی حمایت کرو۔ جبکہ اس کا دوسرا بیٹا محمد کہتا تھا: نہیں۔ تمہیں علیؓ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، لہذا معاویہ کی طرف ہو جاؤ۔

جبہ اللہ کو عبادت سے لگاؤ تھا۔ ایک دن رسول اکرمؐ اسے راتے ہیں طے اور فرمایا: اے عبداللہ! تجھے بتایا گیا ہے کہ تم راتوں کو صبح ہونے تک عبادت کرتے ہو اور دن میں روزہ رکھتے ہو۔

اس نے جواب دیا: یا رسول اللہؐ! ایسا ہی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: لیکن میں ایسا نہیں ہوں، اس چیز کو پسند بھی

نہیں کرتا اور نہ یہ درست ہے۔

بعض اوقات کسی معاشرے کا جھکاؤ زہد کی جانب ہو جاتا ہے۔ جو

۴۷

بجائے خود ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ زہد ایک ایسی قدر ہے جس کے اچھے اثرات اور فوائد ہوتے ہیں۔ اگر ایک معاشرہ خوش بختی کا منہ دیکھے یا کم از کم ہم اسے اسلامی معاشرہ کہہ سکیں تو یہ ناممکن ہے کہ اس میں یہ عنصر اور یہ قدر موجود نہ ہو لیکن بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ یہی قدر سارے معاشرے کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور پھر ہر چیز ”زہد“ کی نذر ہو جاتی ہے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

ایک اور قدر خدمتِ خلقی ہے جو انسان کی قطعی اور مسلم قدر میں سے ہے۔ یہ ایک انسانی قدر ہے جس کی اسلام بھی تسلیم کرتا ہے اور یہ خلقِ خدا کا خیرہ نہ گنار ہوتا ہے۔

اس بارے میں رسول اکرمؐ نے بڑی سفارش اور حقیقتاً قرآن مجید میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ آیا ہے۔ جیسا کہ اس نے باہم تعاون کرنے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کے متعلق کہا ہے:

”لے نیکی یہی نہیں کہ تم نماز میں اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی تو اس کی ہے جو خدا، قیامت، فرشتوں، خدا کی کتابوں اور انبیاء پر ایمان لائے۔ وہ خدا کی رحمت میں اپنا مال قربتِ رازوں، یتیموں، محتاجوں، پردیسیوں اور لونڈی و غلام کی گلو خلاصی میں صرف کرے۔“

(سورۃ بقرہ - آیت ۱۷۷)

پھر اس آیت کے آخر میں اسی قدر یعنی خدمتِ خلق کا ذکر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی قدر ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ایک زمانے میں

سعدی جیسا آدمی آتا ہے اور کہتا ہے:

”عبادت بہ جز خدمت خلق نیست“

یعنی فقط یہی ایک قدر ہے اور بس! اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔ تاہم شیخ سعدی عمل میں ایسے نہ تھے کہ خدمت کے علاوہ کوئی عبادت نہ کرتے ہوں۔ بلکہ یہاں انہوں نے شعر کی زبان میں خدمت خلق کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عبادت کی قدر کی نفی کریں، نہ کہ کی قدر کی نفی کریں۔ علم کی قدر کی نفی کریں اور جہاد کی قدر کی نفی کریں۔ غرضیکہ ان تمام عظیم قدروں کی یکجہت نفی کر دیں جو اسلام میں موجود ہیں اور یہ نعرہ لگائیں کہ انسانیت..... یعنی خلق خدا کی خدمت ہی واحد انسانی قدر ہے۔

آجکل بالخصوص ہمارے کچھ روشن خیال حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک بہت ہی بلند منطق ان کے ہاتھ آگئی ہے اور انہوں نے اسے انسانی اور انسان دوستی کا نام دے رکھا ہے۔ انسان دوستی سے کیا مراد ہے؟ اس کے معنی خلق خدا کی خدمت کرنے کے ہیں۔ خلق خدا کی خدمت کرنا بڑی اچھی بات ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خلق خدا میں کون کون شامل ہے۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ہم نے خلق خدا کا پیٹ بھی بھر دیا اور اس کا بدن بھی ڈھک دیا۔ مگر ہر حال یہ کام کر کے ہم نے ایک حیوان کی خدمت کی ہے۔ اگر ہم خلق خدا کے لیے کسی بلند تر قدر کے قائل نہ ہوں اور تمام قدریں ”خلق خدا کی خدمت“ تک محدود ہوں تو نہ خود ہم ہیں اور نہ کسی دوسرے میں کوئی فرد موجود ہوگی۔ پھر

تمام خلق خدا ”بھڑوں کا ایک ریوڑ“ یا ”گھوڑوں کا ایک گلہ“ بن جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے کچھ حیوانوں کا پیٹ بھر دیا اور انھیں ڈھانک دیا۔ اگرچہ یہ بھی ایک اچھا کام ہے۔ لیکن کیا انسان کا انتہائی مقام یہی ہے کہ ہم اس کا پیٹ بھر دیں اور وہ اپنی حیوانیت پر سب قرار رہے۔ کیا میری خدمت کرنے کی آخری حد بھی یہی ہے کہ ایک اپنے ہی جیسے حیوان کی خدمت کروں؟ کیا میرے جیسے دوسرے حیوانوں کی آخری حد یہ ہے کہ وہ کسی اپنے جیسے کی (مثلاً میری) خدمت کریں؟ نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ انسان کی خدمت ایک قدر تو ہے مگر اس انسان میں انسانیت کا ہونا شرط ہے۔ میں نے ہمیشہ عرض کیا ہے کہ پیٹرس لو مہیا بھی انسان ہے اور شے تو شے ہے مگر انسان ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ خلق چاہے کیسی بھی ہو — مسئلہ فقط خلق خدا کی خدمت کا ہے۔ تو پھر پیٹرس لو مہیا بھی اور مویشے جو مہیے بھی ایک خلق ہے۔ آپ ان کے درمیان فرق کیوں کرتے ہیں؟ اگر سوال ”خدمت خلق“ ہی کا ہے تو پھر الفوراً درمعاوبہ کے درمیان کیا فرق ہے؟ کیا ایسے مساوی ہیں یہ بھی ایک قسم کی افراط نہیں ہے؟

اس کے علاوہ مثلاً آپ آزادی کی قدر کو لیجیے۔ آزادی غظیم ترین اور بلند ترین قدروں میں سے ہے جو انسان کی حیوانیت کی حد سے بلند ترین۔ انسان کے لیے آزادی مادی قدروں سے بڑھ کر ایک قدر ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ کہ جن میں معمولی سی بھی انسانیت ہوتی ہے وہ اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ چاہے بھوکے رہیں، ان کے تن پر کپڑا نہ ہو اور وہ بڑے مشکل حالات میں زندگی بسر کریں، لیکن یہ نہیں چاہتے کہ کسی دوسرے کے اسیر یا محکوم ہوں

بلکہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ کتاب ”آئینہ دانشور“ میں ایک داستان نقل کی گئی ہے۔ یہ ایک بڑی عجیب داستان ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ بوعلی سینا کچھ مدت وزیر بھی رہا تھا۔ لیکن بڑے اشوس سے کنا پڑتا ہے کہ وزارت کے نتیجے میں اسے اپنا علمی کام چھوڑنا پڑا۔ اپنے غیر معمولی نبوغ کے باوجود اگر وہ اپنی زندگی وزارت وغیرہ میں صرف نہ کرتا تو اس نے جو کچھ بتی نوع انسان کیلئے کہا ہے اس سے کہیں بڑھ کر کارنامے انجام دیتا جیسا کہ بلا صدارت جیسے انتظام میں اشوس کرتے ہیں کہ یہ شخصیت وزارت کی اس وادی میں کہیں جا کر آئے۔ ایک دن بوعلی سینا بڑے بادشاہ و جلال اور وزارت عظمیٰ کے محل پر آب کے ساتھ ایک جگہ سے گزر رہا تھا۔ اتفاقاً وہ ایک بیت الخطائے کپاس سے گزرا جہاں ایک خاکروب صفائی کر رہا تھا۔ بوعلی غیر معمولی ہوش کا مالک تھا اور اس کے قوائے حسیہ بھی بہت مضبوط تھے۔ اس نے خاکروب کی آواز سنی اور اسے بہتہ چلا کہ وہ ہر شے گنگنا رہا ہے :

گرامی دشتم اے نفس اذانت

کہ آسان بگزد بر دل جھانت

وہ اپنے آپ سے خطاب کر کے کہہ رہا تھا کہ اے میرے نفس! میں تجھے

اس لیے عزیر رکھتا ہوں کہ تیرا وقت اچھا کیے۔

بوعلی سینا کو یہ دیکھ کر ہنسی آگئی کہ یہ شخص سب سے گھٹیا کام انجام

دے رہا ہے اور پھر اپنے نفس پر احسان دھر رہا ہے اور کہہ رہا ہے : عہ

گرامی دشتم ای نفس اذانت کہ آسان بگزد بر دل جھانت



۵۱

بوعلی سینا نے اپنا گھوڑا ایک طرف کھڑا کیا، آگے آیا اور اسے آواز دیکر کہا: انصاف تو یہ ہے کہ تم نے اپنے نفس کو اتنا عزیز رکھا کہ اس سے بہتر ممکن ہی نہیں تھا۔ جب خاکروب نے اس کا چہرہ بشرہ اور لباس فاخرہ دیکھا تو اس نے پہچان لیا کہ یہ وزیر اعظم بوعلی ہے۔ تب اس نے کہا: میں نے یہ پیشہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ تمہاری طرح کسی دوسرے کا محکوم بن کر نہ رہوں۔ تم یہ جو مال و متاع اور شان و شوکت رکھتے ہو۔ خاکروب کا کام کرنا اور آزاد رہنا اس سے ملکہ دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم محکوم اور تابع ہو اور وہ آزاد ہے۔

کہتے ہیں کہ بوعلی سینا شہر کے بازار سے پیسے پیسے جمع کیا اور سمجھ گیا کہ اس منطق کا کوئی جواب نہیں ہے۔

یہ ایک واقعیت اور حقیقت ہے۔ لیکن یہ ہے کیا؟ ہاں یہ چیز حیوانی اور خاکی منطق میں کوئی معنی نہیں رکھتی کہ آدمی مرغ اور پلاؤ، کینڑ اور غلام، گھوڑے اور ہاتھی اور حکومت اور وزارت کو چھوڑ کر خاکروب بن جائے اور پھر آزادی کی باتیں کرے۔ کہا آزادی کوئی ایسی چیز ہے جسے چھوڑنا چاہیے؟ نہیں! لیکن انسان اعلیٰ اور باخبر تنبیہ کے لیے آزادی اتنی قیمت رکھتی ہے کہ وہ خاکروبی کو محکوم پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ آزادی واقعی ایک قدر ہے اور بہت بڑی قدر ہے۔ بعض اوقات انسان دیکھتا ہے کہ کچھ معاشروں میں یہ قدر بالکل بھلا دی گئی ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ انسان میں یہ حس بیدار ہو گئی ہے۔ پھر جب یہ حس بیدار ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ بشریت کے معنی ”آزادی“ کے ہیں! بشر کے معنی ”آزادی“ کے ہیں اور آزادی کے

۵۲

علاوہ کوئی قدر وجود ہی نہیں رکھتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تمام قدیریں اس ایک قدر میں گم ہو جاتی ہیں، جس کا نام آزادی ہے۔  
ایک اور قدر ”عدالت“ ہے، ایک قدر ”حکمت“ ہے اور ”عرفان“ وغیرہ بھی ہے۔

بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ ”عشق“ پر بہت زیادہ تکیہ کرتے ہیں۔ مثلاً جو کچھ ہمارے عرفان و تصوف اور عرفانی غزلوں میں ہے وہ فقط ایک انسانی قدر ”عشق“ پر منحصر ہو کر رہ جاتا ہے جیسا کہ کہا گیا۔  
حسن ازیں نے اپنا جلوہ دکھایا، فرشتے نے اسے دیکھا، مگر وہ جن بہ عشق سے غارت تھا:

فرشتہ عشق ندانست چیست، قصہ نتواند

نخورد جام و گلانی بہ خاک آدم ریخت

فرشتہ نہیں جانتا کہ عشق کیا ہے؟ کیونکہ اس نے یہ قصہ نہیں

پڑھا۔ اس نے معرفت کا جام چڑھایا اور اس کی تلچھٹ

خاک آدم پر ڈال دی۔

پھر وہ دیگر تمام قدروں حتیٰ کہ عقل کی جانب بھی توجہ نہیں دیتے جن عاقلوں

کا میلان ”عشق“ کی جانب ہوتا ہے، دراصل وہ عقل کے خلاف میلان رکھتے

ہیں اور عقل کے ساتھ باقاعدہ جنگ کرتے ہیں۔

جیسا کہ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

عارف از پر تو می، راز نہانی دانست

گو ہر ہر کس ازیں لعل توانی دانست

۵۳

شرح مجموعہ گل مرغ سحر داند و بس  
کہ نہ ہر کو درقی خواند معانی دانست  
ای کہ در دفتر عقل آیت عشق آموزی  
ترسم این نکته بہ تحقیق ندانی دانست

ایک عارف شراب کی چمک میں راز حقیقت کو پالیتا ہے۔ اس لیے تو بھی اس فعل کے ذریعے ہر انسان کی صلاحیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔  
مجموعہ گل مرغ یعنی ذات جامع صفات (خدا) شان کو بس مرغ سحر ہی جاننا ہے۔ کیونکہ یہ پڑھنے والا کتاب کے معنی سے واقف نہیں ہوتا۔  
اے شخص کہ جو عقل کے ذریعے سے عشق کو سمجھنے میں کوتاہاں ہے مجھے ڈر ہے کہ تو اس نکتے کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکے گا۔

مجموعہ گل سے مراد وہ ذات (یعنی خدا) ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔  
آخری شعر میں انہوں نے بوعلی سینا سے خطاب کیا ہے جس نے ”اشارات“ کے آخر میں عشق کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ پھر ان کے ہاں بنیادی طور پر انسان اور انسانیت کو ”عشق“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عقل چونکہ محدود اور پابند ہے اس لیے وہ مکمل طور پر دبا دی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وقت آتا ہے کہ دوسری طرف سے ایک اور قدر اُس کے لائی جاتی ہے۔ یعنی اس وقت انسانی قدر صرف ”عقل“ اور ”فکر“ ہی شمار کی جاتی ہے اور بس۔ وہ کہتے ہیں کہ جناب عشق کے بارے میں یہ کیا عجیب سی باتیں ہیں۔ یہ سب محض وہم و گمان کی باتیں ہیں اور یہ لڑیوں اور روں ہیں وغیرہ.....

پھر جب عشق کے متعلق یہ باتیں بوعلی سینا کے سامنے آتی ہیں تو وہ کہتا ہے:

۵۴

عشق کے بارے میں جو کہا جاتا ہے وہ نری خیال آفرینیاں ہیں۔ اس کی بجائے انسان کو ”عقل کی سواری کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔“ ان ساری باتوں کا کیا مطلب ہے؟ ہاں! ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مختلف قدریں ہیں جو انسان میں موجود ہیں۔ مثلاً ”عقل“ ”عشق“ ”محبت“ ”عدالت“ ”خدمت“ ”عبادت“ اور ”آزادی“۔ پھر ان قدروں کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کامل انسان کو نسا ہے؟ کیا وہ جو عابدِ محض ہے؟ کیا وہ جو زاہدِ محض ہے؟ کیا وہ جو مجاہدِ محض ہے؟ کیا وہ جو محض آزادی کا خواہاں ہے؟ کیا وہ جو عاشقِ محض ہے؟ کیا وہ جو عاقلِ محض ہے؟..... ان میں سے کون کامل انسان ہے؟

ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی کامل انسان نہیں ہے۔ کامل انسان وہ ہے جس میں یہ تمام قدریں اعلیٰ درجے تک بڑھی ہوں اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی ہو۔ اس معیار کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام علی علیہ السلام ایسے ہی کامل انسان ہیں۔

آپ امام علیؑ کی خطبات کی کتاب ”منہج البلاغہ“ سے رجوع کریں جو سید رضی کا انتخاب اور امیر المومنین کے ارشادات کا ایک حصہ ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سید رضی چونکہ ایک ادیب تھے۔ اس لیے انہوں نے منہج البلاغہ کے فقط ادبی پہلو سے بحث کی ہے اور امیر المومنینؑ کے کلام کے شاہکار ادبی جملوں کا انتخاب کیا ہے۔ آجکل منہج البلاغہ میں ۲۲۹ خطبے ہیں جب کہ مروج المذہب کے مؤلف مسعودی — جو سید رضی سے سو سال پہلے پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ اس وقت امام علیؑ

کے تقریباً ۴۸۰ خطبے لوگوں کے پاس موجود تھے۔

ہنچ البلاغہ کیسی کتاب ہے؟ اس میں آپ کو ہر قسم کا عنصر ملت ہے۔ جب انسان ہنچ البلاغہ کا مطالعہ کرتا ہے تو ایک مقام پر خیال کرتا ہے کہ بوعلی سینا کچھ کہہ رہا ہے۔ دوسری جگہ وہ سمجھتا ہے کہ مولوی معنوی یا محی الدین عسکری گفتگو کر رہا ہے۔ پھر جب مطالعہ کرتے ہوئے وہ ایک جگہ پہنچتا ہے تو اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کچھ کہہ رہا ہے یا آزادی کا متوالا بول رہا ہے جسے آزادی کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچتا۔

اس کے بعد اچھی ایک اور جگہ نگاہ ڈالتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ ایک عابد شیب زندہ دار گفتگو کر رہا ہے یا گوشہ نشین زاہد یا راہب کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے اندر تمام انسانی قدries رکھتے ہیں اور ہر لوہنے والے کا کلام اس کی روح کا نمائندہ ہوتا ہے۔ پس ہنچ البلاغہ میں آپ دیکھیں کہ امام علی کتنے عظیم اور ہم کتنے کوتاہ ہیں۔

تقریباً پچاس سال پہلے۔ جبکہ دینی اور مذہبی مسائل میں ہمارا معاشرہ فقط زہد اور عبادت کی قدروں کی جانب میلان رکھتا تھا۔ اس وقت آپ کہیں بھی جانے تو دیکھتے تھے کہ ایک واعظ منبر پر بیٹھتا اور ہنچ البلاغہ میں سے چڑھ کر سناٹا تھا۔ وہ کیا پڑھتا تھا؟ سنیے کہ جو خطبے بالعموم پڑھے جاتے تھے ان کی تعداد مجموعی طور پر دس سے بیس تک تھی۔ یہ ہنچ البلاغہ کے وہ خطبے تھے جن کا تعلق زہد اور موعظت سے تھا۔ مثلاً:

اے لوگو! یہ دنیا گزرگاہ ہے اور آخرت جائے قرار۔  
اس را بگذر سے اپنی منزل کے لیے تو شہ اٹھاؤ، جس کے

۵۶

سامنے تھا راکوئی بھید چھپا نہیں رہ سکتا، اس کے سامنے اپنے  
پر دے چاک نہ کرو۔ قبل اس کے کہ تمہارے جسم دنیا سے الگ  
کر دیے جائیں، اپنے دل اس سے ہٹالو۔ اس دنیا میں تمہیں  
جانچا جاد ہا ہے لیکن تمہیں پیدا تو ایک دوسری جگہ کے لیے  
کیا گیا ہے۔ (منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۲۰۱)

ان ایام میں منہج البلاغہ کے باقی خطبے نہیں پڑھے جانتے تھے کیونکہ معاشرہ  
انہیں جذب اور قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس معاشرے نے کچھ دوسری قدروں کی  
جانب میلان پیدا کر لیا تھا، لہذا منہج البلاغہ کے انہیں حصوں کا پڑھنا معمول  
میں گیا تھا جو ان قدروں کے بارے میں تھے۔ اسی طرح سو سال گزرنے کو گئے  
لیکن اس طویل مدت میں شاید ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا تھا جو مالک  
اشتر کے نام امیر المومنین علیہ السلام کا فرمان پڑھتا کہ جو اجتماعی اور سیاسی  
احکام کا ایک خزانہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ درحقیقت اس معاشرے کی  
روح ان چیزوں کی خواہش اور شوق نہیں رکھتی تھی۔

امام علی بن ابی طالب علیہ السلام منہج البلاغہ میں اس طرح ارشاد  
فرماتے ہیں کہ و

”... میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی  
موقعوں پر فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”اس قوم میں پاکیزگی  
نہیں آسکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق  
نہیں دلایا جاتا۔“

(منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ عہد نامہ ۵۳۔ بنام مالک اشتر)

۵۷

پچاس سال پیشینہ کا اسلامی معاشرہ اس جملے کی روح اور اس بات کی گرائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا، تاکہ وہ صحیح طور پر سمجھ سکے کہ امام علی علیہ السلام کہتے ہیں: رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ کوئی امت پاکیزگی و طہارت اور عیب سے مبرا ہونے کے مقام تک نہیں پہنچتی مگر یہ کہ اس سے پہلے کہ وہ اس مرحلے پر پہنچ چکی ہو جب ایک کمزور آدمی ایک طاقتور شخص کے بالمقابل کھڑا ہو جائے اور بغیر اس کے کہ اس کی زبان لکنت کرے — وہ اپنا حق اس سے طلب کرے۔

چنانچہ ۵۵ سال پہلے کا معاشرہ ان الفاظ کی قدر و قیمت نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس معاشرہ نے بے سوچے سمجھے قرآن میں اختیار کیں اور فقط ایک یا دو قدروں کی جانب میلان کر لیا تھا لیکن جہاں تک امام علی علیہ السلام کے کلام کا تعلق ہے تو تمام انسانی قدریں علیؑ کے قول، عمل اور شخصیت میں موجود ہیں۔

اگرچہ ہمارے معاشرے میں بھی کچھ قدریں نمایاں ہو گئی ہیں لیکن یہاں میں اپنے معاشرے کی تعریف نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ایسی قدریں پیدا ہو گئی ہیں تاکہ مجھے ڈر یہ ہے کہ یہ قدریں پھر کہیں ایک طرف نہ ہو جائیں اور بعض دوسری قدروں کو مٹا دینے کا موجب نہ بن جائیں۔ نہیں — نہیں! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم پر لازم ہے کہ امام علیؑ علیہ السلام کو اپنے لیے نمونہ اور اپنا امام سمجھیں۔ یعنی ایک کامل انسان کو۔ ایک متعادل انسان کو اور ایک ایسے انسان کو اپنے لیے نمونہ بنائیں جس میں تمام انسانی قدروں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی



ہے۔ یعنی ایک ایسے انسان کو اپنے لیے نمونہ عمل اور اپنا امام و پیشوا بنائیں کہ جب رات ہو جاتی ہے اور وہ خدا کے ساتھ راز و نیاز اور دعا و مناجات کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تو کوئی عارف اس کے رتبے کو ہمیں پہنچتا تب عبادت کی وہ روح جو حق میں جذب ہونا، حق کی جانب کھینچا جانا اور حق کی جانب پڑنا کرتا ہے۔۔۔ وہ اس میں بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

آپ اکثر دیکھتے ہوں گے کہ جب کوئی انسان ایک کام میں سرگرم اور متمک ہو، مثلاً وہ لڑائی جھگڑے کی حالت میں ہو، اگر اس آشنا میں اسے ایک چاقو آگے جو اس کے بدن (بازو) کا ایک حصہ کاٹ دے تو چونکہ وہ لڑائی میں اس سرگرم اور متمک ہونا ہے یعنی اس کی توجہ لڑائی پر اس طرح مرکوز ہوتی ہے کہ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے بازو کے گوشت کا ایک ٹکڑا الگ ہو گیا ہے۔ امام علیؑ بھی عبادت میں اس قدر سرگرم اور متمک ہوتے تھے اور عشق الہی کا شعلہ ان کے وجود میں اس طرح بھڑکتا تھا کہ یوں لگتا جیسے وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انہوں نے خود ایک گروہ کی اس طرح تعریف کی اور بیچ البلاغہ میں فرمایا ہے:

ہلے علم نے انہیں ایک دم حقیقت و بصیرت کے انکشافات تک پہنچا دیا ہے۔ وہ یقین و اعتماد کی روح سے کھل مل گئے ہیں اور ان چیزوں کو جنہیں آرام پسند لوگوں نے دشوار قرار دے رکھا تھا۔ ان کو اپنے لیے سہل و آسان سمجھ لیا ہے۔ جن چیزوں سے جاہل بھڑک اٹھتے ہیں وہ ان سے جی لگاتے بیٹھتے ہیں۔ وہ دنیا میں ایسے جسموں کے ساتھ رہتے ہیں کہ جن کی رو میں بلا اعلیٰ

سے وابستہ ہیں۔ (منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین، جلد ۷، ص ۱۴۷)

امام علیؑ ایسے عابد ہیں کہ عین حالت نماز میں تیران کے بدن سے نکالا جاتا ہے لیکن وہ حتیٰ اور عبادت میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ انھیں ہوش ہی نہیں آتا اور احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ محراب عبادت میں اس قدر روتے اور بیچ و تاب کھاتے ہیں کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ تو تھیں ان کی راتیں — لیکن جب دن نکلتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعاً وہ آدمی نہیں جو رات کو محراب میں تھا۔ وہی علیؑ جب دن میں اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھتا تو ان کا چہرہ ہنستا، مسکراتا اور ہشاش بشاش ہوتا تھا۔ یہ بات ہمارے آجکل کے ان زایدوں اور عابدوں کی حالت کے برعکس ہے۔ کیونکہ یہ لوگ جب زاید اور عابد بن جاتے ہیں تو ان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ناک بھوں چڑھائے اور ماتھے پر بل ڈالے رکھتے ہیں اور لوگوں پر دھونس بھی جاتے ہیں۔

امام علیؑ کے اصحاب کتے ہیں :

آپ کے اوصاف ہیں سے ایک یہ تھا کہ آپ ہم سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ آپ اتنے خوش طبیعت حتیٰ کہ بدلہ کو تھے کہ جب عمرو بن عاص آپ کے خلاف پراپیگنڈا کر رہا تھا تو کہتا تھا کہ علیؑ خلافت کے لیے موزوں نہیں ہیں کیونکہ وہ خندہ رو ہیں۔ خلافت کے لیے ایک سخت آدمی چاہیے تاکہ لوگ اس سے ڈریں۔

اس کا ذکر منہج البلاغہ میں ہے۔ جسے امیر المومنینؑ خود نقل

کرتے ہیں :

۶۰

۱۹ ”ابلاغہ کے بیٹے (عروبن عاص) پر حیرت ہے کہ وہ میرے بارے میں اہل شام سے کہتا پھرتا ہے کہ مجھ میں مزاج پایا جاتا ہے اور میں تفریح میں پڑا رہتا ہوں۔ اس نے غلط کہا اور کہہ کر گنہگار ہوا۔“

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۸۲)

وہ لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ لوگوں کے ساتھ ہمیشی مذاق کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب وہ ایک مجاہد اور ایک سپاہی کی شکل میں میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرتے ہیں تو بھی ان کا چہرہ مسکراتا ہوا ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپؐ کے بارے میں کہا گیا:

”وہ علیؑ ہیں جو رات کو محراب عبادت میں بہت رونے والے اور میدان جنگ میں بہت ہنسنے والے ہیں۔“

(الغدیر جلد ۴ صفحہ ۲۶)

یہ کیسی مخلوق ہیں؟ ہاں! یہ قرآنی انسان ہیں اور قرآن ایسے ہی انسان یا ہوتا ہے:

۱۹ ”اس میں شک نہیں کہ رات کا اٹھنا خوب نفس کشی اور ٹھکانے سے ذکر کرنے کا وقت ہے۔۔۔۔۔ دن کے وقت تمہارے اور بھی بڑے بڑے کام ہیں۔“

(سورہ مزمل۔ آیت ۶-۷)

رات کو عبادت کے لیے اور دن کو چلنے پھرنے اور معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لیے رہنے دو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات ایک اور شخصیت

کی ہے اور دن کسی اور شخصیت کا ہے۔

میں حافظ شیرازی کے یہ اشعار آپ کو اس لیے سنارہا ہوں کہ حافظ ان لوگوں کا جزو بن گئے ہیں جو انہیں جواؤں کے اسخرف اور گمراہی کا وسیلہ قرار دینا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ ایک عظیم شخصیت اور ایک مشتاق شاعر ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا کام شراب خوری اور عیاشی رہا ہے تو نوجوان کہتے ہیں کہ چلو ہم بھی حافظ کی طرح ہو جائیں لیکن خدا کا شکر کہ ہم ایسے نہیں ہیں۔ کیونکہ حافظ کے تمام اشعار عرفانی، پُر معنی اور رمزی سمجھے جاسکتے ہیں۔

درحقیقت حافظ شیرازی قرآن کے مفسر تھے اور انہوں نے اس کی تاریخ بیان کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر نہیں بلکہ ایک عالم شخص تھے اور اپنی وفات کے دو سو سال بعد تک ان کا شمار علماء میں ہی ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھار شعر بھی کہہ دیتے تھے، لیکن دو سو سال بعد ان کا علمی پہلو بھلا دیا گیا اور وہ ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ وہ ایک ایسے عالم تھے جو بنیادی طور پر مفسر قرآن تھے اور اس کی تفسیر میں مشغول رہتے تھے اور بالعموم زختری کی تفسیر کشف کا درس دیتے تھے۔ وہ ایک عارف، مفسر اور عالم شخص تھے۔ جو دراصل اس دنیا کے بندے نہیں تھے اور ان کے اشعار بھی ایک رموز زبان میں ہیں۔ چونکہ وہ مفسر ہیں اور قرآنی آیات کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اس موضوع کو کہ ”رات عبادت کا وقت ہے اور دن حرکت اور کاروبار کا وقت ہے“ حافظ شیرازی نے اسے اپنی رموز زبان میں یوں نظم کیا ہے:

۶۲

روز در کسب نہر کوش کہ می خوردن روز  
دل چوں آئینہ در زنگ ظلام اندازد  
اں زماں وقت می صبح فروغ است کہ شب  
گرد خرگاہ افق پردہ شام اندازد  
دن کو کار جہاں میں نگارہ — کیونکہ دن میں شراب پیئے سے  
دل پر زنگ آجاتا ہے۔

صبح کی طرح جھمکتی ہوئی شراب پیئے کا وقت وہ ہے جب دنیا پر  
رات کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔

امام علی علیہ السلام ایسے ہی ہیں کہ ان کا دن وہ اور رات یہ ہے صبح  
اور یہ تعبیر جو ہم اس وقت بیان کر رہے ہیں یعنی ”کامل انسان“ ایک جامع الاضداد بشر  
یعنی مختلف اوصاف میں کمال رکھنے والے انسان سے جیسے ہم تعبیر کر رہے ہیں  
امام علی علیہ السلام ہزار سال سے کچھ اوپر آج تک اسی صفت سے پہچانے  
جاتے ہیں حتیٰ کہ خود سید رضی شیخ الاسلام کے مقدمے میں کہتے ہیں :

”میں جو بات ہمیشہ اپنے دوستوں کے ساتھ کہتا ہوں اور ان کی حیرت میں  
ڈالتا ہوں، وہ یہی موضوع یعنی امام علی علیہ السلام کے کلام کے گونا گوں پہلو  
ہیں کہ انسان ان کے کلام کے جس حصے میں پہنچتا ہے، دیکھتا ہے کہ وہ پہلی  
دنیا سے مختلف ایک اور دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ پھر وہ ایک اور مقام پر پہنچتا ہے  
اور دوبارہ دیکھتا ہے کہ یہ ایک اور ہی دنیا ہے۔ ایک وقت میں وہ عابدوں  
کی دنیا میں اور ایک وقت زاہدوں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت فلسفیوں  
کی دنیا میں اور ایک وقت عارفوں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت میں

سپاہیوں اور افسروں کی دنیا میں اور ایک وقت میں عادل حاکموں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت میں قاضیوں کی دنیا میں اور ایک وقت منشیوں کی دنیا میں ہوتا ہے و علیٰ ہذا.....

چنانچہ انسان دیکھتا ہے کہ علیٰ تمام دنیاؤں کی سیر کرتے ہیں اور تمام دنیاؤں میں اس طرح موجود ہیں کہ بشریت کی دنیاؤں میں سے کسی دنیا سے غائب نہیں ہیں۔

صفی الدین علیؒ آٹھویں صدی ہجری میں کہتے ہیں :

۱۹۔ جمعت فی صفاتک الا صداد

۲۰۔ لا یأتی عنک الا صداد

آپ کی ذات میں مختلف متضاد صفات جمع ہو گئی ہیں اس لیے عزت عظیم آپ کے ساتھ ہے۔

آپ حاکم ہیں، حلیم ہیں، شجاع ہیں، زاہد ہیں، سخی ہیں، فقیر ہیں اور..... وہ مزید کہتے ہیں :

آپ حاکم بھی ہیں اور حلیم بھی ہیں۔ حالانکہ عموماً یہ دو چیزیں ایک دوسری سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ آپ انتہائی درجے کے حلیم، انتہائی درجے کے شجاع اور انتہائی درجے کے خوریز ہیں۔ جب خون بہانا ضروری ہو تو آپ اس غلیظ خون کو بہاتے ہیں جو بہایا جانا چاہیے۔ آپ انتہائی درجے کے زاہد اور عابد ہیں۔ آپ فقیر ہیں اور آپ کو دینے والا کوئی نہیں، بلکہ آپ خود عطا کرنے والے ہیں۔ آپ مال نہیں رکھتے اور جو کچھ آپ کے ہاتھ میں آتا ہے بخش دیتے ہیں، کیونکہ :



۶۴

قرار در کف آزادگان نگیرد مال  
 نہ قدر در دل عاشق نہ آب در غربال  
 جو لوگ حرص دنیا سے آزاد ہیں ان کے ہاتھ میں روپیہ  
 نہیں بھڑتا، جیسے عاشق کے دل میں غصہ اور پھلنی ہیں  
 پانی نہیں بھڑتا۔  
 وہ اسی طرح آپ کی صفات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ حسی کہ

کہتے ہیں:

خَلَقَ لِيَجْعَلَ النَّسِيمَ مِنَ اللَّطِيفِ  
 وَابْعَثَ لِيَذَرِيَّةً مِمَّنَ الْجِسْمَانِ

وہ کہتے ہیں کہ ایک مقام پر آپ کا اخلاق اتنا رفیق اور اتنا نازک ہے کہ  
 نسیم اس کی لطافت سے شرمسار ہے اور آپ کی شجاعت اور حملے اور رُوح جہاد  
 کا یہ عالم ہے کہ پتھر اور دھاتیں اس کے سامنے پھل کر پانی ہو جاتی ہیں۔  
 پس آپ کیسے انسان ہیں؟ آپ کی اصلیت وہ نسیم اخلاق ہے یا یہ  
 گرفت، یہ ثابت قدمی اور یہ قوت؟ تو کچھ آپ کس طرح کے بشر ہیں؟

پس کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جو تمام انسانی قدروں  
 کا مالک ہو اور انسانیت کے تمام مبداءوں میں گویا سبقت لے گیا ہو۔ اب  
 ہم امام علیؑ جیسے کامل انسان سے کیا سبقت سیکھیں؟ ہمیں ان سے یہ سبق  
 سیکھنا چاہیے کہ فقط ایک قدر کو لے کر دوسری قدروں کو نہ بھلا دیں۔ ہم  
 تمام قدروں میں تو اونچے درجے پر نہیں جاسکتے، لیکن ہمیں چاہیے کہ جس  
 حد تک ممکن ہو ایک دوسرے کے ساتھ تمام قدروں اختیار کریں۔ اگر ہم



کامل انسان نہیں ہیں تو کم از کم متعادل انسان تو ضرور بن جائیں۔ ہاں وہی وقت ہوگا جب ہم تمام میدانوں میں ایک حقیقی مسلمان کی شکل میں داخل ہوں گے۔

پس یہ ہیں معنی کامل انسان کے اور یہ ہیں نمونے کامل انسان کے۔  
اس بارے میں باقی باتیں ہیں انشاء اللہ آئندہ نشست میں کروں گا۔

رمضان کا مبارک مہینہ یعنی وہ آخری مہینہ جو امام علی علیہ السلام پر گزرا ..... وہ ایک مختلف ماہ رمضان تھا۔ اس رمضان میں امام علیؑ کے لیے ایک عجیب سرور تھا۔ لیکن آپ کے خاندان کے لیے وہ مہینہ (پہلے دن سے ہی) پریشانی اور اضطراب لے کر آیا تھا۔ کیونکہ رمضان کے گزرے ہوئے تمام مہینوں کے مقابلے میں اس ماہ میں امام علیؑ کی روش بڑی مختلف تھی۔ آپ تو بے فرمایں کہ میں ایک مرتبہ پھر ان کی اعلیٰ خصوصیتاً میں سے ایک آپ کے سامنے عرض کرنے والا ہوں۔

۱۰ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

أَحْسِبَ النَّاسَ أَنْ يَتَذَكَّرُوا إِنْ يَقُولُوا إِنَّمَا  
وَهُمْ لَا يُفْقَهُونَ

کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ صرف یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لائے۔۔۔ چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کا امتحان نہیں لیا جائے گا۔ (سورۃ عنکبوت - آیت ۲)

اس آئیہ شریف میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور فرمایا گیا ہے کہ کیا مومنین یہ

خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں آزمائش میں نہیں ڈالیں گے؟ نہیں بلکہ ہم انہیں ضرور آزمائیں گے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ رسول اکرمؐ کے بعد اس امت کو بڑے بڑے امتحان اور آزمائشیں پیش آئیں گی۔ تب میں نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! جو کچھ اس آیت میں آیا ہے اس کا کیا مقصد ہے؟“

آنحضرتؐ نے فرمایا: ”یا علی! میرے بعد میری امت امتحان اور آزمائش میں ڈالی جائے گی۔“ (فتح البلاء، مفتی جعفر حسین، خطبہ ۱۵۴)

امام علیؑ مزید فرماتے ہیں:

میں نے رسول اکرمؐ سے پھر عرض کیا: ”یا رسول اللہ! جو لوگ اُحد میں شہید ہوئے، ان کی تعداد ۷۰ تھی اور ان کے سردار محمد بن عبدالمطلب تھے جو اُحد کے جاں سپار تھے۔ لیکن مجھے شہادت کا موقع نہ ملا اور میں اس فیض سے محروم رہ گیا۔ اس پر میں بہت مضطرب ہوا کہ میں اُحد میں یہ فیض کیوں حاصل نہ کر سکا اور یہ فیض مجھ سے کیوں دور ہو گیا؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: ”اگر ان مقامات پر شہادت نصیب نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں بالآخر تمہیں راہ خدا میں شہادت کا شرف حاصل ہوگا۔“

جنگ اُحد میں امام علی علیہ السلام ایک ۲۵ سالہ جوان تھے۔ نبی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے نئے نئے رشتہ ازدواج میں شملک ہوئے تھے اور ابھی امام حسن کے سوا انکا اور کوئی فرزند نہ تھا۔ شادی شدہ جوانوں کی ہمیشہ یہ آرزو

ہوتی ہے کہ ان کی زندگی رفتہ رفتہ آگے بڑھتی چلی جائے۔ لیکن ذرا آپ امام علی علیہ السلام کو تو دیکھیے کہ ان کی واحد اور بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہو جائیں!

رسول اکرمؐ نے فرمایا: اے علیؑ! تم بھی شہید ہو جاؤ گے۔  
پھر سوال کیا: اے علیؑ! شہادت کے وقت تم کیسے صبر کر دو گے؟  
امام علیؑ نے عرض کیا: آپ یہ نہ فرمائیں کہ کیسے صبر کروں گے بلکہ یہ فرمائیں کہ کیسے شکر گزار ہو گے؟ کیونکہ یہ صبر کا نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

چنانچہ اپنی زندگی کے اس آخری رمضان میں امام علیؑ پر ایک عجیب کیفیت سرور طاری تھا، جبکہ آپ نے اہل بیت مضطرب اور بے چین تھے۔ آپ کی شہادت کے بارے میں جو خبریں رسول اکرمؐ نے دی تھیں اور جو علامتیں خود امام علیؑ علیہ السلام کو معلوم تھیں کہ کبھی کبھی ان کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ ان علامات کی موجودگی کے نتیجے میں آپ کے اہلبیتؑ اور قریبی اصحاب کے دلوں میں اضطراب اور بے قراری پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ آپ عجیب اور مرموز باتیں کرتے تھے۔

اگرچہ آپ اپنی زندگی کے آخری رمضان میں ہر رات کہیں نہ کہیں جھانپتے۔ لیکن وہاں بہت ہی کم کھانا کھاتے تھے۔ باپ کی یہ حالت دیکھ کر آپ کے بیٹوں بیٹیوں کا دل کڑھتا تھا اور ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ کیونکہ وہ آپ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ وہ پوچھتے: آپ اتنا کم کھانا کیوں کھاتے ہیں؟

آپ فرماتے: میں چاہتا ہوں کہ اپنے خدا سے اس حالت میں ملاقات

کردن کہ میرا پیٹ خالی ہو۔ وہ سمجھ جاتے تھے کہ ہمارے بابا امام علیؑ کو غمگین ہی وقوع پذیر ہونیوالی کسی چیز کا انتظار ہے۔ بعض اوقات آپ آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے:

”میرے حبیب رسول اکرمؐ نے جو فردی ہے وہ صحیح ہے۔ انہوں نے جو کچھ فرمایا۔۔۔ وہ جھوٹ نہیں ہے۔ اس لیے اب وہ وقت نزدیک ہے اور بہت ہی نزدیک ہے۔“

میں پہلے ہی سے یہ عرض کرنا چلوں کہ امام علیؑ نے ماہ رمضان کے تیرہویں دن ایک ایسی بات کہی جس نے بہت زیادہ پریشانی پیدا کر دی ظاہر ہے کہ یہ جملہ کا دن تھا اور آپ خطبہ دے رہے تھے۔ تب آپ نے فرمایا:

میرے بیٹے حسینؑ! اس مہینے کے کتنے دن باقی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: سترہ دن۔ آپ نے فرمایا: ہاں اب وہ وقت نزدیک آگیا ہے جبکہ یہ ڈاڑھی اس سر کے خون سے رنگین ہو جائے گی۔

پھر جب ماہ رمضان مبارک کی انیسویں تاریخ آئی تو امام علیؑ علیہ السلام کے فرزند آپ کے پاس آئے اور رات کا کچھ حصہ آپ کی خدمت میں رہے اور پھر امام حسنؑ اپنے گھر چلے گئے۔ امام علیؑ کا ایک خاص حجرہ تھا یہاں آپ راتوں کو عبادت کیا کرتے اور سوتے نہیں تھے۔ جب اپنے کاموں یعنی زندگی اور معاشرے کے کاموں سے فارغ ہوتے تو اپنے اس حجرے میں جا کر خدائے تعالیٰ سے راز و نیاز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ ابھی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی کہ امام حسنؑ اپنے والد گرامی کے پاس آئے اور سیدھے ان کے حجرے میں گئے۔ امیر المومنین علیہ السلام اپنے ان فرزند کا خاص احترام کرتے تھے جو

بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی اولاد تھے۔ اس طرح آپ حضرت زہرا اور رسول اکرمؐ کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ پس آپ نے اپنے بیٹے حسنؑ سے فرمایا: ۲۲ پیارے بیٹے! مجھے پچھلی رات بیٹھے بیٹھے نیند آگئی۔ میں نے عالم رویا میں رسول اکرمؐ کو دیکھا تو عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے آپ کی اس امت کے ہاتھوں بہت صدمے اٹھائے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ان پر نفرین کرو! میں نے ان پر نفرین کی اور چاہا کہ خدا مجھے ان سے لے لے اور ایک نالائق شخص کو ان پر مسلط کر دے۔ ہاں واقعی یہ بات بڑی عجیب ہے کہ لوگوں نے امام علیؑ علیہ السلام سے موافقت نہ کی اور اس راستے پر چلتے پر آمادہ نہ ہوئے جو آپؑ نے اپنی دکھایا۔ امام علیؑ کو دیکھ بیچائے غلوں میں پہلے تو اصحابِ عائشہؓ تھے جنہوں نے بیعت توڑ دی تھی۔ ان کے بعد معاویہ اٹھا جس نے دھوکے سے کام لیا اور مختلف جرائم کیے۔ معاویہ دنیا کے تیز طرار آدمیوں میں سے تھا۔ یعنی وہ اتنا چالاک تھا کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ امام علیؑ کو کون باتوں سے دلی تکلیف پہنچتی ہے اور وہ جان بوجھ کر وہی کام کرتا تھا۔ نفیر اور آخری گروہ خوارج کا تھا۔ یعنی وہ زاہد خشک لوگ جو اپنے پکے عقیدے، ایمان اور خلوص سے امام علیؑ کو کافر گردانتے تھے! کیا آپ کو علم نہیں کہ وہ امام علیؑ کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے!

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان امیر المومنینؑ کے مصائب پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کیونکہ اتنے مصائب برداشت کرنے کی تو ایک پہاڑ میں بھی طاقت نہیں ہے! آپ بتائیں کہ امام علیؑ اپنا در و دل کس سے کہیں؟ اب جبکہ علیؑ — رسول اکرمؐ کو عالم رویا میں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

مجھے آپ کی امت نے کتنے صدے پہنچائے ہیں، میں ان کے ساتھ کیا کروں؟

پھر آپ نے فرمایا: پیارے بیٹے! آپ کے نانائے مجھے حکم دیا تھا کہ اے علی! ان مخالفوں پر تفریق نہ کرو اور میں نے بھی عالم رویا میں ان پر تفریق کی جو اس طرح تھی:

یعنی ”خدا مجھے جلدی موت دے دے اور ان پر ایسا حاکم مسلط کر دے جس کے یہ لائق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس جملے سے کتنی پریشانی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔“

پھر آپ گھر سے باہر آتے ہیں اور بطنیں چلاتے ہیں تو آپ فرطے ہیں: ”لگے ہاں! اس وقت تو صورت پرندوں کی آواز ہے۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ اسی جگہ انسانوں کے نوحہ و ماتم کی آواز سنائی دے گی۔“

(کشف الغمہ صفحہ ۴۳ - منتہی الآمال صفحہ ۱۷۲)

امیرالمومنینؑ کے فرزندوں نے آپ کا راستہ روکا اور عرض کیا: باباجان! آج ہم آپ کو مسجد نہیں جاتے دیں گے۔ لازم ہے کہ آپ کسی دوسرے کو اپنے نائب کے طور پر مسجد بھیج دیں۔

پہلے تو آپ نے فرمایا کہ میرے بھانجے جعدہ بن حیرہ سے کہو کہ جا کر لوگوں کو نماز پڑھائے لیکن بعد میں آپ نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور فرمایا: نہیں میں خود جا رہا ہوں۔

انہوں نے عرض کیا: آپ اجازت دیں کہ کوئی آپ کے ہمراہ جلتے۔

آپ نے فرمایا: نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ہمراہ جائے۔ وہ رات آپ کے لیے پسندیدہ رات تھی اور آپ کا یہ ارشاد آپ کے انجام کار کی تعبیر ہے:

۲۲۔ میری مثال بس اس شخص جیسی ہے جو رات بھر پانی کی تلاش میں چلے اور صبح ہوتے ہی چشمہ پر پہنچ جائے اور میں اس ڈھونڈنے والے کی مانند ہوں جو مقصد کو پا لے۔

(بخاری، المغنی، جعفر صہبانی، ص ۲۳)

ضرورت لگنے کے بعد جب آپ کو بستر پر لٹایا گیا تو یہ جملے ارشاد فرمائے:

”خدا کی قسم جب یہ ضرب میرے سر پر لگی تو میری مثال اس عاشق جیسی تھی جو اپنے معشوق تک پہنچ جاتا ہے۔“

نیز میری مثال اس شخص جیسی تھی جو اندھیری رات میں پانی کا چشمہ تلاش کرتا ہے تاکہ اپنا خیمہ اور ساز و سامان لے کر وہاں پہنچ جائے۔ پھر اگر اسے پانی کا چشمہ مل جائے تو وہ کتنا خوش ہوتا ہے۔ ہاں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جس کے بارے میں حافظ نے کہا ہے:

دو شوقِ سحر از غصہ سجا تم دادند

اندراںِ غلمت شبِ آبِ حیات دادند

چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی

آن شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

کل رات وقتِ سحر مجھے غمِ دوراں سے نجات ملی گئی۔ جب کہ

رات کے اندھیرے میں مجھے آبِ حیات سے سیراب کر دیا گیا۔



۷۲

وہ کیسی مبارک رات اور کیسی اچھی صبح تھی۔۔۔۔۔ وہ تو  
غیبِ برات تھی کہ جس میں مجھے تازہ نصیب سے نوازا گیا۔

آپ نے فرمایا: میں خود جا رہا ہوں۔ خدا جانے کہ آپ کے دل میں  
کیا کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ آپ خود فرماتے ہیں: میں نے بہت کوشش  
کی کہ اس بات کا راز بیان کروں اور آپ نے اس کی بعض خصوصیات بیان  
کیں۔ تاہم آپ مجھ پر ہی جانتے تھے کہ مجھے ایک بہت بڑا حادثہ پیش  
آئے والا ہے۔

بیچ البلاغہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا:

۷۵۔۔۔۔۔ میں نے اس معاملے کا راز جانتے ہی بہت کوشش  
کی لیکن خدا نے چاہا سوائے اس کے کہ اس کو پوشیدہ کر دے۔

(بیچ البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۱۴۷)

گھر سے چل کر آپ مسجد میں آپہنچے۔ صبح کی اذان آپ خود دیا کرتے تھے۔  
اذان کا وقت ہو چلا تھا۔ اس لیے آپ گلدستہ اذان پر شریف لے گئے اور  
”اللہ اکبر“ ”اللہ اکبر“ کی آواز بلند کی۔ اذان دیکر طلوع ہونے والی  
اس صبح کو خدا حافظ کہا اور فرمایا: اے صبح، اے نورِ سحر! جب سے علیؑ نے  
اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے کیا کوئی ایسا دن گزرا ہے کہ تو طلوع ہوئی اور علیؑ  
سورہا ہو؟ یعنی اے سپیدہ صبح! آج کے بعد علیؑ کی آنکھ ہمیشہ کے لیے بند  
ہو جائے گی۔

جب آپ اذان کے چوتھے سے اترنے لگے تو فرمایا:

۷۶۔۔۔۔۔ مومن و مجاہد کو راستہ دو۔

۷۳

وہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا  
اس وقت اور لوگ بھی مساجد کی طرف آرہے ہیں

(دیوان علی بن ابی طالب)

یہاں آپ اپنا ایک مجاہد و مومن کے طور پر تعارف کرا  
رہے ہیں۔ پریشانی اور اضطراب کا دور دورہ ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا تھا  
کہ اس اضطراب کے بعد توجہ و قائم ہو گا۔ آپ کے سبھی گھروالے بیدار لیکن  
بے چین ہیں کہ خدایا اس رات ہمیں کیا حادثہ پیش آنے والا ہے؟ کیا ہمارے  
والد اس رات کسی حادثے سے دوچار ہوں گے؟ پھر چائیکہ پی ایک ترخ و پکا  
نے سب کو اپنی چائیب متوجہ کر لیا۔ انہوں نے ایک آواز سنی جو ہر جگہ  
گوچ رہی تھی:

کچھ قسم بخدا کہ ہدایت کے ستون گر گئے۔ اور تقویٰ  
کے نشان مٹ گئے۔ دینداری کی مضبوطی ٹوٹ گئی  
محمد مصطفیٰؐ کے ابن عم شہید ہو گئے، وہی رسولؐ  
شہید ہو گئے۔ علی مرتضیٰؑ شہید ہو گئے۔ انہیں ایک  
بڑے شقی نے شہید کر دیا۔ (منتہی الامال)

نہیں کوئی قوت مگر وہ کہ جو بڑی شان والے خدا سے ملتی ہے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ  
وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

## تیسری نشست

### انسان کی ماہیت

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ انہوں نے پوری کر دیں۔ تب خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کی اور میری اولاد میں سے۔۔۔ خدا نے فرمایا ہاں مگر میرے اس عہدے پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔

(سورۃ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔۔۔ انسان کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اس کے متعلق ایک دوسرے کے بالمقابل دو بنیادی نظریے ہیں جن میں سے ایک نظریہ خدا پرستوں اور دوسرا مادہ پرستوں کا ہے۔ خدا پرستوں کے نظریے کے مطابق انسان جسم اور روح سے مرکب ایک موجود ہے۔ انسان کی روح جاوداتی ہے اور انسان کے مرنے سے فنا نہیں ہوتی۔

۷۵

چنانچہ ہم جانتے ہیں، دین کی تعلیمات اور بالخصوص اسلامی نصوص اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔

مادہ پتوں کے نظریے کے مطابق انسان اس بدن — اور اس بدن کے نظام کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں اور مر جانے پر مکمل نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے بدن کی تحلیل کے معنی انسان کی شخصیت کا تحلیل ہو جانا ہے۔

باوجودیکہ انسان کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں اتنا بڑا اختلاف نظر موجود ہے لیکن ایک اور معاملے کے بارے میں جو اس مسئلے سے وابستہ ہے — کوئی اختلاف نظر نہیں ہے۔ وہ معاملہ یہ ہے کہ ایک سلسلہ امور ہے جو مادے اور مادیات کی جنس سے نہیں ہے اور انہیں معنویات کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ امور ایسی خصوصیات پر مبنی ہیں جو انسان کو شخصیت اور قدر و قیمت بخشتی ہیں اور انسان کا انسان ہونا انہی امور کی بدولت ہے۔ اگر انسان سے یہ خصوصیات لے لی جائیں تو انسان اور حیوانات میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ انسان کی انسانیت اس کی جسمانی ساخت کی بنا پر نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو شخص ایک سر اور دو کان رکھتا ہو، اس کے ناخن چھٹے اور قد سیدھا ہو تو وہ انسان ہے۔ خواہ کوئی بھی ہو اور کیسا ہی کیوں نہ ہو، یہ وہی بات ہے جو سعدی نے ان الفاظ میں کہی ہے:

تن آدمی شریف است بہ جان آدمیت      نہ ہمیں لباس زیباست نشان آدمیت  
اگر آدمی بہ چشم است و دہان و گوش بینی      چہ میان نقش دیوار و میان آدمیت  
انسان کا بدن اس کی روح کے باعث قابلِ قدر ہے، صرف یہ مناسب

بدن ہی آدمیت کی نشانی نہیں ہے۔ اگر اسی منہ، ناک، کان اور آنکھ کا نام ہی انسان ہے تو پھر دیوار پر بنی ہوئی آدمی کی تصویر اور خود اس آدمی میں کیا فرق رہے گا۔

ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ آدمی بننا اور آدمی ہونا مشکل ہے اور ایک مثل کہ جو طالب علموں کے ہاں مرتب ہوتی اور مشہور ہو گئی — یعنی ”ملاشدن چہ آسان“ — ”آدم شدن چہ مشکل“ — پس اگر اس بدن کے معنی ہی آدمی ہونے کے ہیں تو پھر جو لوگ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں وہ سب آدمی ہوتے ہیں۔ مگر نہیں — ایسا نہیں ہے، بلکہ آدمی ہونا صفات، اخلاق اور معنوی امور کا ایک الگ سلسلہ ہے، گویا یہی وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت انسان انسان ہے۔ آدمی ہے اور قدر و قیمت اور شخصیت پیدا کرتا ہے۔

آجکل ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کا نام ”انسانی قدیریں“ ہے۔ وہ تمام چیزیں جو انسان کو قدر و قیمت اور شخصیت عطا کرتی ہیں اور اگر وہ نہ ہوتیں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ وہ ”انسانی قدیریں“ کہلاتی ہیں۔ میں نے گزشتہ نشست میں جو کچھ عرض کیا تھا، آج کی نشست میں

اس موضوع پر بیان جاری رکھنا چاہتا ہوں:

فرد یا معاشرے میں جو انحرافات پیدا ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم کے انحرافات یہ ہیں کہ انسانی قدروں کی اصداوان کے مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہیں مثلاً — ”ظلم“ — ”عدل“ کے مقابلے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ”گھٹن“ اور ”پابندی“ — ”آزادی“ کے مقابلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ”بے غمبختی“ اور ”بے اعتدالی“ — ”عبادت“ اور ”خدا پرستی“

کے مقابلے میں کھڑی ہو جاتی ہیں ”نادانی“ اور ”حماقت“ ”عقل“ ”فہم“ اور ”حکمت“ کے مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ..... لیکن شاید انسان کے زیادہ تر انحرافات اس شکل میں نہیں ہوتے کہ قدروں کی ضدیں ان کے مقابل کھڑی ہوں۔ اگر ایسا ہو تو جلد ہی شکست کھا جائیں بلکہ انسان کے بیشتر انحرافات اس شکل میں ہوتے ہیں جیسے سمندر میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات کوئی ایک انسانی قدر۔۔۔ سرطان کی مانند بڑھنے لگتی ہے اور دوسری قدروں کو اپنے نیچے دبا لیتی ہے۔ مثلاً زہد و تقویٰ بجائے خود ایک قدر ہے اور انسانی معیارات میں سے ایک معیار ہے۔ لیکن بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ ایک فرد یا ایک معاشرہ زہد کی جانب اس قدر مائل ہو جاتا ہے۔ وہ اس میں اتنا غور ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے زہد ہی سبھی کچھ ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا وہ اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جس کا فقط ایک عضو (مثلاً اس کی ناک) بڑھے اور اس کے باقی اعضاء کی ترقی رُک جائے۔

اب اس مقدمے کے ساتھ جو میں نے اس نشست میں عرض کیا ہے کہ تمام مکاتب فکر حتیٰ کہ انسان میں جو سب سے زیادہ مادہ پرست ہیں وہ بھی معنوی قدروں کے ایک سلسلے کے قائل ہیں۔ اس بیان کے ساتھ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں:

اصولی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انسانی قدروں کا لب لباب ایک عنوان کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے اور پھر خود اس سے شاخیں نکلتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو خود ہمارے عارفوں کی اصطلاح میں اور آج کل کے علماء کی

تحریروں میں بھی آئی ہے۔ بلکہ علمائے عرفان کی اصطلاح میں آنے سے پہلے یہ ہمارے اسلامی متون میں آئی ہے۔ اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ انسانیت کا اصلی معیار وہ چیز ہے جسے ”درد رکھنے“ یا ”صاحب درد ہوتے“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ انسانیت کا اصلی معیار ہے۔

انسان اور حیوان کے درمیان یہی فرق ہے کہ انسان صاحب درد ہے اور کئی ایک درد رکھتا ہے لیکن جو انسان نہیں ہیں۔ چاہے وہ حیوان ہوں یا ایک سر اور دو کان رکھنے والے انسان کہ جو انسانیت کی رُوح سے بے بہرہ ہوں، وہ صاحب درد نہیں ہوتے۔

اب سب سے پہلے ہمیں خود ”درد“ کے بارے میں بحث کرنی چاہیے۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں یہ بات ذہن کو عجیب سی لگے کہ آخر اس کے معنی کیا ہیں؟ درد ایک بری چیز ہے اور ایک ایسی چیز ہے جسے انسان کو اپنے آپ سے دور رکھنا چاہیے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔ پھر یہ کہیے ہو سکتا ہے کہ انسانیت کا معیار اور عظیم ترین قدر ”درد رکھنا“ ہو؟ کیا درد ایک اچھی چیز ہو سکتا ہے؟ شاید ہم غلطی کھا رہے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ اس کی اہلیت دریافت کریں۔ مثلاً ایک بیماری یا ایک زخم ہے تو جو چیز بری ہے وہ اس آفت، جراثیم، بیماری اور زخم کا وجود ہے جو بدن پر وارد ہوتا ہے اور بعد میں درد کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ ایک انگلی کا کٹ جانا برا ہے، جو درد معدے یا انٹریوں میں ہوا اور انسان اس درد کو محسوس کرے اور..... بالآخر جو چیز انسان کے لیے بری ہے وہ زخم کا وجود ہے کہ جس سے نقصان پہنچتا ہے



لیکن خود درد — اگرچہ وہ انسان کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے، مگر وہ انسان کو ایک خرابی سے آگاہ اور ہشیار کرتا ہے۔ جب اعضاء میں — مثلاً انسان کے سر میں درد ہوتا ہے تو اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی ہو اور درد وجود میں آجائے۔ اگر درد پیدا ہوتا ہے تو وہ آپ کو خبر دیتا ہے اور مطلع کرتا ہے کہ سر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس خیر اور آگاہی کے نتیجے میں آپ اس کے علاج کی فکر کرتے ہیں۔ درد بعینہٴ رحمت رفتار اور پانی کے درجہ حرارت کی علامتوں کی مانند ہے جو موٹر کا پانی کم ہوجانے کی نشاندہی کرتا ہے۔ نشاندہی کر کے دلی سونپی اچھی چیز ہے لیکن پانی کا کم ہوجانا اور آپ کی موٹر کا گرم ہوجانا اچھی چیز نہیں ہے۔ اگر انسان کے بدن اور سر میں درد ہوتا اور وہ محسوس نہ کرتا تو ہرگز اسے بدنی خرابی کی پیشگی اطلاع نہ ہوتی اور بعد میں وہ اس خرابی کے علاج کا نہ سوچتا۔ یہ ایک مقررہ حاکم کی طرح انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ علاج معالجے کی فکر کرے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ”درد“ ہے اور بے چینی ہے۔ اس کا علاج ضروری ہے — لہذا درد ایک نعمت ہے۔

ہمد و پیمان می کنی کہ بعد از این  
جز کہ طاعت بنودم کاری گزین  
پس یقین گشت آنکہ بیماری ترا  
می بخشند هوش و بیداری ترا  
پس بدان این اصل را ای اصل جو  
ہر کہ راہ درد است او بروہ است بو

ہر کہ او بیدار تر پر درد تر  
ہر کہ او آگاہ تر رخ زرد تر

جب تو یہ عہد کرتا ہے کہ آج کے بعد بندگی کے سوا کوئی کام  
نہ کروں گا۔ اس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تکلیف تجھے ہوش  
اور بیداری میں رکھے گی۔

بے طالب حق تو اس حقیقت کو سمجھ لے کہ ایک درد آشنا  
ہی حق کو پاتا ہے۔ جو زیادہ بیدار ہے وہ زیادہ درد آشنا اور  
جو زیادہ باخبر ہے وہ زیادہ پریشان ہے۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۱۸)

جو شخص دنیا میں زیادہ صاحب درد اور ایسا درد محسوس کرے جو  
دوسرے محسوس نہیں کرتے تو وہ اسی نسبت سے ان سے زیادہ جاننے والا  
اور زیادہ بیدار ہوتا ہے۔ ”بی دردی“ — ”عریانی“، بے حسی، بے شعوری  
اور بے اوراکی کے برابر ہے، جبکہ درد مندی — آگاہی، بیداری، شعور  
اور اوراک کے مساوی ہے۔

اگر انسان کا معاملہ ایسا ہو کہ وہ آرام میں ہو لیکن بے درد ہو اور درد  
محسوس نہ کرتا ہو، یعنی جاہل اور بے درد ہو یا یہ کہ وہ ہوشیار ہو اور اپنا درد  
محسوس کرتا ہو؟ کیا ایک انسان اس بات کو ترجیح دے گا کہ وہ ہوشیار  
اور سمجھدار ہو اور درد محسوس کرے یا اس بات کو ترجیح دے گا کہ وہ بے عقل،  
کنزدہن اور احمق ہو اور درد کو محسوس نہ کرے؟ گویا کہ ایک — ”ہوشیار“  
اور — ”آگاہ“ — شخص کی بے چینی — کسی جاہل، بے خبر اور بے حس شخص

کے آرام اور آسائش پر فوقیت رکھتی ہے۔

ایک ضرب المثل ہے کہ انسان اگر سقراط ہو، لیکن دبلا پتلا اور کمزور ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سور کی طرح ہٹا کٹا ہو۔ یعنی جو شخص سقراط کی طرح دانا اور عالم ہو لیکن آسائش سے محروم ہو تو بھی وہ اس سے بہتر ہے کہ سور کی طرح کھانے پینے کو سب کچھ میسر ہو لیکن وہ کوئی سمجھ بوجھ نہ رکھتا ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری ادبیات میں جو ایک چیز نمایاں ہے، وہ عقل سے شکایت کا مسئلہ ہے۔ اپنی نظم و نثر میں اور بالخصوص نظم میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ شعراء نے عقل کی شکایت کی ہے۔ کاش ہم یہ عقل نہ رکھتے ہوتے۔ البتہ عقل سے یہ شکایت ایک مختلف پہلو رکھتی ہے۔ عارفوں کی نظر ایک اور چیز پر ہے لیکن بہت سے اشخاص نے اس بنا پر شکایت کی ہے کہ ہوشیار، حساس اور دانا ہونا انسان سے آسائش سلب کر لیتا ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے:

دشمن جان من است عقل من و ہوش من  
کاش گشاوہ بنود چشم من و گوش من  
میری عقل اور ہوش میری جان کے دشمن ہیں، کیا اچھا ہوتا کہ میری آنکھ اور کان — دیکھنے سننے سے محروم ہوتے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

عاقل مباح تا غم دیوانگاں خوری  
دیوانہ باش تا غم تو عاقلان خورند  
تو عاقل نہ بن کہ تجھے دیوانوں کا غم کھانا پڑے بلکہ دیوانہ ہو جا کہ عقل مند

تیری فکر کیا کریں۔

یعنی وہ ”جنون کی بے فکری اور آسائش“ کو ”عقل کی فکر مندی اور ناراحتی“ پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ اور گفتار سراسر غلط ہے، کیونکہ جو شخص انسانیت کے مقام پر پہنچ جائے اور حساسیت اور ”درد مندی“ کی قدر و قیمت کو سمجھ گیا ہو وہ ہرگز یہ نہیں کہتا:

”دشمن جان من است، عقل من ہوش من“

بلکہ وہ رسول اکرمؐ کی یہ حدیث نقل کرتا ہے:

”ہر شخص کی سچی دوستی اس کی عقل اور ہوش ہے اور ہر شخص کی حقیقی دشمنی اس کی جہالت اور نادانی ہے۔“

(وسائل الشیخ جلد ۱ صفحہ ۱۶۱)

جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ عقل و ہوش میری جان کے دشمن ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہالت اور نادانی سے پیدا ہونیوالی پریشانیوں اور مصیبتوں کو محسوس نہیں کرتا، ورنہ وہ ہرگز یہ بات نہ کہتا۔ لہذا درد اور درد کا احساس اچھی چیز نہیں ہیں۔ اگر صورت یہ ہو کہ انسان کے اندر ”درد کا موجب“ نہ ہو اور انسان درد نہ رکھتا ہو تو ”درد کا موجب“ نہ ہونے کی بنا پر درد نہ رکھنا، درد رکھنے سے بہتر ہے۔ لیکن اگر درد کا موجب موجود ہو، خرابی موجود ہو اور اس کی بنیاد موجود ہو، مگر انسان درد کا احساس نہ کرے تو یہ بے خبری، بیچارگی اور بد بختی ہے۔ لہذا جسمانی بیماریوں میں سے جو بھی بیماری آئے اور شروع میں اس کا درد محسوس نہ ہو تو وہ مہلک ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ابتدا میں ہی درد کا موجب ظاہر نہ ہو جائے اور انسان درد کا احساس

کرے تو ممکن ہے کہ اس کا علاج کر لیا جائے یا کم از کم اس سے پیشتر کہ وہ چیز خون میں داخل ہو، اسے آپریشن کے ذریعے نکال دیا جائے۔ اس بیماری سے اس بنا پر زیادہ خطرہ ہے کہ وہ بے خبری کے عالم میں یعنی درد کے بغیر وارد ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسانیت کی اقدار میں سب سے بڑی قدر ”درد رکھنا“ ہے یا درد پیری چیز ہے اور اس کا علاج کرنا چاہیے نہیں۔ ایسا نہیں ہے اور درد اچھی چیز ہے۔ اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور غور کرتے ہیں کہ انسان کا درد کیا ہے؟ آدمی کے سر میں درد ہوتا ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ انسان ہے، وہ درد انسان کا نہیں ہے۔ کیونکہ ایک حیوان کے سر میں بھی درد ہوتا ہے۔ انسان کے ہاتھ میں درد ہوتا ہے، انسان کے پاؤں میں درد ہوتا ہے اور.... تاہم یہ جو حیوانی، عضوی اور شخصی درد ہیں یہ مشترک درد ہیں لیکن وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ”انسان کا درد“ اس کا ”صاحب درد ہونا“ ہے۔ ان کی مراد یہ جسمانی درد نہیں ہے بلکہ وہ ایک اور چیز ہے۔ ہاں۔۔۔ وہ درد جو انسان اور انسانیت کی قدروں میں سب سے بڑی قدر ہے۔ وہ اس درد سے ایک مختلف چیز ہے۔

خود ہمارے عارفوں کی طرح ایک اور گروہ بھی انسان کے بارے میں جس درد کا اقرار کرتا ہے وہ یہی ”درد“ ہے۔ وہ لوگ اسے مقدس قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ انسان کے امتیازات میں سے ہے۔ بلکہ انسان اس بنا پر فرشتے پر فوقیت رکھتا ہے، کیونکہ فرشتے بے درد ہیں اور انسان درد رکھتا ہے۔ یہ وہ درد ہے جسے عارف لوگ ”خدا کی تلاش کا درد“

کہتے ہیں لیکن یہ فقط انہی کا نظریہ نہیں — اس بارے میں اسلام کا نظریہ بھی یہی ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان ایک ایسی حقیقت ہے جو نفعِ رِالٰہی سے وجود میں آئی ہے۔ انسان ایک دوسری دنیا سے آیا ہے اور اس دنیا کی طبعی چیزوں کے ساتھ مکمل یکے لگی نہیں رکھتا۔ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کے تمام موجودات کے ساتھ اپنی اخلاقیات، بیگانگی اور عدم مطابقت کو محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ یہ سب فانی اور متغیر ہیں۔ لہذا دل رگانے کے قابل نہیں ہیں لیکن انسان میں جاودا بن جانے کا ایک وسیع وجود رکھتا ہے۔ پس یہی وہ درد اور یہی وہ قوت ہے جو انسان کو خدا پرستی، عبادتِ گزاری اور اس سے راز دنیا ز کرنے، نیز اس کے نزدیک ہونے کی جانب کھینچتی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے عرفان میں اس موضوع پر کیسی کیسی مثال آئی ہیں بعض اوقات ایک طوطے کی مثال دی جاتی ہے جس کو سندھوستان کے جنگلوں سے لایا گیا اور دوسرے طوطوں سے الگ کر کے ایک پنجرے میں قید کر دیا گیا۔ پھر یہ حیوان ادا اس رہتا ہے اور ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ یہ پنجرہ ٹوٹ جائے اور وہ لوٹ کر اس جگہ چلا جائے جو اس کا اصلی وطن ہے۔

کبھی اسے ایک ایسے پرندے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو اپنے گھونسلے سے دور جا بڑا ہو۔ اس طرح کی بہترین تشبیہوں میں سے ایک تشبیہ خود مولوی مثنوی کی ہے۔ انہوں نے مثنوی کی ابتدا میں ہی اسے اس بنسری کی لکڑی سے تشبیہ دی ہے جسے جنگل سے کاٹا گیا ہے۔ وہ مسلسل

نالہ و فریاد اس لیے کر رہی ہے کہ اپنی اصل سے جدا ہو گئی ہے :

بشغوا زنی چوں حکایت می کند

وا ز جدا یئہا شکایت می کند

کز نیستال چوں مرا ببردہ اند

از فقرم مرد وزن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرح شرح از فراق

تا بگویم شرح درد اشتیاق

درد ہاں داریم گویا ہیمچونی

یاب دہاں پہنا نست درد بہای وی

بنسری کے سنو کہ وہ اپنے فراق کی بات بتا رہی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ مجھے جنگل سے کاٹا گیا اور میری آواز پر سب

روتے ہیں۔ میرا دل درد فراق سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا کہ میں اپنی

محبت کا قصہ سناؤں۔ بنسری کی طرح ہمارے دو متہ

ہیں اور ایک اس کے ہونٹوں میں پوشیدہ ہے۔

(مثنوی مولانا روم۔ ابتدائی اشعار)

اس کے علاوہ اسے ہاتھی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔ جیسے ایک مشہور

داستان میں کہا گیا ہے کہ ہاتھی عموماً ہندوستان سے لایا جاتا ہے۔ اس لیے

ضروری ہے کہ اس کے سر پر مسلسل ضربیں لگائی جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے

تو ہاتھی اپنے اصل وطن ہندوستان کو یاد کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی

کہتے ہیں :



پیل باید تا چو خسید اوستان  
 خواب بنید خطہ ہندوستان  
 خر بنید تیج ہندوستان بہ خواب  
 خر ز ہندوستان نکرہ است اغراب  
 ہاتھی جب اپنے استھان پر ہوتا ہے تو ہندوستان کے  
 خواب دیکھتا ہے۔

گدھا ہندوستان کے خواب نہیں دیکھتا، کیونکہ وہ وہاں  
 سے نہیں نکلتا ہے (مثنوی مولانا روم - صفحہ ۴۰۰)۔  
 یعنی یہ فقط ہاتھی ہی ہے جو خواب میں ہندوستان کو دیکھتا ہے،  
 کیونکہ وہ ہندوستان سے آیا ہے۔ گدھا ہرگز ہندوستان کو خواب میں نہیں دیکھتا  
 کیونکہ اسے ہندوستان سے نہیں لایا گیا اور وہ اپنے وطن سے دور نہیں ہوا۔  
 وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان عرفانی درو کی بدولت دوسری دنیا کی جانب  
 ہٹ جانے کی کسک رکھتا ہے۔ ورنہ اسے حق کی جانب اور خدا کی طرف رجوع  
 ہونے پر مائل کرتا ہے۔ وہ خدا سے مناجات کرنے اور اپنے خالق سے صال  
 کا در رکھتا ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔ ایک دن  
 آپ نے اپنے صحابی کبیل بن زیاد نخعی (رحمۃ اللہ علیہ) کا ہاتھ پکڑا، اور  
 قبرستان کی جانب لے چلے۔ جب کچھ دیر بعد آپ آبادی سے باہر نکل  
 آئے تو ایک ٹہنی آہ کھینچ کر بولے :  
 اے کبیل! یہ دل اسرارِ حکمت کے ظروف ہیں۔ ان میں

سب سے بہتر وہ ہے جس کی طرفیت زیادہ ہو یا وہ بہتر  
نگہداشت کر نیوالا ہو؟

اس کے بعد مولا امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: اے کمبل!  
جوابات میں تمہیں بتا رہا ہوں اسے دھیان سے سننا اور یاد رکھنا۔ بعد ازاں  
امیر المومنین دنیا کے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر اپنے کلام کے  
آخر تک پہنچتے ہیں۔ اور شکایت کرتے ہیں: افسوس!۔ راز حقیقت  
کے سننے اور سمجھنے والے افراد موجود نہیں کہ میں ان کو اپنے دل کی بات بتاؤں۔  
اور اپنا یہ درد دل ان پر ظاہر کر سکوں۔۔۔۔۔ بعد میں فرماتے ہیں: لیکن ایسا  
نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی راز دل نہ ہو۔ کیونکہ ہمیشہ اور ہر زمانے میں ایسے کچھ  
نہ کچھ افراد موجود ہوتے ہیں۔

تھے ہاں! مگر زمین ایسے فرد سے خالی نہیں رہتی کہ جو خدا  
کی حجت کو برقرار رکھتا ہے۔ چاہے وہ ظاہر و مشہور ہو یا خائف  
و پنهان، تاکہ اللہ کی ولیوں اور نشان مٹنے نہ یابن۔  
اور وہ ہیں ہی کتنے اور کہاں پر ہیں!

خدا کی قسم! وہ تو گنتی ہیں بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور اللہ  
کے نزدیک قدر و منزلت میں بہت بلند۔ خداوند عالم ان کے  
ذریعے سے اپنی جتوں اور نشانوں کی حفاظت کرتا ہے۔ یہاں  
تک کہ وہ ان کو اپنے حبیبوں کے سپرد کر دیں اور اپنے حبیبوں  
کے دلوں میں انہیں بُو دیں۔ علم نے انہیں ایک م حقیقت بصیرت  
کے انکشافات تک پہنچا دیا ہے۔ (بخ البلاغہ منفی جعفر حسین علیہ السلام)

وہ اس طرح کے اشخاص ہیں کہ علم حقیقی نے انتہائی بصیرت کے ہمراہ ان کو اپنے دامن میں لے لیا ہے اور وہ یقین کامل کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔  
 ۳۱ وہ یقین و اعتماد کی روح سے گھل مل گئے ہیں اور ان چیزوں کو جنہیں آرام پسند لوگوں نے دشوار قرار دے رکھا تھا اپنے لیے سہل و آسان سمجھ لیا ہے اور جن چیزوں سے جاہل بھڑک اٹھتے ہیں، ان سے جی لگائے بیٹھے ہیں۔

(بیچ البلاء مفتی جعفر حسین - حکمت ۱۴۷)

انہوں نے ”یقین کامل“ کی روح کے ساتھ اتصال پیدا کر لیا ہے اور اس کے ساتھ یک جان ہو گئے ہیں، گویا روح یقین کے اور ان کے ذہن اب کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ وہ چیزیں کہ جاہل طرب اور مادہ پرستوں کے لیے بے حد سخت ہیں وہ ان کے لیے سہل اور نرم ہیں۔ جو چیزیں یعنی خدا کے ساتھ خلوت، ان (مادہ پرستوں) کے لیے وحشت کا موجب ہے وہ ان کے لیے مایہ انس و رفیق ہے۔

۳۲ وہ ایسے جسموں کے ساتھ دنیا میں رہتے ہیں کہ جن کی روحیں ملائحہ اعلیٰ سے وابستہ ہیں۔

(حوالہ سابق)

یہ دنیا میں لوگوں کے ہمراہ ہیں لیکن ایسی روحوں کے ساتھ کہ جن کا تعلق ایک بالاترین عالم سے ہے۔ وہ اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں نہیں — حالانکہ وہ اس دنیا میں ہیں، مگر وہ دوسری دنیا میں بھی ہیں۔ یہ ہیں علیؑ اور یہ ہیں علیؑ کے درد یعنی علیؑ کا درد عرفان،

علیؑ کا درود عبادت، علیؑ کی مناجاتیں اور.....

ایک اور مسئلہ جو بڑا ظاہر اور واضح ہے کہ عبادت میں آپؐ کا مجاہدہ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ آپؐ بے خود ہو جاتے تھے۔ آپؐ اپنے محبوب اور معشوق خدا سے لم تیرال کی یاد میں اتنے محو ہو جاتے تھے کہ آپؐ کے ارگرد خواہ کچھ بھی ہو جاتا۔۔۔ اس کی انہیں کوئی خبر نہیں ہوتی تھی، حتیٰ کہ اگر آپؐ کے بدن سے تیر بھی کھینچ لیا جائے تو آپؐ کو احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ یہ انسان کا درو ہے، یہ حق تعالیٰ سے جسدائی، اس کی ذات سے تقرب کی آرزو اور اشتیاق، اس کی جانب حرکت اور اس کے نزدیک ہونے کا درو ہے۔ کیونکہ جب تک انسان ذات حق تک نہیں پہنچ جاتا، اس کی یہ بے چینی اور یہ اضطراب زائل اور برطرف نہیں ہوتا اور اس کی یہ بے چینی اور اضطراب کی حالت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ انسان اپنے آپؐ کو اگر کسی چیز یا کسی عمل میں مشغول کر لیتا ہے تو یہ محض ایک دلی بہلاوا ہوتا ہے اور اس کی حقیقت کوئی اور چیز ہے، جسے قرآن مجید ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔

۳۳۔۔۔ جان لو کہ دل فقط ایک چیز کے ذریعے بے چینی سے سکون پاتے ہیں اور وہ اللہ کا ذکر ہے۔

(سورہ رعد- آیت ۲۸)

یعنی انسان کا یہ درد صرف ایک وسیلے سے آرام حاصل کر سکتا ہے اور وہ یاد حق میں مشغول ہونا اور پروردگار کی ذات سے اس پیدا کرنا ہے۔ پس یہ ہے انسان کے دروں میں سے ایک درد!

۹۰

عارفوں نے زیادہ تر اس ایک درد پر تکیہ کیا اور کسی دوسرے درد کی جانب توجہ نہیں دی یا بہت کم توجہ دی ہے۔  
مولوی معنوی کہتے ہیں:

حسرت و زاری کہ در بیماری است  
وقت بیماری ہمہ بیداری است  
ہر کہ او بیدار تر پیر درد تر  
ہر کہ او ہشیار تر رخ زرد تر  
پس بدان این اصل را ای اصل جو  
ہر کہ را درد است او پروہ است جو  
بیماری میں غم اور پریشانی ہے، اس لیے وہ انسان کو بیدار رکھتی ہے۔  
جو زیادہ بیدار ہے وہ زیادہ درد اٹھاتا ہے اور جو زیادہ یا خیر ہے وہ زیادہ پریشان ہے۔  
اے طالبِ حق تو اس حقیقت کو سمجھ لے کہ ایک درد آشنا ہی حق کو پاتا ہے۔

مولوی معنوی نے ایک داستانِ نقل کی ہے جو مجھے ابھی ابھی یاد آئی ہے اور اگر میں اسے بیان نہ کروں تو یہ میرے لیے افسوس کی بات ہوگی۔  
یہ ایک تشبیل ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

ایک آدمی تھا جو ہمیشہ اپنے خدا سے راز و نیاز میں رہتا اور اللہ اللہ اللہ کا ورد کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شیطان اس کے

سامنے آیا اور اسے دوسرے میں ڈال گیا۔ اس نے کچھ ایسا کام کیا کہ یہ آدمی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ہوایہ کہ شیطان اس کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے شخص! یہ جو تم اللہ — اللہ — اللہ — کرتے رہتے ہو — روزانہ صبح کے وقت جاگ اٹھتے ہو اور بڑے درد کے ساتھ اللہ کے نام کا ورد کرتے ہو تو کیا ایک بار بھی ایسا ہوا کہ تم نے لبیک کا لفظ سنا ہو؟ اگر تم کسی کے گھر گئے ہوتے اور اتنی نالہ و زاری کی ہوتی تو کم از کم ایک بار تو تمہیں جواب ملتا اور تمہاری آواز پر لبیک کہی جاتی۔ اس آدمی نے دیکھا کہ (بظاہر) بات چنے کی ہے شیطان کی یہ بات اس امر کا موجب بنی کہ اس آدمی کا منہ بند ہو گیا اور اس نے اللہ — اللہ — کرنا چھوڑ دیا۔ پھر عالم رویا میں ہاتف نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنی مناجات کیوں ترک کر دی؟

اس نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ میری اس تمام مناجات اور اس تمام درد اور سوز کے باوجود ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے جواب میں لبیک کہی گئی ہو۔

ہاتف نے کہا: لیکن میں اس کام پر مامور ہوں کہ تمہیں خدا کی طرف سے جواب دوں:

گفت ہماں اللہ تو لبیک ماست

آں نیاز و سوز و دردت بیک ماست

یعنی ہاتف نے اس شخص سے کہا کہ وہی درد و ہی سوز اور وہی شوق اور شوق جیسے تمہارے دل میں قرار دیا ہے وہ ہماری طرف سے بجائے تُو

۷-۱۰ ستمبر ۲۰۱۱ء

## فقر کا علاج

۹۲

ایک بیک ہے۔

اب غور کیجیے کہ امام علیؑ دعائے کمیل میں یہ کیوں عرض کرتے ہیں:  
اے خدا! میرے ایسے تمام گناہوں کو بخش دے۔ جو اس  
بات کا سبب بنیں کہ میں دعا کرنے سے باز رہوں، نیز وہ  
اس بات کا سبب بنیں کہ دعا اور مناجات کرنے کا درد  
مجھ سے چھین جائے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دعا انسان کے  
لیے مطلوب بھی ہے اور وسیلہ بھی ہے، یعنی دعا ہمیشہ قبول  
ہوتے کے لیے نہیں ہوتی۔ کیونکہ دعا اگر قبول نہ ہو تو بجائی  
وہ بجائے خود انسان کا مطلوب ہے۔

کچھ اور لوگ جو درد کو ایک عظیم انسانی قدر تسلیم کرتے ہیں، وہ انسان  
کے درد کے بارے میں ایک اور چیز کی جانب متوجہ ہوئے ہیں اور وہ ہے  
انسان کا درد ”خلق خدا کی نسبت سے“۔ نہ کہ انسان کا درد ”خدا  
کی نسبت سے“۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی انسانیت کا معیار یہ ہے کہ وہ  
دوسروں کے لیے درد رکھتا ہو۔ یعنی وہ تکلیفیں جن کا اس سے کوئی تعلق  
نہیں اور وہ اسے نہیں بلکہ کسی دوسرے کو پہنچ رہی ہیں، وہ اس کے  
اندرد و پیدا کریں اور بقول سعدی وہ دوسروں کا غم خوار بنا رہے:

من از بے نوائی نیم رنگ زرد  
غم بے نوائان رخم زرد کرد  
میرا رنگ تنگ دستی سے زرد نہیں ہوا، بلکہ تنگ ستون کے  
غم نے میرا چہرہ زرد کر دیا ہے۔

## سبیل سکینہ

حیدر آباد لطیف آباد، پتہ نمبر ۸-۷۱



یہ بھی ایک درد ہے۔ اور اگر انسان کے دل میں دوسروں کے لیے درد پیدا ہو جائے تو اس سے غم خواری پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اور لوگ بھوکے ہوں تو اسے نیند نہیں آتی، وہ دوسرے کے پاؤں میں کانٹا چھبا ہوا دیکھتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کانٹا خود اس کی آنکھ میں جا گڑا ہو۔ یہ درد۔ انسان کا وہ درد ہے۔ جو اس کو شخصیت اور قدر و قیمت عطا کرتا ہے اور یہی تمام انسانی قدروں کا سرچشمہ ہے۔

آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ”انسانیت“ ”انسانیت“ کی ریت لگائے رکھتے ہیں۔ وہ گفتگو کے علاوہ کسی دوسرے مقام پر انسانیت کو یاد نہیں کرتے۔ ہر دو چیز جس کی بارگشت انسان کے اس احساس ذمہ داری کی طرف ہو جو وہ دوسرے انسانوں کے لیے رکھتا ہو۔ وہ دوسرے انسانوں کے لیے انسان کا درد ہے۔ وہ لوگ اسے انسانی قدر سمجھتے ہیں، مگر اصل میں یہ بھی انسانی قدروں کا کسی ایک قدر میں کم ہونا اور مسخ ہو کر رہ جانا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے؟ اسلام اور اسلامی معیارات کے لحاظ سے ایک ایسا شخص انسان ہے جو دوسروں کا درد رکھتا ہو؟ یا وہ شخص جو فقط خدا کی محبت کا درد رکھتا ہو؟ یا وہ شخص جو خدا کی محبت کا درد رکھتا ہو اور خدا کا درد رکھنے کی وجہ سے دوسرے انسانوں کا درد بھی رکھتا ہو؟ پس تینوں میں سے اصلی درد کونسا ہے؟

اب آپ دیکھیں کہ قرآن مجید کن الفاظ میں بات کر رہا ہے، جبکہ

۹۴

رسول اکرمؐ کے بارے میں کہتا ہے:

۳۴ (اے رسولؐ!) اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو شاید تم مارے افسوس کے ان کے پیچھے اپنی جان بے ڈالو گے۔

(سورہ کہف - آیت ۶)

دنیا کی ہدایت و خوش بختی کے لیے اور انہیں دنیا و آخرت کی بدشگون اور تکلیفوں سے نجات دلانے کے لیے — پیغمبرؐ اتنے حریف ہیں کہ اس میں اپنے آپ کو مار ڈالتا اور ہلاک کر دیتا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت پڑھتی ہے کہ آخر یہ کیا بات ہے؟ آپ لوگوں کی خاطر اپنی جان کیوں ہٹانے لگے ہیں؟

۳۵ (اے طہؐ) رسولؐ! ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم اس قدر مشقت اٹھاؤ۔ مگر جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس کے لیے نصیحت ہے۔

(سورہ طہ - آیت ۳)

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

۳۶ لوگو! تم ہی میں سے ہمارا ایک رسولؐ تمہارے پاس آچکا ہے، اس پر شاق ہے کہ تم تکلیف اٹھاؤ اور اسے تمہاری بہتری کی فکر ہے۔ وہ ایمانداروں پر حسد و رجزہ شفیق ہے۔

(سورہ توبہ - آیت ۱۲۸)

دیکھیے قرآن مجید کی تعبیر کتنی لطیف ہے۔ اے لوگو خود تمہارے درمیان میں سے اور تمہاری جنس میں سے تمہارے لیے ایک پیغمبرؐ آیا ہے۔ اس کی

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ”عزیز علیہ ما عنتم“ ”عنت“ یعنی تمہاری سنگلیں، تکلیفیں اور پریشانیاں اسے ناگوار ہیں۔ کیونکہ وہ تمہارا درد رکھتا ہے۔ ہاں تو تمہارا پیغمبر وہ شخص ہے جو تمہارا درد رکھتا ہے۔ پس مسلمان بھی وہی شخص ہے جو خدا کا درد بھی رکھتا ہو۔

اب رہا یہ جملہ کہ ”وہ تم پر حریص ہے“ اس کی تشریح کچھ یوں ہے، جیسے آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض باپ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے پڑھ جائیں۔ پھر وہ ان کی پڑھائی پر بہت سا خرچ بھی کرتے ہیں اور مشقت اٹھاتے ہیں، یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس بات پر حریص ہے کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ جائے۔ گویا اس طرح باپ اپنے بیٹے کی بہتر تعلیم پر حریص ہوتا ہے اور ایک آدمی دنیا کے مال پر حریص ہوتا ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ پیغمبر لوگوں کے حریص ہیں اور لوگوں کے دکھوں اور تکلیفوں کو ان سے دور کرتے کے حریص ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ خود امام علی علیہ السلام بھی درد کی یہی تعبیر نہیں کرتے؟ جب کہ آپ کو اطلاع دی گئی کہ بصرہ میں عثمان بن حنیف نے ایک دعوت طعام میں شرکت کی ہے۔ اس دعوت میں کیا بات تھی؟ الیاذ باللہ کیا اس میں شراب پی گئی، جو اکھیل گیا یا فسق و فجور کا ارتکاب ہوا؟ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر کیا ہوا؟ اس دعوت کی برائی اور عثمان بن حنیف کی غلطی یہ تھی کہ اس میں سو فیصد اونچے طبقے کے لوگ شامل تھے۔ یعنی فقرا میں سے کوئی نہ تھا۔ چنانچہ جب امام علیؑ کو یہ اطلاع ملی کہ آپ کے مقرر کردہ حاکم اور نمائندے نے ایک ایسی دعوت میں شرکت کی ہے کہ جس میں صرف امیر لوگ

شامل تھے اور فقراء میں سے کوئی نہیں تھا۔ ہاں تو آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا فرمایا؟

آپ نے فرمایا:

۳۷؎ مجھے امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کر لو گے کہ جن کے یہاں فقیروں کا دار و دھتکا رہے گئے ہوں اور وہ تمہارا مدعو ہوں۔ (شیخ ابی داؤد سنن جعفر حسین مکتوب ۴۵)

پھر آپ اپنے دروہوں کو بیان کرنا شروع کرتے اور فرماتے ہیں:

۳۸؎ اگر میں چاہتا تو صرف صاف ستھرے شہداء و عمدہ گھوڑوں اور ریشم کے بنے ہوئے کپڑوں کے لیے ذرائع مہیا کر سکتا تھا۔ لیکن ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ خواہشیں مجھے مغلوب بنا لیں اور حرص مجھے لے چلے۔ (حوالہ سابق)

غور کیجیے کہ امام علیؑ یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اچھا لباس پہننا یا اچھی غذا کھانا حرام ہے، نہیں۔ مسئلہ یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے، ورنہ علیؑ کیوں کہتے ہیں کہ مہبات.....؟

اس کے بعد فرماتے ہیں:

۳۹؎ شاید کہ حجاز و یمامہ میں ایسے لوگ ہوں جنہیں ایک روٹی کے ملنے کی بھی آس نہ ہو اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا کبھی نصیب نہ ہوا ہو۔ کیا میں شکم سیر ہو کر سونا رہوں؟ جب کہ میرے گرد و پیش بھوکے پیٹ والے لوگ موجود ہوں۔ (حوالہ سابق)

کیا میں ایسا بن جاؤں جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:  
 ”یعنی اتنا ہی درد تیرے لیے کافی ہے کہ تو سیٹ بھر کے  
 سونا رہے اور تیرے ارد گرد بھوکے لوگ موجود ہوں۔“

(حوالہ سابق)

اسے کہتے ہیں ”خلق خدا کا درد“۔ اسے کہتے ہیں ”حسّانیت“۔  
 اور اسی کو تمام ”انسانی قدروں کی ماں“ کہتے ہیں۔ ذرا آگے بڑھیں اور  
 دیکھیں کہ کامل انسان... علی کیا کہہ رہے ہیں:  
 ”اے کیا میں اسی میں نگوں۔ ہوں کہ مجھے امیر المومنین کہا  
 جاتا ہے۔ مگر میں زمانے کی سختیوں میں ورنوں کا شریک  
 ہمدرد نہ ہوں۔“ (حوالہ سابق)

کیا میں اپنے اس لقب اور افتخار پر قناعت کر لوں؟ کیا میں اس  
 بات پر قناعت کر لوں کہ مجھے امیر المومنین کا لقب دیا جاتا ہے اور خلیفہ و  
 رئیس کہا جاتا ہے۔ لیکن زمانے کی سختیوں میں مومنوں کے ساتھ شرکت  
 نہ کروں؟ آپ دیکھیں کہ یہ تمام باتیں دوسروں کے درد کا احساس کرتے  
 کے بارے میں ہیں۔ جو درد انسان دوسروں کے لیے رکھتا ہے اس میں لذت  
 ہوتی ہے۔ دوسروں کا درد رکھنے کی اس لذت میں کیا راز ہے؟ یہ بات  
 خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اس ضمن میں بوعلی سینا نے ”اشارات“ کے آخر میں بطور مثال  
 ”بدن کی ورزش“ کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان بدن کو  
 کھیلتا ہے تو اسے درد تو ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے ایک لذت بھی

حاصل ہوتی ہے اور بدن کا کھانا اسے اچھا لگتا ہے۔ یہ درد ہے۔ لیکن ”درد تلخ“ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ دل کو جلاتا ہے اور آنسو بھی نکال لاتا ہے لیکن یہ غم اور یہ درد محبوب اور مطلوب ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان ہمیشہ رنج و غم سے دور بھاگتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اسے کہے کہ فلاں جگہ حضرت سید الشہداء کی مجلس بپا ہے، آؤ میرے ساتھ چلو کہ وہاں کچھ آنسو بہائیں، تب وہ پوری رضامندی کے ساتھ ایسی مجالس میں شریک ہوتا ہے اور آنسو بہاتا ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کا دل نہ دکھے وہ آنسو نہیں بہاتا۔ چونکہ مجلس سید الشہداء میں ان کے مصائب پر اس کا دل دگھٹتا ہے، اس لیے وہ آنسو بہاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کا جی چاہتا ہے کہ اس مجلس میں حالت غم کے ساتھ جائے، اس درد کو محسوس کرے اور پھر آنسو بہائے۔ جب آنسوؤں کے یہ قطرے ٹپکتے ہیں تو انسان ایک قسم کا اطمینان محسوس کرتا ہے۔ تاہم اس بدن کا حال تو اور بھی دشوار ہے اور یہ ایک روح سب کا درد محسوس کرتی ہے۔ اس لیے آسائش کے تمام امکانات فراہم ہونے کے باوجود وہ اس بات پر تیار ہے کہ جو کی روٹی پر گزارہ کرے۔ مبادا کہ حجاج یا پیامہ کے کوئی شخص بھوکا سو جائے۔ یہ وہ بدن ہے جسے پیوند لگے جوتے پہننے چاہئیں تاکہ وہ علیؑ کی روح کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ بقول اس شاعر کے کہ جو کہتا ہے کہ جب روح بڑی ہو جائے تو دوائے ہے اس روح کے حال پر۔ کیونکہ جب روح بڑی ہو جاتی ہے، سب بدنوں کی روح بن جاتی ہے اور سب کا درد محسوس کرتی ہے تو اس کا معاملہ بڑا سنگین ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ایک بیوہ عورت اور چند یتیم بچوں کے

حال سے غافل رہنے پر دکھی اور غمگین ہوتی ہے۔ جیسے روایت میں ہے کہ امام علیؑ ایک گلی میں تشریف لاتے ہیں اور ایک عورت کو دیکھتے ہیں جو ایک مشک کندھے پر اٹھائے ہوئے ہے۔ کیا علیؑ ایسے منظر سے آنکھیں بند کر کے گزر سکتے ہیں؟ جب آپؑ یہ منظر دیکھتے ہیں تو آپ کے دل میں درد اٹھتا ہے۔ ایسا کیوں ہو؟ کوئی وجہ نہیں کہ ایک عورت جو خود پانی بھر کر لاتی ہے، یقیناً اس کا کوئی نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو اس کی مدد نہیں کرتا۔ اب علیؑ آگے بڑھتے ہیں اور کمالِ ادب سے فرماتے ہیں:

عائون! کیا آپ مجھے اجازت دیتی ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں؟  
یا لآخر آپ اس کی مدد کرتے ہیں، اور اس کے گھر پہنچتے ہیں۔ پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ بتا سکیں گی کہ آپ خود کیوں پانی بھرتی ہیں؟  
وہ بتاتی ہے: جی ہاں! اتفاق ایسا ہوا کہ میرا شوہر علی بن ابیطالبؑ کی معیت میں مارا گیا اور اب میرا کوئی سرپرست نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ الفاظ سن کر امام علی علیہ السلام بے حد مضطرب ہوئے اور اس رات جب آپؑ گھر گئے تو رات بھر نہیں سوئے اور جب صبح ہوئی تو آپؑ خود اور آپ کے رفقاء گوشت رٹائی اور کھجوریں اٹھا کر اس عورت کے گھر پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی آپؑ نے جتنی جلدی ہو سکا — اپنے مبارک ہاتھوں کے ساتھ گوشت بھونا اور ان یتیم بچوں کو کھلایا۔ پھر آپؑ نے ان کو اپنی پر شفقت گو دیاں بٹھایا اور آہستہ سے فرمایا: علیؑ جو تم سے غافل رہا ہے اس کی تفصیر معاف کر دو۔ اس کے بعد آپؑ نے تنور جھلایا اور اس بھڑکتی آگ کے نزدیک گئے۔ جب آگ کی تپش محسوس ہوئی تو اپنے آپ سے کہا: اے علیؑ! دنیا کی اس



آگ کی تپش کا مزا چکھو اور دوزخ کی آگ کو یاد کرو، تاکہ تم عام لوگوں، یتیموں اور  
بیکسوں کے حال سے غافل نہ رہو۔

اے پروردگار! ہم تجھے امام علی علیہ السلام کے حق کی قسم دیتے ہیں کہ  
ہمارے دل میں اسلام کا درد پیدا کر دے۔ اے خدا! ہمارے دلوں میں اپنی  
محبت، اطاعت اور عبادت کا درد رکھ دے۔ ہمارے اندر اپنی مخلوق کے لیے  
ہمدردی کا احساس پیدا فرما دے۔ اے رب کریم! تو ہمیں امام علی علیہ السلام  
کی ولایت کے نور کے شمع ہیں داخل فرما اور ان بزرگوار کا حقیقی پیرو بنا۔ اے الہی!  
دلوں کو نور ایمان سے منور کر دے اور ہمارا انجام اچھا ہو۔ آمین!

jabir.abbas@yahoo.com

## چوتھی نشست

# خود شناسی، خدا شناسی کی تمہید ہے

۵۲ اور کرطے وقت صبر اور نماز کا سہارا پکڑو اور البتہ  
نماز دو بھر تو ہے مگر فرمانبرداروں پر نہیں۔

(سورۃ بقرہ - آیت ۴۵)

ہمیشہ سے خود انسان ہی اپنے لیے معنویت کا دروازہ ہے۔ یہ ایک ایسا  
درازہ ہے جس سے انسان معنویت کی دنیا میں وارد ہوتا ہے یا کم از کم معنویت  
کی غیر حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ قدیم و جدید سب علماء علم النفس نے کہا ہے۔

امیر المومنین مولیٰ الموحدین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں :  
”اے جو شخص اپنی ہستی کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے پروردگار کو پہچان لیتا ہے۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا تیتیں

معلوم اب ہوا کہ بہت ہیں دور تھا

قرآن مجید نے اہولی طور پر انسان کے لیے دنیا کی تمام چیزوں کے مقابلے

میں ایک الگ باب کھولا ہے، کیونکہ انسان ایک الگ اور مستقل خاصیت رکھتا ہے۔

قرآن مجید کی یہ تعبیر ملاحظہ کریں کہ وہ کہتا ہے:  
 ۴۴ غفریب ہم اپنی نشانیاں اطراف میں اور خود ان کے  
 نفسوں میں بھی دکھا دیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو  
 جائے گا۔ وہی یقیناً حق ہے۔ کیا تمہارا پروردگار اس کے لیے  
 کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر قیام رکھتا ہے۔

(سورہ حم سجدہ ۵-آیت ۵۳)

ہم اپنی نشانیاں آفاق میں یعنی طبعی دنیا میں اور خود لوگوں کے نفوس  
 میں دکھاتے ہیں۔ اس بات کو قرآن مجید نے ایک الگ اسلوب اور ایک الگ  
 انداز سے بیان کیا ہے۔ یہی آیت اس امر کا موجب بنتی کہ ہمارے  
 ادبیات میں ”آفاق“ اور ”انفس“ کی مخصوص اصطلاحیں موجود ہیں  
 آیتیں جن کے تحت ”آفاقی مسائل“ اور ”انفسی مسائل“ کا ذکر کیا  
 جاتا ہے۔ اب ممکن ہے کہ آپ یہ پوچھیں کہ انسان اور انسان کے نفس میں  
 وہ کونسی چیز یا چیزیں موجود ہیں جن کی توجیہ مادی قوانین میں نہیں ہو سکتی؟  
 یہ ایک طویل داستان ہے اور بالفعل ہم اسے بیان نہیں کرنا چاہتے۔

جو چیزیں مادی قوانین سے مطابقت نہیں رکھتیں ان میں سے ایک  
 انسانی قدروں کا مسئلہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ انسان کی انسانیت کا  
 مسئلہ ہے اور یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آپ  
 جس موجود کو بھی لیں آپ کو پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک صفت کے طور پر خود

۱۰۴

اپنے آپ سے الگ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہم چیتے کے لیے چیتا پن کی صفت کا کہتے  
 کے لیے کتا پن کی صفت کا اور گھوڑے کے لیے گھوڑا پن کی صفت کا ذکر کرتے  
 ہیں۔ چنانچہ ہمیں کوئی ایسا چیتا نہیں مل سکتا جس میں چیتا پن نہ ہو، کوئی ایسا کتا  
 نہیں مل سکتا جس میں کتا پن نہ ہو اور کوئی ایسا گھوڑا نہیں مل سکتا جس میں گھوڑا پن  
 نہ ہو لیکن یہ انسان ہے کہ ممکن ہے وہ ایک انسان ہو جس میں انسانیت نہ ہو۔  
 کیونکہ جن چیزوں کو ہم انسان کی انسانیت سمجھتے ہیں اور جو چیزیں انسان کو  
 انسانیت عطا کرتی ہیں کہ وہ حیوانوں سے جو کسی شخص کا معیار ہیں بلکہ  
 وہ حیوانوں سے جو کسی شخص کا معیار ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان چیزوں  
 کا ایک حصہ ہے جو انسان کے مادی ڈھانچے سے تیار نہیں  
 ہوتیں، کیونکہ یہ غیر مادی ہیں اور نہ محسوس ہوتی ہیں اور نہ چھوئی جاسکتی ہیں۔  
 اگرچہ وہ انسانی ہیں، بشری ہیں اور اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں مگر اس کے  
 باوجود نہ تو انسان انہیں محسوس کر سکتا ہے اور نہ ہی چھوس سکتا ہے۔ دوسرے  
 نقطوں میں وہ مادیات کے زمرے میں نہیں بلکہ معنویات کے زمرے میں آتی ہیں۔  
 دوسری بات یہ ہے کہ وہ چیزیں جو انسان کی انسانیت کا معیار ہیں  
 انسان کو شخصیت اور فضیلت بخشتی ہیں اور انسان کی انسانی فضیلت کا پیمانہ  
 ہیں۔ وہ فطرت کے ہاتھوں یا کسی کے ہاتھوں بھی نہیں بنتیں۔ وہ صرف  
 اور صرف خود انسان کے ہاتھوں بنتی ہیں۔ المختصر انسان خود معنویت کا  
 دروازہ ہے اور خود اپنے وجود کے دروازے سے عالم معنی تک پہنچا ہے۔  
 اٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے :  
 ۱۰۴ جو کچھ وہاں ہے اسے پہچانا نہیں جاسکتا۔ مگر

اس کے ذریعے سے جو کچھ یہاں ہے، جب کہ یہ بجائے خود ایک  
مسئلہ ہے....

وہ چیزیں جنہیں انسانی قدریں کہا جاتا ہے اور جو انسان کی معنویت  
اور انسانیت کا معیار ہیں۔ وہ بہت سی ہیں لیکن ان تمام قدروں کو ایک  
قدر میں سمویا جاسکتا ہے اور وہ قدر ”درد رکھنا“ اور ”صاحبِ درد“  
ہونا ہے۔

ہر وہ کلمہ جس نے دنیا میں انسانی قدروں کے بارے میں بحث کی  
ہے، اس نے اس حقیقت کی جانب توجہ دی اور انسان میں ایک درد کا تعین  
کیا ہے جو مختلف انسانی دردوں یا سرجائز ارجیوں کے دروں سے ماورا ہے۔  
وہ درد کیا ہے؟ انسان کا وہ انسانی درد کیا ہے؟ جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں  
کہ بعض لوگوں نے فقط اس دنیا میں انسان کی غریب الوطی اور اس دنیا کے  
ساتھ اس کے عدم تجانس اور بیگانگی کے درد پر تکیہ کیا ہے، اس نظریے کے  
مطابق انسان ایک ایسا حقیقی موجود ہے جو کسی اور دنیا سے ایک خاص فرض  
ادا کرنے آیا اور اپنے اصل سے جدا اور دور ہو گیا ہے۔ اپنی اصل سے اس  
دور سے اس کے اندر فوق پیدا کیا ہے، عشق پیدا کیا ہے، نالہ پیدا کیا  
ہے اور غریب الوطنی کا احساس پیدا کیا ہے۔ پھر اس غریب الوطنی کے  
احساس نے اس کے باطن میں اصل کی جانب واپسی اور اپنے وطن —  
حق — یعنی خدا کی جانب واپسی کی خواہش پیدا کی ہے۔ گویا وہ ایک بہشت  
سے نکالا گیا اور زمین پر آیا ہے، اس لیے چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر اس  
بہشت کی جانب لوٹ جائے، جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا

اتنا بے مقصد اور فضول نہیں بلکہ ایک کارِ خاص کیلئے بھیجا گیا ہے۔ بہر حال اپنی اصل سے اس جدائی نے اسے ہمیشہ بے چین اور بے قرار رکھا ہے۔

اس مکتب فکر کے مطابق انسان کا درد فقط خدا سے دوری کا درد، حق سے دوری کا درد اور حق کے قرب اور رب العالمین کی قربت کی جانب لوٹ جانے کی خواہش ہے۔ چنانچہ ہر انسان خواہ وہ کسی مقام، کسی کمال یا کسی نقطے تک بھی پہنچ جائے۔۔۔ پھر بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے معشوق تک نہیں پہنچا۔

کہا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ اس چیز کا طالب ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی اور جب تک وہ چیز اسے میسر نہ ہو اسے اس کی خواہش ہوتی ہے، لیکن جب وہ چیز اسے مل جائے تو اسے اس کی خواہش نہ رہے اور وہ اسے رد کر دے۔

ایک شخص کا کہنا ہے کہ میں ایک غیر ملکی عجائب گھر میں لانا اور دیکھنے میں مشغول تھا۔ وہاں میں نے ایک بہت ہی خوبصورت عورت کا مجسمہ دیکھا جو ایک تخت پر لیٹی ہوئی تھی۔ نہ میں نے اسی تخت پر ایک بے حد خوبصورت جوان مرد کا ایک مجسمہ بھی دیکھا لیکن اس حالت میں کہ اس کا ایک پاؤں تخت پر اور دوسرا پاؤں زمین پر تھا۔ اس نے پہلے مجھے کی طرف سے اپنا منہ بھی پھیر رکھا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں سے بھاگ رہا ہو۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر میں بہتہ سمجھ سکا کہ سنگ تراش نے اس جوان مرد اور جوان عورت کے جیسے حالت، ملاقات کی بجائے حالت فرار میں کیوں ترستے ہیں؟ وہ اشخاص جو اس بارے میں کچھ جانتے تھے، میں نے ان سے وضاحت چاہی کہ

یہ مجھے تراشنے میں مجھہ ساز کا کیا مقصد تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان مجسموں کے ذریعے افلاطون کے مشہور نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان جس چیز کو چاہتا ہے شروع میں بڑے زبردست جذبے، متدبیر عشق اور بہجدا شہابیہ کے ساتھ اسکی جانب جاتا ہے لیکن جب وہ اسے پالیتا ہے تو اسکا عشق وہیں دب جاتا ہے، کیونکہ وصال عشق کا مدفن ہے۔ وصال کے بعد جب انسان کا دل بھر جاتا ہے تو ہمیں سے نفرت و فرار کا آغاز ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک غیر فطری بات ہے اور جن لوگوں نے اس مسئلے پر گہرا غور و فکر کیا ہے انہوں نے اسے حل کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسا مودد ہے جو کسی محدود و ثانی شے کا عاشق نہیں ہو سکتا، وہ کسی ایسی چیز کا عاشق نہیں ہو سکتا جو زمان و مکان میں محدود ہو۔ وہ کمال مطلق کا عاشق ہے اور اسکے علاوہ کسی دوسری چیز کا عاشق نہیں۔ یعنی انسان ذات حق کا عاشق ہے، خدا کا عاشق ہے۔ جو شخص خدا کا منکر ہے وہ بھی خدا کا عاشق ہے۔ جتنی کہ وہ منکر ہو خدا کو ناسزا کہتے ہیں، اس کے بارے میں غلط گوئی کرتے ہیں اور مبدار کے قائل نہیں ہیں، وہ نہیں جانتے کہ وہ اپنی فطرت کی نگرانی میں کمال مطلق کے عاشق ہیں۔ لیکن وہ اس کمال مطلق اور معشوق حقیقی کو کم کر بیٹھے ہیں۔

حی الدین عربی کا قول ہے: ”مَا أَحَبَّ أَحَدًا غَيْرَ خَالِقِهِ“

کسی انسان نے اپنے خدا کے علاوہ کسی کو دوست نہیں رکھا اور دنیا میں اب تک ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جس نے خدا کے علاوہ کسی اور کو دوست رکھا ہو لیکن خدائے تعالیٰ ان ظاہری ناموں کے پیچھے چھپ گیا اور مجنوں سمجھتا ہے کہ وہ بیل کا عاشق ہے، کیونکہ وہ اپنی فطرت اور وجدان



کی گिरانی سے بے خبر ہے۔

پیغمبر اس لیے نہیں آئے کہ وہ بندوں کو خدا کے نام سے آشنا کریں اور اس کی عبادت کرنا سکھائیں۔ کیونکہ یہ چیز تو ہر انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے، بلکہ اس لیے آئے ہیں کہ ٹیڑھے راستوں کو سیدھے راستے سے الگ کر دکھائیں، اس لیے آپ کو محنوں سے کہنا چاہیے کہ جناب! آپ نے ”کمال مطلق“ کی پہچان میں غلطی کھائی ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی ”کمال مطلق“ ہے۔ اسی طرح آپ ایک وقت خیال کرتے ہیں کہ مقام و عمدہ کمال مطلق ہے اور ایک وقت آپ خیال کرتے ہیں کہ زندگی کمال مطلق ہے، گو آپ کمال مطلق کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتے۔ درحقیقت آپ غلطی کھاتے ہیں اور نوع البشر کے رہنما اس لیے آئے ہیں کہ وہ انہیں غلط فہمیوں سے نجات دلائیں۔

انسان کا درد اور انسان کا شوق وہ خدائی درد ہے کہ اگر وہ اسے پہچان جائے، یعنی اگر غلط فہمیوں کے پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں اور اس کا معشوق اسے مل جائے تو وہ ویسی ہی عاشقانہ عبادتیں کرنے لگے۔ جیسی عبادتوں کی مثال ہم امام علی علیہ السلام میں دیکھتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کہتا ہے:

۱؎ جان لو کہ فقط اور فقط ایک چیز سے دلوں کو سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ انسان اضطراب و بے چینی سے نجات حاصل کر سکتا ہے اور وہ ہے۔۔۔ اپنے خدا کے ساتھ راؤ و نیا کرنا، اس کا ذکر کرنا۔

ہاں قرآن مجید کہتا ہے اگر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان مفروضوں نظریوں یا مثلاً دولت کے ساتھ کامیاب ہو سکتے ہیں اور تمام لوگوں کا بھلا ہو سکتا ہے۔۔۔ یوں ہو سکتا ہے، وہ ہو سکتا ہے۔ یعنی انسان مال کی بدولت بے قراری، بے چینی اور مایوسی سے نجات پا کر آسائش حاصل کر سکتا ہے۔ تو یہ ان کی بھول ہے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ:

ان لوگوں کے صحیحے نہیں چلنا چاہیے تاہم ان لوگوں کی بات پر غور کرنا چاہیے لیکن اگر آپ یہ خیال کریں کہ یہی لوگ ہیں جو انسان کو آسائش اور اطمینان دلا سکتے ہیں اور انسان یہ چیزیں حاصل کر کے محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنا مطلوبہ کمال پایا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ صرف خدا کو یاد کرنے سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ کئی ایک مکاتب فکر ایسے ہیں جو فقط اسی بات پر تکیہ کرتے ہیں۔ کچھ دوسرے مکاتب ہیں جو مخلوق خدا کا درود احساس رکھنے پر زور دیتے ہیں نہ اس بات پر کہ انسانوں کا درود رکھا جائے خدا کی خاطر حتیٰ کہ بعض لوگ کہتے ہیں جناب خدا کی خاطر انسانوں کا درود رکھنے کے کیا معنی ہیں؟

اگر انسان خدا کی طرف توجہ نہ کرے تو خلق خدا کیلئے اسکا جذبہ ہمدردی بھی بے نتیجہ رہے گا کیونکہ ”انسانیت“ کی حقیقت خدا تک پہنچنے کا درود ہے اور خدا تک پہنچنے کی فکر سے انسانوں کا درود یعنی انسانوں کیلئے جذبہ ہمدردی پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ کامل انسان کی سیر کا تعین کرتے ہوئے عرفائے بڑی عمدہ بات کہی

ہے، وہ کہتے ہیں:

کامل انسان کی سیر چار سفروں میں پوری ہوتی ہے:

- ① انسان کا سفر اپنے آپ سے خدا کی جانب اور جب وہ یہاں پہنچتا ہے تو
- ② انسان کا سفر قرب خدا کے ساتھ خدا میں (یعنی خدا کی پہچان کیلئے)۔
- ③ انسان کا سفر قرب خدا کے ساتھ نہ تنہا خلق خدا کی جانب۔
- ④ انسان کا سفر قرب خدا کے ساتھ خلق خدا کے درمیان (خلق خدا کی نجات کی خاطر)۔

اس ضمن میں اس سے بہتر بات نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن یہ باتیں اس وقت تک غلط ہیں جب تک انسان خدا سے جدا ہے، کیونکہ وہ اس کی جانب سفر نہیں کر سکتا۔ تاہم جب وہ وہاں (خدا کے ذکر تک) پہنچتا ہے، خدا کو پہچان لیتا ہے۔ جب اسے قرب خدا حاصل ہوتا ہے تو وہ خدا کو اپنے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ حق خدا کی جانب لوٹتا ہے اور اسکی نگاہوں میں خدا کا جلوہ ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسا انسان ربانی انسان بن جاتا ہے اور وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی خدا سے غافل نہیں رہتا۔ جب ایسا انسان خلق خدا کے درمیان تحریک چلاتا ہے تو یہ تحریک خلق خدا کی نجات کیلئے، خلق خدا کو بیدار کرنے کیلئے اور خلق خدا کو خدا کے نزدیک لانے کیلئے ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ انسان کا سفر خلق سے خدا کی طرف ہے تو وہ یہیں کا یہیں رہ جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انسان خود خدا کی جانب حرکت کیلئے بغیر ماورائے مکتب کی طرح انسانوں کی نجات کی خاطر انسانوں کی طرف جاتا چاہتا

ہے تو یہ بھی ایک غلط بات ہے اور وہ کچھ نہیں کہہ پاتا۔ کیونکہ انسان کو وہ لوگ نجات دلا سکتے ہیں جنہوں نے پہلے خود نجات حاصل کر لی ہو۔

## انسان کو کس چیز سے نجات چاہیے؟

انسان کی نجات کے کیا معنی ہیں؟ کس چیز سے انسانوں کی نجات؟ کیا یہ انسانوں کی دوسرے انسانوں کی اسیری سے نجات ہے کہ جس کے معنی انسان کی انسان سے آزادی کے ہیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ یہ انسان کی اپنے آپ سے اپنے نفس امارہ سے اور اپنے محدود وجود سے نجات ہے۔ جب تک انسان اپنے محدود وجود سے نجات حاصل نہ کرے وہ فطرت کی اسیری سے بہ گزر رہا نہیں ہوتا اور دوسرے انسانوں کی اسیری سے بھی نجات نہیں پاتا۔

ابھی ہم پہلی منزل پر ہیں اور ہمیں چاہیے کہ اپنے سیر و سلوک کو جاری رکھیں۔ یہ رات ماہ رمضان کی اکیسویں اور آخری دہائی کی پہلی رات ہے۔ جب ماہ رمضان کی آخری دہائی آتی تھی تو رسول اللہ ﷺ دیتے تھے کہ آپ کا بستر نکلیں، طور پر پرتھ دیا جائے اور کچھ ماہ شوال ان کھولا جائے یعنی آنحضرتؐ ماہ رمضان کی آخری دہائی میں کسی رات نہیں سوتے تھے اس لیے آخری دہائی کی یہ رات عبادت، خلوت اور مناجات کی رات ہے۔

اب میں جو بات کہہ رہا ہوں یہ میرے گزشتہ راتوں کے بیان کے ضمن میں ہے۔ یعنی بعض اوقات کچھ حد سے بڑھی ہوئی قدریں آتی ہیں جو دوسری قدروں کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

چنانچہ گزشتہ زمانے میں اسلامی معاشرے نے عبادت کی قدر کی طرف

سبیل سکینہ

محمد راضی اللہ عنہ، ایم ایف، ایم بی، ایم سی

اتنا میلان پیدا کر لیا کہ وہ دوسری قدروں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب ایک اور افراطی قدر نموداری کی حالت میں ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اسلام کے اجتماعی میلانات کی جانب توجہ دیں اور اس کے خدائی میلانات کو فراموش کر دیں۔ گویا کہ وہ لوگ ایک اور انحراف اور غلطی کے مرکب ہونا چاہتے ہیں ان کا یہ فعل اس عرب کی مانند ہے جو ایک گدھے پر سوار ہونا چاہتا تھا۔ وہ بڑے زور شور سے آیا اور گدھے کے اوپر سے اچھل کر دوسری طرف زمین پر جا گرا اور کہنے لگا:

”پہلے کی طرح ہو گیا“۔ یعنی میں زمین کا زمین ہی پر رہ گیا۔ پس اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم اسلام کا اعتدال راستہ چھوڑ دیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم ”معاشرے سے گریز کر کے عبادت کی طرف مائل ہوں“ یا ”خدا سے گریز کر کے معاشرے کی طرف مائل ہوں“ کیونکہ اسلام کی منطق کے مطابق ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ قرآن کو دیکھیں اور اس کے نکات کی جانب توجہ دیں۔ یہ شب بیداری اور عبادت کی شب ہے۔

آپ قرآن مجید کا ارشاد ملاحظہ کیجیے:

”محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں، تو ان کو دیکھو گا کہ خدا کے سامنے جھکے سجدے میں پڑے ہیں، خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طے لگا رہیں، کثرت سجدے سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف تورات

میں اور انجیل میں مذکور ہیں۔ وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے پہلے سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، وہ موٹی ہوئی، اپنی جڑ پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور اپنی تازگی سے کسانوں کو خوش کرنے لگی۔ تاکہ ان کی خوشی پر کافروں کا جی جلانے جو لوگ ایمان لائے اور ان میں سے جنہوں نے اچھے کام کیے خدا نے ان سے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

(سورۃ فتح - آیت ۲۹)

اس آیت کی تفسیر میں آپ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس میں فقط اصحاب ہی مقصود ہیں یا ان کے ساتھ خود رسول اکرم بھی مراد ہیں؟ یہ ایک ایسی بحث ہے جس کا ہمارے کسی دعویٰ پر کوئی غلط اثر نہیں پڑتا۔ ہاں تو رسول اکرم کے صحابہ اور آپ سے تربیت یافتہ اشخاص کیسے ہیں؟ قرآن مجید اس بات کو بیان کرتا اور تشریح فرماتا ہے کہ وہ حق اور حقیقت کے دشمنوں کے مقابلے میں ایک سببہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار کی مانند ہیں جو اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ یہاں قرآن کفار کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو حقیقت کے چہرے کو چھپانا چاہتا ہے۔ پس ہمیں صریح حقیقت کے دشمنوں کے مقابلے میں مضبوط اور محکم ہونا چاہیے۔

۱۱۳ قرآن کہتا ہے:

خدا تو ان لوگوں سے الفت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح پر اباندھ کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ سببہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (سورۃ صف - آیت ۲)

لیکن معاشرے میں اور ان لوگوں کے درمیان جو اہل ایمان و حقیقت ہیں ان کی کیفیت کیا ہے؟ یہاں انسان کو محبت، مہربانی، یگانگت اور وحدت کا پیکر ہونا چاہیے۔ یہ ہے اسلامی معاشرے کی اجتماعی خصلت اور یہ وہی خصلت ہے جسے ہم نے صدیوں فراموش کیے رکھا ہے۔

اس کے بعد قرآن یہ کہتا ہے،

تو ان کو دیکھئے گا کہ خدا کے سامنے جھکے سجدے میں پڑے ہیں،  
خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں، کثرت  
سجود سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوئے ہیں۔

(سورۃ فتح - آیت ۱۹)

پھر فوراً اس خدائی قدر کی جانب جاتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو معاشرے کی جانب میلان کے نقطہ نگاہ سے بلند مقام پر ہیں اور پھر اپنے خدا سے ترقی اور فرخی طلب کرتے ہیں۔ اب جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرتے اور دن بدن آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے خدا کی رضا کے طالب ہیں اور یہ عبادت کی بلند ترین قسم ہے۔ وہ اپنی تمام عبادتوں کے صلے میں خدا کی رضا کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتے۔

۱۹ کثرت سجود سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوئے ہیں،

ان کے یہی اوصاف توریت میں اور انجیل میں مذکور ہیں۔

وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے پہلے سوئی نکالی۔

(سورۃ فتح - آیت ۲۹)

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید اسلامی معاشرے کے بارے میں ایک مثل



کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ پھیلنے پھولنے والا معاشرہ ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت کا حکم رکھتا ہے جو شروع ہی سے بڑھنے لگتی ہے اور یوں بڑھتی ہے کہ سب کسانوں کو حیران کر دیتی ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ ان باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کس طرح لایا گیا ہے، جبکہ قرآن اس ملت کے خدائی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

۵۰۔ یہ لوگ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد و ثنا کرنے والے، خدا کے لیے سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کام کا حکم دینے والے، برے کام سے روکنے والے اور اللہ کی حمدوں کی تلک بانی کرنے والے ہیں اور ان مومنین کو خوشخبری دے دو۔

(سورہ توبہ - آیت ۱۱۲)

قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ توبہ کرنے والے، استغفار کرتے ہوئے، عبادت کرنے والے اور روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے ہیں۔ اس کے فوراً بعد فرماتا ہے:

وہی جو اپنے معاشرے کی اصلاح کرنے والے ہیں اور اپنے معاشرے میں اچھائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ ایک اور جگہ قرآن یہ کہتا ہے:

۱۱۵۔ وہ صبر کرتے والے ثابت قدم رہنے والے، سچ بولنے

لہ قرآن میں لفظ صبر ہمیشہ ثابت قدمی اور بالخصوص میدان جنگ میں ثابت قدمی کے معنوں میں آتا ہے۔

ولے، خوش کردار، خیرات کرنے والے اور علی الصبح استغفار

کرنے والے ہیں۔ (سورہ آل عمران - آیت ۱۷)

اس آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: یعنی وہ اپنی بھول چوک غلط فہمی اور گناہ کی بخشش کے لیے منہ اندھیرے اپنے خالق کے حضور گڑ گڑاتے ہیں۔ یہ میلانات اسلام میں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک سے بے توجہی کرتا ہے، گویا وہ دوسرے سے بھی بے توجہی کرتا ہے۔ حضرت حبیب عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے اصحاب کے اوصاف میں ایک عجیب ہے جو میں نے فقط ایک حدیث میں نہیں بلکہ متعدد احادیث میں دیکھی ہے اور وہ ہے:

”اٹھ دہ رات کے وقت راہب اور دن کو شیر ہوتے ہیں۔ اگر آپ رات کو ان سے ملنے جائیں تو گویا آپ ایک راہب سے ملنے گئے اور اگر آپ دن میں ان سے ملنے جائیں تو وہ شیر معلوم ہوں گے۔“ (سفینۃ البحار - مادہ صحب)

اب آپ رسول اکرمؐ کے اصحاب کو دیکھیں کہ وہ کس وضع اور کس حالت

میں ہیں؟

یہ مشہور حدیث اصول کافی میں ہے جسے شیعہ و سنی — دونوں ہی نے نقل کیا ہے اور مولوی معنوی نے بھی اس کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ یعنی ایک دن رسول اکرمؐ اصحاب صفہ کے پاس گئے اور اکثر اصحاب صفہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ اس دن آپؐ وہاں طلوع آفتاب سے پہلے پہنچے جبکہ اندھیرا چھٹ رہا اور جالا پھیل رہا تھا۔ دریں اثنا آنحضرتؐ کی نگاہ ایک

ایک جوان پر پڑی جس کی حالت کچھ غیر معمولی سی تھی اور وہ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں دھنس گئی ہیں، رنگ زرد ہو گیا ہے اور وہ ایک عام شخص نہیں بلکہ غیر معمولی وضع رکھتا ہے۔ تب آپ نے فرمایا: ۳۵ یعنی آنحضرتؐ نے پوچھا: تم نے صبح کیسے کی؟ اس نے جواب دیا: میں نے اس حالت میں صبح کی ہے کہ اہل یقین میں سے ہوں۔

یعنی جو بات آپ نے اپنی زبان کے ذریعے سے ہمارے کانوں میں ڈالی ہے میں اسے اپنی بصیرت کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ رسول اکرمؐ نے اس جوان سے اس بارے میں مزید کہہ کر نا ضروری سمجھا اور فرمایا:

۳۵ یعنی ہر چیز کی علامت ہوتی ہے اور تم جواہل یقین ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو تمہارے یقین کی علامت کیا ہے؟ اس نے عرض کیا: ۳۵ یا رسول اللہ! میرے یقین کی علامت یہ ہے کہ وہ دن کہ مجھے پیسا سا رکھتا ہے اور رات کو جگائے رکھتا ہے۔

(اصول کافی جلد ۲۔ باب حقیقت ایمان و یقین)  
یعنی میرے یقین کی علامت دن کو روزہ رکھنا اور رات کو عبادت کے لیے جاگتے رہنا ہے۔ میرا یقین مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں سر بستر پر رکھوں اور ایک دن بھی بغیر روزے کے رہوں۔  
آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ چیزیں یقین کی کافی علامت ہیں، اس سے آگے بھی کچھ بتاؤ۔ میں تمہارے اندر اس سے بڑھ کر بھی کوئی علامت چاہتا

ہوں۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس وقت جب کہ میں اس دنیا میں ہوں تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ میں اس دنیا کو دیکھ رہا ہوں اور وہاں کی آوازیں سن رہا ہوں۔ چونکہ اس وقت جنت اور جہنم مخلوق اور موجود ہیں۔ میں اس وقت اہل جنت اور جہنم کی آوازیں سن رہا ہوں۔ یا رسول اللہ! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کے اصحاب میں سے ایک ایک کے بارے میں بتا دوں کہ ان میں سے کون کون جنتی اور کون کون جہنمی ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں۔ ناموشی اختیار کرو۔ مولوی معنوی اپنی مثنوی میں کہتے ہیں:

گفت پیغمبر صبحی زید را  
کیف اصبحت امی رنسیق باصفا  
گفت عبداً موقناً باز اوش گفت  
کو نشان از باغ ایمان گر شکفت  
گفت تشنه بودہ ام من روز ہا  
شب نخطم من ز عشق و سوز ہا  
کہ بگویم یا فرد بدم نفس  
لب گزیدش مصطفیٰ یعنی کہ بس

ایک صبح کو پیغمبر اکرمؐ نے زید سے فرمایا کہ اے نیک دل ساتھی تو نے آج دن کا آغاز کیسے کیا؟

اس نے کہا کہ میری صبح ایک بایقین شخص کی سی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تیرے باغ ایمان و یقین کی تازگی کی علامت کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں دن کو

روزے میں پیاسا ہوتا ہوں اور رات کو محبت الہی میں جا گتا ہوں۔ اب فرمائیے کہ اپنا مشاہدہ بیان کر دوں یا چپ رہوں؟  
 حضور اکرم ﷺ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یعنی فرمایا کہ بس —  
 خاموش! (مشنوی مولانا روم صفحہ ۹۶)  
 پھر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اے جوان! تمہاری خواہش کیا ہے؟ تم کیا آرزو رکھتے ہو؟

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! شہادتِ ابراہیمؑ کی راہ میں شہادت! یہ بھتی اس کی عبادت اور یہ بھتی اس کی آرزو۔ وہ تھیں اس کی راتیں اور یہ بھتی اس کے دن اور۔۔۔ اس کی آرزو یہاں — اسلام پر ایمان لانے والا ایسا ہوتا ہے اور اسلام کا — انسان — ایسا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ شخص جو دونوں درو رکھتا ہے، لیکن یہ دوسرا درو وہ اس پہلے درو سے بیٹا ہے۔ یعنی وہ پہلا اس کا خدائی درو ہے جس نے اس میں یہ دوسرا درو پیدا کیا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے :

۵۶ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو نماز سے مدد چاہو اور صبر سے مدد حاصل کرو۔ بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (سورۃ بقرہ - آیت ۱۵۳)

وہ کونسی مدد ہے جو ہم روزے سے لے سکتے ہیں؟ وہ کونسی مدد ہے جو ہم خدا پرستی سے لے سکتے ہیں؟ وہ کونسی مدد ہے جو ہم خدا کی عبادت سے لے سکتے ہیں؟

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ معاشرے میں ایک حقیقی اور قوی مسلمان ہوں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایک طاقتور مجاہد ہوں تو آپ کو ایک خالص اور مخلص نمازی بننا چاہیے۔

دیکھئے میں آتا ہوں کہ بعض لوگ نماز کی تحقیر کرتے اور کہتے ہیں: نماز پڑھنے کا کیا فائدہ ہے اور عبادت کیوں کی جائے؟ یہ تو بڑی غور توں کا کام ہے اور انسان کو تو اجتماعیت پسند ہونا چاہیے۔ ہاں ————— یہ روشن خیالی تو ہے لیکن بہ عین خطاب جیسی روشن خیالی ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ انہوں نے اذان میں ہے ————— سُبْحًا عَلَى خَيْرِ الْعَمَلِ کا جملہ نکال دیا تھا، یوں؟ ایک قسم کی روشن خیالی ————— لیکن ایک بڑی غلطی کے باعث! ان کے عہد حکومت میں اسلامی فتوحات اور اسلامی جہاد کا بڑا جوش تھا۔ مسلمانوں کے لشکر پر لشکر دشمن سے لڑنے کے لیے جاتے تھے۔ وہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود بھی اپنے سے طاقتور دشمن کو شکست دیتے تھے۔ اس وقت کے مسلمان جو دروغظیم سلطنتوں سے لڑ رہے تھے، ان کی تعداد ہجاس یا ساٹھ ہزار سے زیادہ تھی۔ جب کہ یہ سلطنتیں کئی لاکھ سپاہیوں کو لے کر جنگ کے لیے آتی تھیں، لیکن مسلمان انہیں نیچا دکھا دیتے تھے۔ روم کئی لاکھ سپاہی لے کر ان سے لڑنے آیا ————— ایران بھی کئی لاکھ سپاہی لے کر ان سے لڑنے آیا، جب کہ یہ ایک لاکھ سے بھی کم ہوتے ہوئے دونوں محاذوں پر لڑ رہے تھے اور دشمنوں کو شکست دے رہے تھے۔ بہت خوب اس طرح جہاد نے اپنی قدرو قیمت ثابت کر دی اور بتا دیا کہ جب اسلام مجاہدوں کی تربیت کرتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب عمر بن خطابؓ نے کہا کہ مصلحت اس میں ہے کہ ہم ”حی علی خیر العمل“ کو اذان سے نکال دیں۔ اذان میں مؤذن بلند آواز سے کہتا ہے ”اللہ اکبر، اللہ اکبر“ پھر وہ شہادتین پڑھتا ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے ”حی علی الصلوٰۃ“، ”حی علی الصلوٰۃ یعنی نماز کی طرف آؤ، نماز کی طرف آؤ۔ وہ یہاں تک جو جملے ادا کرتا ہے ان میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: ”حی علی الفلاح، حی علی الفلاح یعنی نجات کی طرف آؤ، نجات کی طرف آؤ۔“ کیونکہ نماز و ریعہ نجات ہے۔ عمر بن خطابؓ نے کہا کہ یہاں تک بھی ہمارے لیے کوئی خرابی کی بات نہیں ہے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ ”حی علی خیر العمل“ یعنی بہترین عمل کی طرف آؤ، کیونکہ نماز بہترین عمل ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے تو یہ مجاہدین کے اعتماد و نفس کو ٹھیکس پہنچانے والی بات ہے۔ وہ سوچیں گے کہ اب ہم جا کر نماز پڑھیں یا جہاد کے لیے جائیں۔ چونکہ نماز بہترین عمل ہے، اس لیے کیوں نہ ہم میدان جنگ میں جانے کی بجائے مدینے ہی میں رہیں اور مسجد نبویؐ میں رسول اکرمؐ کے مقبرے کے قرب میں نماز پڑھیں کہ جو بہترین اعمال میں سے ہے۔ اگر کچھ دوسرے لوگ جنگ پر جاتے ہیں تو جائیں۔ ان کو زخم لگیں اور ان کی آنکھیں پھوڑی جائیں۔ ان کے ہاتھ کاٹے جائیں اور ان کے پیٹ پھاڑے جائیں۔ وہ جا کر دشمن کو قتل کریں اور ہوتے رہیں۔ ہم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے اپنے گھروں میں رہیں گے اور چار رکعت نماز پڑھیں گے۔ پھر کبھی ان سے اچھے نہیں گے!

اس قسم کی صورت حال پیدا ہونے کے خدشے کے پیش نظر عمر بن خطابؓ



نے کہا — نہیں! ہمیں ”حی علیٰ خیر العمل“ کی بجائے ”الصلوة خیر من النوم“ کہنا چاہیے۔ یعنی نماز نیند سے بہتر اور اچھی چیز ہے۔ چونکہ اذان میں کہا جانے والا ”حی علیٰ خیر العمل“ کا جملہ ایک مجاہد کے اعتماد و نفس اور جوش جہاد کو کمزور کرتا ہے، لہذا ہم اس کی جگہ پر ”الصلوة خیر من النوم“ کہیں گے۔

تاہم عربین خطاب نے یہ نہیں سوچا کہ یہ سپاس سا بٹھا ستر یا اسی ہزار سپاہی جن کی تعداد قطعاً ایک لاکھ تک نہیں پہنچتی اور دشمن کی کئی لاکھ افراد پر مشتمل فوج کے خلاف وہ مختلف محاذوں پر کس طاقت سے لڑ رہے ہیں اور فتح پار ہے یا نہیں؟ اس فتح کا کیا رہے؟

کیا یہ فتح ہتھیاروں کے بل بوتے پر ہے؟ کیا عربوں کے ہتھیار ایرانیوں اور رومیوں کے ہتھیاروں سے بہتر اور کارگر تھے؟ قطعاً نہیں! ایران اور روم اس زمانے کی دو ترقی یافتہ مملکتیں تھیں اور ان کے سپاہیوں کے پاس بہترین ہتھیار تھے۔ چنانچہ جو تلواریں ایران اور روم کے فوجیوں کے پاس تھیں، ان کے مقابلے میں عربوں کے ہتھیار ٹوٹے ہوئے لوسے کے مانند تھے۔ کیا عربوں کی نسل رومیوں اور ایرانیوں کی نسلیں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ زور آور تھی؟ ہرگز نہیں!

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شاپور ذوالاکتاف نے ایران سے جا کر عربوں پر کیا آفت ڈھائی۔ کیا اس نے ہزاروں عربوں کو قیدی نہیں بنایا؟ کیا اس نے مار مار کر ان کے کندھے سیاہ نہیں کیے؟ کیا اس نے انہیں زنجیروں میں پھنسا دیں اور ان کے بازو زنجیروں میں نہیں جکڑے؟ اس وقت عربوں کا زور

کہاں تھا؟ اس کے بعد بھی کیا ایرانیوں نے عربوں کو شکست نہیں دی؟ پھر عربوں نے کس بل بوتے پر جنگ لڑی اور ایران و روم کی فوجوں کو شکست دی؟ یہ فتح انہوں نے قوتِ ایمان کی بدولت حاصل کی۔ ایمان کی یہ قوت وہی قوت ہے جو انہوں نے ”حَتَّىٰ عَلَىٰ خَيْرِ الْعَمَلِ“ سے حاصل کی۔ یعنی یہ وہ طاقت ہے جو انہوں نے نماز سے حاصل کی اور یہ وہ طاقت ہے جو انہوں نے اپنے خدا سے راز و نیاز کر کے حاصل کی۔ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق جب انسان رات کو خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے، راز و نیاز کرتا ہے اور اس کے حضور گڑ گڑاتا ہے تو وہ اپنے خدا سے طاقت حاصل کرتا ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو اسے اعتمادِ نفس عطا کرتی ہے۔ یعنی یہ وہ اعتمادِ نفس ہے جو ایمان کو شکست دیتا ہے اور یہی عرب کا وہ اعتمادِ نفس ہے جو روم کو شکست دیتا ہے۔ عرب نے یہ اعتمادِ نفس کہاں سے حاصل کیا؟ ہاں یہ اعتمادِ نفس اس نے ایمان سے حاصل کیا ہے۔ نماز کیا ہے؟ یہ اس ایمان کا تازہ کرنے اور زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے جو اس نے ”اللہ اکبر“ سے حاصل کیا ہے۔ وہ نماز میں کئی مرتبہ اللہ اکبر کہتا ہے۔ یعنی خدا پر رگم تڑپ ہے۔ خدا بزرگ بڑھتا ہے کہ ہر چیز اس کے سامنے بیچ ہے۔ پھر وہ خدا کی ظاہری عظمت اور جاہ و جلال کو دیکھتا ہے تو ایک بار پھر ”اللہ اکبر“ کہتا ہے جو ان سب بڑائیوں کا اقرار ہوتا ہے یعنی اس کے مقابل یہ سب چیزیں بیچ ہیں۔ اس کے بعد جب کبھی وہ اپنے مقابلے پر کئی لاکھ سپاہیوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے :

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام قدرت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ خدا پر مکلیہ رکھو۔۔۔ خدا پر بھروسہ کرو۔۔۔ خدا سے طاقت حاصل کرو۔۔۔ اور اسی سے مدد مانگو کہ وہی سب سے بڑا ہے۔

ایک مسلم مجاہد کی یہی نماز اسے طاقت عطا کرتی ہے جبکہ عمر بن خطاب کہتے ہیں کہ ”حجّی علیٰ خیر العمل“ کا جملہ اس بات کا موجب بنتا ہے کہ ایک مسلمان مجاہد جہاد سے کنارہ کش ہو جائے، گھر میں آرام کرے اور نمازیں پڑھتا رہے! لیکن ان کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جس شخص پر جہاد واجب ہو اور اس کا محاذ جنگ پر جانا لازم ہو۔۔۔ اس کا نماز کے لیے مسجدِ مدینہ میں رہ جانا حرام ہے۔ کیونکہ نماز کے قبول ہونے کی شرط جہاد ہے اور جہاد کے قبول ہونے کی شرط نماز ہے۔ جو شخص ایک مجاہد بننے کی شرائط پوری کرتا ہو اس پر واجب ہے کہ جہاد کرے، کیونکہ جہاد کے بغیر اس کی نماز باطل ہے اور نہ صرف یہ کہ ایسی نماز خیر العمل نہیں۔۔۔ بلکہ یہ شر العمل ہے۔ یہ وہ نماز نہیں جو اسلام نے سکھائی ہے، اس لیے اسے اسلام کی نماز یا دلائل۔ وہ نماز جو جہاد سے فرار کا ذریعہ بنے اور انسان کو کھینچ کر مسجد کے گوشے میں لے جائے وہ اسلام کی نماز نہیں ہے، اسلام کی نماز تو خیر العمل ہے۔ یہ نہ کہو کہ آؤ اذان سے ”حجّی علیٰ خیر العمل“ کا جملہ نکال دیں، کیونکہ یہ جہاد کی بجائے نماز پڑھنے رہنے کا سبق دیتا ہے۔

اسے وہ شخص کہ جو یہ باتیں کہہ رہا ہے تو اس غلط فہمی کو اپنے دماغ سے نکال دے اور جان لے کہ اسلام کی منطق اور اسلامی قدروں کے نظام میں سب سے بڑی قدر عبادت ہے، لیکن وہ صحیح اسلامی عبادت ہوتی چاہیے۔

۱۲۴

یعنی وہ ان شرائط کے ساتھ ہو جو قرآنی معیار کے مطابق ہوں۔ قرآن نے ہمیں معیار دیا اور فرمایا:

”بے شک نماز انسان کو بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔“ (سورہ عنکبوت - آیت ۴۵)

گویا کہ صحیح نماز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے۔ اب اگر آپ دیکھیں کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ برے کام بھی انجام دے رہے ہیں تو جان لیں کہ آپ کی نماز — نماز نہیں ہے، پس آپ اپنی نماز درست کیجیے۔ نماز آپ کو تمام دوسری انسانی قدروں تک پہنچاتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کی نماز واقعی نماز ہو۔ ہمیں تمام اصول اور تمام سبق امام علی علیہ السلام سے سیکھنے چاہئیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ — علیؑ — تمام اسلامی قدروں کا مجموعہ ہیں۔ منجی البلاغہ جو ان کا کلام ہے، وہ ایک ایسا کلام ہے کہ آپ جس مقام کو بھی دیکھیں وہاں ایک نئی منطق ملاحظہ کریں گے اور ایک مختلف شخصیت کو ملتے ہوئے پائیں گے۔

امام علی علیہ السلام ہر جگہ ایک الگ شخصیت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جس میں تمام انسانی قدروں یکجا ہو گئی ہیں۔

ایک جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ امام علیؑ کی منطق رزمیہ ہے اور آپ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے ساری زندگی اسی میدان میں کام کیا ہے۔ اس میں ایک ایسی روح ہے جو جنگی دلولے سے پڑنے لگی ہے۔ ایک اور مقام پر ہم ان کو ایک ایسا عارف پاتے ہیں کہ انہیں عاشقانہ راز و نیاز کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

آج اکیس رمضان کی رات ہے۔ لہذا میں ہجۃ البلاء سے دو مختصر سی عبارتیں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ اگرچہ ہجۃ البلاء میں اس موضوع پر اور بھی بہت سی باتیں موجود ہیں لیکن وقت کم ہے۔ تاہم میں یہ عبارتیں آپ کو اسلام کی منطق سے واقفیت دلانے کی خاطر نقل کر رہا ہوں :

صفین میں امیر المومنینؑ کی معاویہ سے پہلی مرتبہ مٹھ بھیر ہو رہی ہے معاویہ کے لشکر کی اس طرف سے آتے ہیں اور آپ کے لشکر کی اس طرف سے جاتے ہیں۔ پھر وہ ایک مقام پر جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھا۔ ایک سو سو سال سے وہ ایک سو جاتے ہیں۔ معاویہ اپنے ساتھیوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ پیش قدمی کریں اور اس سے پیش قدمی نہ لیں اور ان کے ساتھی وہاں پہنچیں پانی ان پر بند کر دیں۔ وہ لوگ گھاٹ پر قابض ہو کر خوش ہوتے اور کہتے ہیں کہ ایک وسیلے پر تو ہم نے قبضہ کر لیا ہے۔ جب علیؑ اور ان کے لشکر آئیں گے اور انہیں پانی نہیں ملے گا تو وہ مجبوراً یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے پھر اور بھی بہترین وسیلے ہمارے ہاتھ آئیں گے۔

نبی امام علیؑ نے اپنے لشکریوں سے فرمایا کہ ہمیں پہلے ان لوگوں سے بات چیت کرینی چاہیے۔ شاید اس طرح ہم اس مشکل کو حل کر سکتے ہیں، کیونکہ جو گروہ ہاتھوں سے کھل جائے اسے دانتوں سے نہیں کھونا چاہیے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو تو کوئی ایسا کام نہ کرو کہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ اور خونریزی شروع ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے معاویہ کو پیغام بھیجا :

ابھی ہم اس مقام پر پہنچے بھی نہیں اور تم نے پانی بند کر دیا !  
معاویہ نے جنگی مشاورتی کونسل تشکیل دی اور اپنے سرداروں سے رائے

طلب کی کہ تم کیا مناسب سمجھتے ہو، ہم ان کے لیے پانی کھول دیں یا نہیں؟ ان جنگی مشیروں میں سے بعض نے کہا پانی کھول دیجیے اور بعض نے کہا نہ کھولیں! چنانچہ عمرو عاصؓ نے کہا کہ علیؓ کے لیے پانی کھول دیجیے ورنہ وہ بزور حاصل کر لیں گے اور آپ کی بے عزتی ہوگی۔ دوسروں نے کہا: نہیں ہم نہیں کھولیں گے اور وہ ہم سے لے بھی نہیں سکتے۔ چنانچہ پانی نہ کھولا گیا اور یوں امیر المومنینؓ پر جنگ مسلط کر دی گئی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس وقت علیؓ آکر کھڑے ہوئے اور اپنے لشکر کے سامنے ایک درمید تقریر کرنے لگے۔ اس تقریر کا اثر ہزار ڈھولوں، ہزار باجوں پر اڑتھوں اور ہزار ٹوکی مار جوں سے زیادہ تھا۔

آپ نے یہ آواز بلند فرمایا:

اے لوگو! معاویہؓ نے گمراہیوں کے ایک ٹوٹے کو اپنے گرد جمع کر لیا ہے اور انہوں نے تم پر پانی بند کر دیا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ انہوں نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے تم پر پانی بند کر دیا ہے۔ لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے؟ تمہیں دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا چاہیے:

۱۔ وہ تم سے جنگ کے لقمے مناسب رہے ہیں، نواب یا تو تم زلت اور اپنے مقام کی پستی اور حقارت پر سر تسلیم خم کر دو، یا اپنی تلواروں کی پیاس خون سے بجھا کر اپنی پیاس پانی سے بجھاؤ۔ (منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین - خطبہ ۵۱)

میرے ساتھیو! کیا تم پیاس سے ہو؟ کیا تم میرے پاس اس لیے آئے ہو کہ تمہارے پاس پانی نہیں اور تم پیاس سے ہو اور پانی چاہتے ہو؟ تمہیں چاہیے کہ



پیلے اپنی تلواریں ان پلیدیوں کے خون سے سیراب کر دتا کہ پھر خود تم پانی سے  
سیراب ہو جاؤ۔

بعد میں آپ نے ایک جملہ فرمایا جس نے سب میں جوش و خروش  
پیدا کر دیا۔ امام علیؑ نے رزمیہ اور عسکری نگاہ سے موت اور زندگی کی تعریف  
کرتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو! زندگی کے کیا معنی ہیں اور موت سے کیا مراد ہے؟ کیا زندگی  
کے معنی زمین پر چلنے، کھانے پینے اور سونے کے ہیں؟ کیا موت سے مراد  
زمین میں دفن ہو جانا ہے؟ نہیں

بھت تمہارا ان سے کیا جانا جیتے جی موت ہے اور ناب

آکر مرنا۔۔۔۔۔ جینے کے برابر ہے۔ (حوالہ سابق)

نہ یہ زندگی ہے اور نہ وہ موت ہے۔ زندگی یہ ہے کہ مر جاؤ اور فتح مند  
رہو اور مرنا یہ ہے کہ زندہ رہو لیکن دوسرے کے محکوم اور مغلوب ہو کر جیو۔

ملاحظہ فرمائیے یہ جملہ کس قدر رزمیہ ہے اور کتنا بلند ہے!

اس جملے نے سو فوجی بارہوں سے زیادہ متاثر کیا۔ اب جتنی جلد ہو سکے  
امام علیؑ کے لشکر کی اگلی طرف پر نظر رکھنی چاہیے۔ دیکھیے کہ آپ کے لشکر  
نے معاویہ کے لشکر کو کئی کلومیٹر دور تک دوسری جانب دھکیل دیا اور گھاٹ  
ان کے قبضے میں آگیا ہے۔ انہوں نے بڑھ کر پانی روک لیا اور معاویہ پانی سے  
محروم ہو کر رہ گیا۔ تب اس نے ایک خط بھیجا جس میں پانی کھول دینے کی درخواست  
کی گئی تھی۔ علیؑ کے اصحاب نے کہا: یہ ناممکن ہے کہ ہم ان کے لیے پانی کھول  
دیں، کیونکہ اس کی پہل خود معاویہ نے کی اور کہا کہ ہم تمہیں پانی نہیں لینے دیں گے۔



لیکن امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

ہم یہ کام ہرگز نہیں کریں گے، کیونکہ یہ ایک بزدلانہ فعل ہے۔ میں میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرتا ہوں لیکن ایسی بندشوں کے ذریعے ہرگز فتح نہیں چاہتا، ایسی غیر انسانی باتوں کے ذریعے فتح پانا میرے شایان شان نہیں ہے اور نہ ایک معزز اور محترم مسلمان کے شایان شان ہے۔

اسے کہتے ہیں مروت اور مردانگی، لیکن مروت — شجاعت سے بلند تر ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی نے امام علی علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ شعر کہا ہے جو آپ کے بارے میں ان کے بہترین اشتعار میں سے ہے:

در شجاعت شیر رابستہ تی  
در مروت خود کہ داند کیستی

شجاعت میں آپ خدا کے شیر ہیں اور مروت میں کوئی آپ کی تعریف نہیں کر سکتا کہ آپ کیا ہیں۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۷۹)

یہاں ہم امام علیؑ کو ایک مقام پر، ایک مرتبہ پر اور ایک حیثیت میں دیکھتے ہیں۔

آئیں ایک مرتبہ پھر امام علی علیہ السلام کی طرز زندگی پر نگاہ ڈالیں جب آپ لوگوں کے کاموں سے فارغ ہو جاتے — تو پھر آپ ہوتے — اور آپ کا خدا، آپ ہوتے — اور آپ کی خلوت، آپ ہوتے — اور آپ کے عاشقانہ اور عابدانہ راز و نیاز —

خوش قسمتی سے یہ بھی بیچ البلاغہ میں ہے کہ:

۱۲۹

اے خدا! تو اپنے دوستوں کے ساتھ تمام اُنس رکھنے والوں سے زیادہ مانوس ہے اور جو تجھ پر بھروسہ رکھنے والے ہیں ان کی حاجت روائی کے لیے ہمہ وقت پیش پیش ہے۔  
(نسخ البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۳۲۴)

یہاں ہم بالخصوص نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ وہ نسخ البلاغہ کی جانب زیادہ توجہ دیں تاکہ وہ اس کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکیں۔  
ہاں تو امیر المومنین فرما رہے ہیں کہ اے خدا! تو اپنے اولیاء کے لیے ہر انیس سے بڑا انیس ہے یعنی اے خدا! جو اُنس میں تیرے ساتھ رکھتا ہوں وہ اپنے کسی بھی انیس کے ساتھ نہیں رکھتا۔ میرا انیس تو ہے اور تیرے سوا میں کسی انیس (ساتھی) کے ساتھ نہیں ہوں۔ اکیلا ہوں۔  
جب تیرے ساتھ ہوں تو محسوس کرتا ہوں کسی کے ساتھ ہوں۔ اے خدا! جو لوگ تجھ پر بھروسہ رکھتے ہیں، تو ان کے لیے ہر دوسرے شخص سے بڑھ کر حاضر اور زیادہ بیدار ہے۔

اے خدا! تو ان کی باطنی کیفیتوں کو دیکھتا اور ان کے چہرے ہونے بھیدوں کو جانتا ہے۔ (حوالہ سابقہ)  
یعنی اے خدا! تو اپنے دوستوں اور اپنے عاشقوں کے باطن اور ضمیر کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان کے ضمیر اور باطن سے آگاہ ہے۔ تو ان کے عرفان اور بصیرت کی حدود سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ بصیرت کے کس مقام پر ہیں۔ ان کے زائد تیرے سامنے ظاہر ہیں اور ان کے دل تیری جانب پڑا کر رہے ہیں۔

۱۳۰

دعاے کیل کو پڑھنے کی کوشش کیجیے — یہ امام علیؑ کی دعا ہے اور اپنے مضامین کے لحاظ سے عرفان کی بلندیاں اس دعائیں نظر آتی ہیں یعنی اگر آپ یہ دعا شروع سے آخر تک پڑھیں تو اس میں نہ دنیا پائیں گے نہ آخرت اور آخرت سے میری مراد ہمیشہ اور جہنم ہے۔ اس دعائیں آپ کیا دیکھیں گے؟ وہ جو دنیا سے بلند اور آخرت سے بھی بلند ہے۔ یعنی خدا ہی خدا — بس ایک خالص عبادت گزار اور والہ و شیدا بندے کے لئے تعالیٰ کی ذات اقدس کے ساتھ روابط — یعنی عبادت کی حقیقت آپ دیکھیں گے کہ امام علیؑ علیہ السلام خدا سے کیسے راز و نیاز کر رہے ہیں — کیسے مناجات کر رہے ہیں!

امام زین العابدین علیہ السلام نے ماہ رمضان کی دعا ہائے سحر میں ابو حمرہ ثمالی سے منسوب دعائیں اپنے خدا سے کیسے راز و نیاز اور مناجات کی ہے؟ یہ ہمارے مسلمان ہونے کا پہلا قدم ہے — یعنی پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اپنے خدا کے نزدیک ہوں اور اس کے نزدیک ہونے سے ہم انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتے ہیں ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ان کی طرف میلانات کو ترک کر دیں کیونکہ اسلام ہمیشہ اپنی ملت کے ایک طرف میلانات کی مصیبت سے دوچار رہا ہے۔ پھر اس لیے کہ ہم ایک اور شکل میں دوبارہ کی طرف میلانات کی اس بیماری میں مبتلا نہ ہو جائیں — ہمیں عبادت کی اہمیت کو ہرگز کم نہیں سمجھنا چاہیے۔

امام صادق علیہ السلام نے اپنے آخری وقت میں جب یہ حکم دیا کہ میرے تمام رشتہ داروں کو جمع کرو تو وہ جمع ہو گئے۔ تب امام علیہ السلام نے اپنی

۱۳۱

مبارک آنکھیں آخری مرتبہ کھولیں، ایک جملہ کہا اور پھر حلت فرما گئے۔  
وہ جملہ یہ تھا:

۶۲ یعنی جو شخص نماز کو پے قدر سمجھے اسے ہماری شفاعت  
نصیب نہ ہوگی!

امام علی علیہ السلام کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز دور آپ کی  
عمر کی آخری ۲۵ ساعتیں ہیں۔ آپ کی زندگی کا پہلا دور آپ کی پیدائش  
سے رسول اکرمؐ کی بعثت تک ہے۔ دوسرا دور رسول اکرمؐ کی بعثت سے  
ہجرت تک ہے۔ تیسرا دور ہجرت سے رسول اکرمؐ کی وفات تک ہے اور اس  
کا رنگ الگ ہے۔ چوتھا دور رسول اکرمؐ کے وصال سے تھو آپ کی خلافت  
تک ۲۵ سال کا عرصہ ایک اور صورت رکھتا ہے۔ پانچواں دور آپ کا ساڑھے  
چار سال کا عہد خلافت ہے۔ آپ کی زندگی کا چھٹا دور حضرت سے شہادت تک  
ہے جو دو دن رات سے کم ہے لیکن یہ امام علی علیہ السلام کی زندگی کا سب  
سے حیرت انگیز دور ہے۔

اس وقت جب امام علی علیہ السلام موت سے قریب ہوئے، ان لمحات  
میں آپ کا کامل انسان ہونا زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ کامل انسان کے معیار  
میں سے ایک یہ ہے کہ وہ موت کا سامنا کیسے کرتا ہے۔ موت کا سامنا  
کرتے وقت آپ کا پہلا رد عمل یہ تھا کہ جب آپ کے مبارک پر ضرب لگی  
تو آپ سے دو جملے سنے گئے:

پہلا یہ تھا کہ آپ نے فرمایا:

۶۳ قسم ہے ربِّ کعبہ کی کہ میں کامیاب ہوا اور شہادت

۱۳۲

حاصل کی جو میرے لیے کامیابی ہے۔

دوسرا جملہ یہ تھا:

اس آدمی کو پکڑ لو!

امام علی علیہ السلام کو لا کر بستر پر لٹایا گیا۔ ایک طبیب جس کا نام اسید بن عمرو تھا، اس نے عرب اور جندی شاپور میں بھی تعلیم پائی تھی اور کوفہ میں رہتا تھا۔ اس کو امیر المومنینؑ کے زخم کا معائنہ کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اس نے اس وقت دستیاب وسائل کے ذریعے معائنہ کیا اور سمجھ گیا کہ زہر امامؑ کے خون میں سرایت کر گیا ہے۔ چنانچہ اس نے ناامیدی ظاہر کی اور عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! اگر آپ نے کوئی وصیت کرنی ہو تو کر لیں.....

جب بی بی ام کلثوم اس ازلی اور ابدی لعین (ابن ملجم) کے پاس سے گزریں تو انہوں نے اسے سخت سست کہتے ہوئے فرمایا:

اے ملعون! میرے باپ نے تیرے ساتھ کوئی برا سلوک کیا تھا کہ

تو نے یہ کام کیا؟

پھر کہنے لگیں:

مجھے امید ہے کہ میرے والد صحت یاب ہو جائیں گے اور تیرے لیے صرف روک سبھا ہی رہ جائے گی۔

جب بی بی کلثوم نے یہ جملہ ادا کیا تو اس نے کہا:

آپ خاطر جمع رکھیں۔ میں نے یہ تلوار ہزار درہم (یا دینار) میں خریدی ہے اور اتنے ہی اس کو زہراؑ لو کر لانے کے لیے دیے ہیں۔ میں

۱۳۳

نے اس پر ایسا نہ ہر لگوا یا ہے کہ اگر یہ فقط آپ کے والد کے سر پر نہیں بلکہ بیک وقت تمام اہل کوفہ کے سروں پر لگتی تو وہ سب ہلاک ہو جاتے۔ پس آپ ابھی طرح سمجھ لیں کہ آپ کے والد زندہ نہیں رہیں گے۔

لیکن امام علیؑ کے بیشتر انسانی معجزے یہاں ظاہر ہوتے ہیں آپ کے لیے غذا لائی گئی مگر آپ غذا تو نہیں کھا سکتے تھے۔ تب آپ کے لیے دودھ لایا گیا جو آپ نے تھوڑا سا پی لیا۔

پھر اپنی وصیتوں کے ضمن میں فرمایا: اپنے اس قیدی (ابن ملجم) کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اے نبی خدا المطلب! ایسا نہ ہو کہ تم میری وفات کے بعد لوگوں سے کہتے پھر دو کہ امیر المومنینؑ یوں ہوئے۔۔۔۔۔ فلاں شخص اس کا محرک تھا اور اس طرح مختلف آدمیوں پر الزام لگوانے لگو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ایسی باتیں کرو۔۔۔۔۔ میرا قاتل ایک ہی شخص ہے! آپ نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا:

میرے بیٹے حسن! اس (ابن ملجم) نے تمہارے باپ کو ایک سے زیادہ ضرب نہیں لگائی یہ اس نے دو ضربیں نہیں لگائیں۔ میرے بعد تمہیں خود اختیار ہے کہ اگر تم اسے آزاد کرنا چاہو تو آزاد کرو اور اگر قصاص لینا چاہو تو یاد رکھو کہ اس نے تمہارے باپ کو ایک ضرب لگائی ہے۔۔۔۔۔ تم بھی اسے فقط ایک ضرب لگانا۔ وہ اس ضرب سے مارا جائے اور نہ مارا جائے تو خیر!

۱۴ شیعہ البلاغہ صبحی ص ۲۲۱

۱۳۴

پھر آپ نے اپنے اس قاتل کے بارے میں بھی پوچھ لیا کہ آیا اُسے  
کھانا پانی دیا گیا ہے یا نہیں؟ اپنے دشمن سے بھی آپ کا سلوک ایسا تھا۔  
مولوی مصحفی نے کہا ہے:

در شجاعت شیر ربانستی  
در مروت خود کہ داند کیستی

بہادری میں تو آپ کا لقب شیر خدا ہے۔ رحمہ اللہ میں کوئی  
آپ کی تعریف نہیں کر سکتا۔ (مثنوی مولانا روم صفحہ ۷۹)

یہ امام علی علیہ السلام کی مردانگی اور انسانیت کا نمونہ ہے۔ آپ بستر  
میں لیٹے ہیں اور تہوں تہوں وقت گزر رہا ہے آپ کی حالت نظر ناک ہوتی  
جا رہی ہے۔ نہر آپ کے مقدس بدن پر اور زیادہ اثر کر رہا ہے۔ اصحاب  
اتے ہیں ————— وہ پریشان ہیں ————— وہ روتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں۔  
لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ علیؑ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور شگفتگی ہے —————  
آپ فرما رہے ہیں:

۱۳۵ خدا کی قسم! یہ موت کا ناگہانی حادثہ ایسا نہیں ہے کہ  
میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ اور نہ یہ ایسا سانحہ ہے کہ  
میں اسے برا جانتا ہوں۔ میری مثال بس اس شخص کی سی  
ہے جو رات بھر بانی کی تلاش میں چلے اور صبح ہوتے ہی چٹم  
پر پہنچ جائے اور اس ڈھونڈتے دلے کی مانند ہوں جو مقصد  
کو پالے اور جو اللہ کے یہاں ہے وہی نیکی کا روئے کے لیے  
بہتر ہے۔ (تہذیب اللہ مفتی جعفر حسین۔ ص ۲۳)



۱۳۵

یعنی جو کچھ مجھ پر گزری ہے وہ ایسی چیز نہیں جو مجھے ناپسند ہو۔ ہرگز نہیں۔۔۔ یہ موت اور شہادت ہے۔ خدا کی راہ میں موت اور شہادت ایک ایسی چیز ہے جس کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی ہے۔ اس سے بہتر ہوگا کہ میں عین عبادت کی حالت میں شہید ہو جاؤں۔ اس کے بعد آپ نے وہ مثلی بیان کی جس سے عرب بخوبی آشنا رہے ہیں۔ وہ عرب جو بیابانوں میں رہتے اور پر مشقت زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کو جہاں کہیں پانی اور سبزہ نظر آتا، وہاں ڈیرہ ڈال دیتے اور حیب وہ ختم ہو جاتا تو دوسری جگہ جا رہتے تھے۔ چونکہ دن گرم ہوتے تھے اس لیے راتوں کو ایسی جگہ تلاش کرنے جاتے تھے کہ جہاں پانی ہو۔

امام علیؑ فرماتے ہیں:

اے لوگو! اس شخص کو کتنی خوشی ہوتی ہے جو اندھیری رات میں پانی تلاش کر رہا ہو اور اچانک اسے پانی مل جائے۔

اس کلام میں آپ اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں: میری مثال اس عاشق کی ہے جو اپنے معشوق تک پہنچ گیا ہو۔ میری مثال اس شخص کی ہے جو اندھیری رات میں پانی تلاش کر رہا ہو اور اچانک اسے پانی مل جائے۔

اس ذیل میں حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے:

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند  
اندر آن ظلمت شب آبِ حیاتم دادند  
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی  
آن شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

۱۳۶

اپنے ان اشعار میں حافظ شیرازی نے امام علیؑ کے اس ارشاد کی تشریح کی ہے کہ ”رب کعبہ کی قسم! میں کا میاب ہو گیا۔“ یعنی کل رات مجھے غم زندگی سے نجات مل گئی جبکہ رات کے اندھیرے میں مجھے شہادت کا آبِ حیات پلایا گیا۔ وہ کیسی اچھی رات اور کتنی پیاری صبح تھی کہ جس میں مجھے میرا نصیب (مرتبہ شہادت) دیدیا گیا۔

امام علیؑ کی سب سے زیادہ پرسوز و باتیں ہیں جو آپؑ نے ان تقریباً ۴۵ آخری ساعتوں میں کہیں۔

امام علیؑ نے ۱۹ رمضان کو صبح صادق سے تھوڑی دیر بعد زہر بھری ”لوار کی شرب کھائی“ اور کہیں کہ ”وہی رات کے وقت آپؑ کی مقدس روح عالم بالا کی جانب پرواز کر گئی۔“ ان آخری لمحات میں بھی اہل و عیال آپؑ کے بستر کے گرد جمع تھے۔ آپؑ کے مبارک بدن پر زہر کا بہت زیادہ اثر ہو گیا تھا۔ بعض اوقات آپؑ پر غشی طاری ہو جاتی — لیکن جو نہی آپؑ کو ہوش آتا آپؑ اپنی زبان سے دوبارہ موتی بکھیرنے لگتے تھے۔ اس وقت آپؑ حکمت کی باتیں بتاتے، نصیحتیں کرتے اور وعظ فرماتے تھے۔ آپؑ کی آخری میں بھی وہی خوش و زور خطابت پایا جاتا ہے جیسے آپؑ نے بیس عنوانوں میں بیان کیا ہے

چنانچہ آپؑ اہل بیتؑ کو آواز دیتے ہیں اور سب سے پہلے حسنؑ و حسینؑ کو مخاطب فرماتے ہیں :

میرے حسنؑ، میرے حسینؑ، میرے تمام فرزند اور وہ تمام لوگو  
جن تک روزِ قیامت تک میری باتیں پہنچیں — میں  
تمہارے ساتھ ہوں (یعنی ہم اور آپؑ جو یہاں بیٹھے ہیں

۱۳۷

ہم بھی امام علی علیہ السلام کے مخاطب ہیں۔

۶۵۔ پھر ہمارے مولا اسلام کی جامعیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:  
 آپ خدا کا خوف دلا کر ایک ایک چیز کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی نماز کے  
 بارے میں خدا کا خوف کرو کہ اس کا حکم یوں ہے — زکوٰۃ کے بارے میں  
 خدا کا خوف کرو کہ اس کا حکم یوں ہے — خدا کا خوف کرو کہ .....  
 اور ..... آپ کتنے چلے گئے اور وہ بیس عنوان جو آپ کی نظر میں تھے وہ  
 سب کے سب بیان کیے۔ تحف العقول صفحہ ۱۳۵

جن لوگوں کی نگاہیں علیؑ کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں، انہوں نے  
 اچانک دیکھا کہ مولا علیؑ کی حالت بہت تبدیل ہو گئی ہے۔ انہوں نے دیکھا  
 کہ آپ کی مبارک پیشانی پر پسینہ آگیا ہے اور آپ نے اپنی توجہ لوگوں کی جانب  
 سے ہٹالی ہے اور اپنی دنیا میں چلے گئے ہیں۔ آنکھیں اور کان آپ کے  
 ہونٹوں پر لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں آپ کیا فرماتے ہیں، اتنے میں امیر المومنینؑ  
 کی آواز بلند ہوئی:

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا  
 عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ.

## پانچویں نشست

### کمال اور اخلاق کا رابطہ

اللہ وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں اتنی ہی سے  
ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان  
کو پاک کرتا اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے اگرچہ  
وہ لوگ اس کے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

(سورہ جمعہ - آیت ۲)

ہر صاحب کتب شخص جو بنی نوع انسان کے لیے کوئی ضابطہ حیات  
لایا ہے وہ انسان کے کمال یا کامل انسان کے بارے میں ایک نظریہ رکھتا  
ہے۔ وہ چیز جس کو اخلاق کا نام دیا جاتا ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ  
وہ ایک علم نہیں ”فن“ ہے۔ یعنی اخلاق کا تعلق اس سے ہے جو  
”ہونا چاہیے“ اور اس سے نہیں جو ”ہو رہا ہے“  
اخلاق سے مراد ایسی اچھی صفات ہیں جو انسان میں ہونی

چاہئیں اور بہتر یہی ہے کہ وہ یہ صفیتیں رکھتا ہو۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہو تو وہ انسانیت کے بلند مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے اور یہی ایک بلند انسان برتر انسان اور کامل انسان کی دوسری تعبیر ہے۔ کامل انسان کے بارے میں مختلف مکاتب فکر کے باتوں کے نظریات کا خلاصہ چند بنیادی نظریات کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے :

ایک نظریہ عقل پر اعتماد کرنے والوں کا ہے — یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے انسان کو زیادہ تر عقل کے زاویے سے پرکھا اور صرف عقل کو ہی اس کا جوہر سمجھا ہے — عقل کے معنی سوچ، بچاؤ کی قوت کے ہیں۔

سوچنے کا یہ انداز قدیم فلسفیوں کا تھا جس میں ہمارے (سب تو نہیں مگر بعض) قدیم فلسفی بھی شامل ہیں، جن میں ایک بوعلی سینا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کامل انسان کے معنی ”حکیم“ ہیں اور انسان کا کمال اس کی حکمت میں ہے۔ حکمت سے ان کی مراد کیا ہے؟ کیا حکمت وہ چیز ہے جسے ہم آجکل حکمت کہتے ہیں؟ نہیں — حکمت سے ان کی مراد حکمت نظری ہے جو کل کائنات کے بارے میں ایک صحیح دریافت ہے جو علم کے علاوہ ہے۔ یہ ہستی کے ایک حصے کی دریافت ہے۔ اب اس مرحلے پر ہم حکمت اور علم میں فرق واضح کرنے کے لیے اس قول کی مزید توضیح کرتے ہیں۔ اگر آپ شہر تہران کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو آپ دو قسم کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں — ایک عام لیکن مبہم معلومات اور دوسری جزوی لیکن صریح معلومات ہوں گی۔ مثلاً بعض اوقات شہر تہران

۱۴۰

کے بارے میں آپ کی معلومات ایک میونسپل انجینئر کی معلومات کی مانند ہوتی ہیں۔ اگر آپ اسے شہر کا ایک عام نقشہ کھینچنے کو کہیں تو وہ آپ کو تہران کا ایک عام نقشہ کھینچ دے گا اور وہ بتائے گا کہ وہ شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب تک کیسا ہے۔ نیز اس کا جنوب مشرقی اور جنوب مغربی حصہ کیسا ہے۔ وہ شہر کی سڑکیں، میدان اور پارک بھی کاغذ پر کھینچ دے گا۔ مثلاً یہ نبیاوران ہے، وہ تجریش ہے اور اس طرف شاہ عبدالعظیم ہے۔ وہ آپ کو تہران کے بارے میں عام اطلاعات بہم پہنچائے گا لیکن وہ سب مبہم ہوں گی اور اگرچہ وہ آپ کو سارے شہر کے بارے میں بتائے گا لیکن اگر آپ اس نقشے میں اپنا گھر تلاش کرنا چاہیں تو نہیں کر پائیں گے۔

بعض اوقات ایک شخص کو اس عظیم شہر کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس میں کتنی سڑکیں ہیں اور کتنے میدان ہیں۔ لیکن اگر آپ اس سے ایک خاص محلے کے متعلق پوچھیں تو اسے اس جگہ کی تمام جزئیات کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس محلے میں کتنے کوچے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے کیسے ملے ہوئے ہیں۔ نیز فلاں کوچے میں کتنے گھر ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ان گھروں کے دروازوں کا رنگ بھی جانتا ہے کہ یہ تیلہ ہے اور وہ سرخ ہے۔ پس اگر آپ اس شخص سے جو سارے شہر سے واقف ہے ایک خاص جگہ کے بارے میں سوال کریں تو اسے کوئی خبر نہ ہوگی اور اگر آپ اس شخص سے جو ایک خاص محلے کے بارے میں جانتا ہے سارے شہر کے متعلق پوچھیں تو اسے کچھ پتہ نہ ہوگا۔

حکیم یا فلسفی اس شخص کو کہتے ہیں جو عالم ہستی کا مجموعی طور پر مطالعہ کرتا ہے۔ وہ عالم ہستی کی انتہا کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کی ابتدا

کے ساتھ ساتھ اس کی انتہا کا اندازہ لگانا چاہتا ہے۔ وہ ہستی کے حقائق اور اس کے عام قوانین معلوم کرنا چاہتا ہے لیکن اگر آپ اسی شخص سے کسی جڑی بوٹی، حیوان، پتھر، زمین یا سورج کے متعلق سوال کریں تو اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

فلسفی کے لفظ نظر کے مطابق حکمت کے معنی دنیا کے بارے میں معلومات ہیں۔ دنیا کی مجموعی ہیئت کے بارے میں ایسی معلومات جو حکیم یا فلسفی کے ذہن کے آئینے میں منعکس ہوئی ہوں۔ یعنی تمام کائنات حکیم کی عقل میں سمجھ ہو گئی ہو لیکن وہ مبہم شکل میں ہو۔

گزشتہ زمانے میں کہا جاتا تھا انسان کا کمال اس میں ہے کہ دنیا کی تمام ہیئت اس کے ذہن میں منعکس ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم فلسفی کہا کرتے تھے:

عقلی دنیا کے انسان کا عینی دنیا کے مطابق ہو جانا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ خود اس دنیا کے مقابلے میں ایک دنیا بن جاتا ہے۔

لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہ عینی دنیا ہے اور یہ عقلی اور فکری دنیا ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

ہر آن کس ز دانش برد تو نشہ ای  
جہانی است بنشستہ در گوشہ ای

جو انسان عقل و دانش کی منزل طے کر جائے وہ دراصل ایک گوشے میں سمٹی ہوئی دنیا ہے۔



۱۴۲

فلسفیوں کے نظریے کے مطابق کامل انسان یعنی جس کی عقل کمال تک پہنچی ہوئی ہو، وہ ان معنوں میں بھی کمال کو پہنچتا ہے کہ اس کائنات کی ہیئت کا ایک نقش اس کے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے، لیکن کس طرح سے؟ ہاں وہ نقش برہان، استدلال، منطق اور فکر کے لحاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان استدلال اور منطق کے قدموں سے حرکت کرتا ہوا اس مقام پر پہنچتا ہے لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اور کہا ہے کہ حکمتیں دو ہیں:

① حکمت نظری: یعنی دنیا کو اس کی شکل میں پہچاننا۔

② حکمت عملی: یعنی انسان کی عقل کا اس کے وجود کی تمام جبلتوں اور قوتوں پر کالی تسلط پانا۔

اگر آپ نے کتب اخلاق کا مطالعہ کیا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان میں سے بیشتر اس عقلی بنیاد پر نتائج نکالتی ہیں۔ یعنی ہمارا فن اخلاق — سقراطی اخلاق ہے اور اس کا دار و مدار ہمیشہ عقل پر ہوتا ہے۔ کیا آپ کی عقل آپ کی نفسانی خواہشات پر حاکم ہے یا آپ کی نفسانی خواہشات آپ کی عقل پر حاکم ہیں؟ کیا آپ کی عقل آپ کے غصے پر حاکم ہے یا آپ کا غصہ آپ کی عقل پر حاکم ہے؟ کیا آپ کی عقل آپ کے ترہمات پر حاکم ہے یا آپ کے ترہمات آپ کی عقل پر حاکم ہے؟ اگر آپ حکمت نظری میں اس دنیا کو اسی طرح سمجھ لیں جیسا کہ ہم اوپر کہ چکے ہیں اور حکمت عملی میں بھی اپنی عقل کو اپنے نفس پر مسلط کر لیں کہ آپ کا نفس اور نفسانی قوتیں آپ کی عقل کے تابع ہوں تو آپ عقل و حکمت کے اس مکتب فکر کے نقطہ نظر سے ایک کامل انسان ہیں۔

۱۴۳

کامل انسان کا تعین کرنے کے بارے میں ”مکتب عقل“ کے علاوہ ایک اور مکتب بھی ہے اور وہ ”مکتب عشق“ ہے۔

”مکتب عشق“ جو درحقیقت ”مکتب عرفان“ ہے، اس

میں انسان کا کمال عشق میں اور اس چیز میں سمجھا جاتا ہے جس تک عشق انسان کو پہنچاتا ہے اور اس سے مراد خدائے تعالیٰ کی ذات سے عشق ہے۔

گویا کہ مکتب عشق — مکتب عقل کے برعکس ہے — جو ”حرکت“ کا نہیں ”فکر“ کا مکتب ہے۔ کیونکہ حکیم حرکت کی بات نہیں کرتا بلکہ فکر کی بات کرتا ہے اور اس کے نظریے کے مطابق تمام

حرکیں بھی ذہن ہی کی حرکت ہیں۔ جہاں تک عشق کے مکتب کا تعلق ہے تو وہ حرکت کا مکتب ہے لیکن یہ حرکت افقی نہیں بلکہ ”عمودی“ اور

”عمودی“ ہوتی ہے۔ تاہم بعد میں یہ ”افقی حرکت“ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب ایک انسان کمال تک پہنچنا چاہے تو ضروری ہے کہ

ابتداء میں اس کی حرکت عمودی اور صعودی ہو۔ یعنی وہ خدا کی جانب حرکت اور پرواز ہو۔ مکتب عشق کے لوگوں کا خیال ہے کہ بات فکر کی بات نہیں

— بات عقل کی بات نہیں — بات استدلال کی بات نہیں —

بلکہ بات انسان کی روح کی بات ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق انسان کی روح واقعی حرکت کرتی ہے اور وہ ایک معنوی حرکت

ہوتی ہے — حتیٰ کہ وہ خدا تک جا پہنچتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مکتب بنیادی طور پر عقل کے مکتب کا داسہ روکتا ہے۔

ہماری ادبیات کا ایک گرانقدر حصہ ”عقل“ اور ”عشق“ کے مناظر

۱۲۲

سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر جو اشخاص اس بحث میں وارد ہوئے ہیں اور زیادہ تر خود اہل عرفان تھے اور انہوں نے ہمیشہ عشق کو عقل پر فتح مند قرار دیا ہے۔ یہ وہی مکتب ہے جس کے پیرو کامل انسان کے لیے اور انسان کے کمال تک پہنچنے کے لیے عقل کو کافی نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل انسان کے وجود کا ایک جزو ہے اور انسان کی عقل اس کی پوری ذات پر محیط نہیں ہے۔ عقل آنکھ کی مانند ہے اور یہ محض ایک آلہ ہے۔ حالیہ دور میں ”برستون“ نے بھی اس بات پر بہت اعتبار کیا ہے۔ اہل عشق کا کہنا ہے کہ انسان کی ذات اور انسان کا توہر عقل نہیں بلکہ روح ہے اور روح کا تعلق دنیائے عشق سے ہے۔ یہ ایک ایسا جوہر ہے جس میں خدائے تعالیٰ کی جانب حرکت کے علاوہ اور کوئی چیز مطلوب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کے مقابل عقل حقیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس مکتب کے پیرو عشق و مستی کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ حافظ شیرازی کے بعض اشعار میں آیا ہے، ان کے ہاں توحید کے معنی کچھ اور ہیں۔ ان کی توحید ”وحدت وجود“ ہے اور ایک ایسی توحید ہے کہ اگر انسان وہاں تک پہنچ جائے تو ہر چیز کو حقیقی شکل میں اپنے اندر پاتا ہے اور بالآخر ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان — انسان بھی ہے اور خدا بھی ہے۔ اور اس مکتب کے مطابق ایک کامل انسان آخر کار خدا بن جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک حقیقی کامل انسان خود خدا ہے اور ہر وہ انسان جو کامل انسان ہو جاتا ہے وہ خود فنا ہو کر خدا سے متصل ہو جاتا ہے۔

## سبیل سکینہ محمد ابا علیف آباد پرنٹ نمبر ۸۱

۱۴۵

کامل انسان کے بارے میں ایک اور نقطہ نگاہ بھی ہے جو نہ عقل پر  
تکیہ کرتا ہے اور نہ عشق پر — بلکہ وہ فقط ”قدرت“ پر تکیہ کرتا ہے۔  
اس مکتب میں کامل انسان کے معنی مقتدر انسان کے ہیں۔ ان  
کے نقطہ نظر کے مطابق کمال کے معنی قدرت کے ہیں یعنی اقتدار —  
زور اور پھر جس معنوں میں بھی آپ قدرت کو لے لیں۔

SOPHIST

قدیم یونان میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں سوفسطائی  
کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ نظریہ بڑی صداقت سے بیان کیا اور کہا ہے کہ  
”حق“ کے ”حق“ ہیں زور اور ہمارا ایسی زور ہے وہ حق ہے۔  
جاں کہیں قدرت ہے وہی قدرت حق ہے اور کمزوری بے حق اور  
ناحق کے برابر ہے۔

ان کے ہاں بنیادی طور پر عدالت اور ظلم کے کوئی معنی اور مفہوم  
نہیں ہے۔ لہذا وہ کہتے ہیں ”حق زور“ ہے یعنی حق زور میں سے پیدا  
ہوتا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ انسان کی تمام تر کوشش زور، قوت اور  
قدرت حاصل کرنے کے لیے ہوتی چاہیے اور بس۔ پھر اسے یہ قدرت  
حاصل کرنے کے لیے کوئی پابندی اور کوئی حد بھی قبول نہیں کرنی چاہیے۔  
حالیکہ ایک دو صدیوں میں مشہور جرمن فلاسفر فٹشے نے اس مکتب فکر  
کو دوبارہ زندہ کیا — آگے بڑھایا اور اس کی خوب ترجمانی کی ہے۔  
یہ لوگ کہتے ہیں کہ سچائی اچھی چیز ہے، دوستی اچھی چیز ہے، امانت اچھی  
چیز ہے — وغیرہ، یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ انسانیت اچھی چیز ہے  
نیکی اچھی چیز ہے — یہ بھی فضول باتیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس کے کیا

۱۴۶

معنی ہیں کہ جو کمزور ہو اسے سہارا دینا چاہیے؟ اس کی بجائے اس کے منہ پر تو ایک ٹھانچہ مارنا چاہیے۔ اس کا اس سے بڑا کوئی اور گناہ نہیں کہ وہ کمزور ہے۔ چونکہ وہ کمزور ہے اس لیے اس کے سر پر ایک پتھر دے مارو۔

نطشے جو خدا اور دین کا مخالف ہے وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ دین کمزوروں نے اختراع کیا ہے۔ یہ کارل مارکس کے نظریے کے بالکل برعکس ہے جو کہتا ہے کہ دین طاقتور لوگوں نے اختراع کیا ہے تاکہ کمزوروں کو اپنے غلام بنائے رکھیں اس کے مقابل نطشے کہتا ہے نہیں۔ دین کمزوروں نے اختراع کیا ہے تاکہ طاقتوروں کی طاقت کو محدود کریں۔ چنانچہ اس کے نظریے کے مطابق دین نے نوع بشر کے ساتھ جو غداری کی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے آکر بخشش، سخاوت، روح، مروت، انسانیت، اچھائی وغیرہ کے مفاہیم لوگوں میں پھیلا دیے اور بعد میں طاقتور لوگوں نے ان باتوں سے دھوکا کھایا ہے۔ چنانچہ وہ عدالت، سخاوت، بخشش اور انسانیت کو ملحوظ رکھنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے اپنی طاقت میں کسی حد تک کمی کر دی ہے۔

وہ کہتا ہے: حاکمان دین نے آکر کہا ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد! لیکن تم کو نفس کی ناز برداری اور کہو نفس پروری! انہوں نے کہا۔ مساوات — وہ کہتا ہے یہ غلط ہے! مساوات کے کیا معنی ہیں؟ یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ کچھ لوگ کمزور ہوں اور کچھ زبردست ہوں کمزور۔ زبردستوں کی خاطر کام کریں! تاکہ وہ پھلیں پھولیں اور بڑھ چڑھ جائیں اور ان میں سے ایک برتر آدمی پیدا ہو!

۱۴۷

وہ مزید کہتا ہے: اہل دین کہتے ہیں کہ عورت اور مرد کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں۔۔۔ یہ بھی غلط ہے۔ مرد ایک برتر اور طاقتور جنس ہے، عورت۔۔۔ مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اس کی پیدائش کا اور کوئی مقصد نہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ مکتب فکر بنیادی طور پر مقتدر اور زور آور فرد کو برتر، ممتاز اور کامل انسان سے تعبیر کرتا ہے اور کمال کو قدرت اور قوت میں منحصر کر دیتا ہے۔ آج کل کم و بیش یہی باتیں نادانستہ طور پر جو مسلمانوں کے درمیان بھی رائج ہو گئی ہیں۔ بعض اوقات ہم بے خیالی میں کہتے ہیں زندگی ”تنازع بقا“ ہے انہیں۔۔۔ زندگی تنازع بقا

نہیں ہے۔ ہاں تنازع بقا۔۔۔ اپنے دفاع کے معنوں میں درست ہے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض مسلم علماء مثلاً فرید وجدی نے کہا ہے کہ انسانوں کے درمیان جنگ ایک ضرورت ہے اور جب تک انسان ہے جنگ ہونی چاہیے، کیونکہ یہ انسان کی زندگی کا ایک بنیادی اصول ہے۔ وہ اس بات پر اکتفا کر رکھتے اور کہتے ہیں کہ خود قرآن نے بھی اس بات کی تائید کی ہے:

”اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دور نہ کرتا رہتا تو گرجے، ہسپتال، آتشکدے اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے، کبھی کے ڈھا دیے گئے ہوتے۔“

(سورہ حج - آیت ۴۰)







۱۴۹

جنگ آزما سپاہی کا ممنون ہونا چاہیے۔

بنائیں اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ انسان تربیت اور کمال کے ایک ایسے مرحلے پر پہنچ جائے کہ جہاں متجاوز کا کوئی وجود نہ ہو۔ جب متجاوز کا وجود نہ ہوگا تو مشروع جنگ کا بھی کوئی وجود نہ ہوگا۔ اسی لیے اسلام میں حضرت ہمدیؑ کی حکومت کا تعارف ایک مثالی معاشرے کے طور پر کرایا جاتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ انہیں دنوں جب میں اس مسئلے کے بارے میں مطالعہ کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک عجیب داستان ہے جو اسلام کے مثالی معاشرے کو بھانٹنے کے لیے ایک بہت بڑا وسیع ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ امام ہمدیؑ کے زمانے میں درندے بھی آپس میں صلح کر لیں گے اور جنگ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ یعنی لوگ کمال کی اس حد تک پہنچ جائیں گے جہاں متجاوز کا کوئی وجود نہ ہوگا کہ جس کی بنا پر جنگ لڑی جائے۔

لہذا یہ جو کہا جاتا ہے کہ زندگی بقاء کی خاطر جنگ کرتے کا نام ہے۔ یعنی جنگ اور تنازع زندگی کا لازمی حصہ ہے — یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ایک جملہ ہے جو امام حسین علیہ السلام سے منسوب کیا گیا ہے لیکن نہ تو اس کے معنی درست ہیں اور نہ کسی کتاب میں موجود ہے کہ جس کی بنا پر کہا جاسکے کہ یہ جملہ امام حسین علیہ السلام کا ہے۔ اس کے باوجود بھی چالیس یا پچاس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ یہ جملہ لوگوں کی زبانوں پر آنے لگا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

”إِنَّ الْحَيَاةَ عَقِيدَةً وَجِهَادٌ“ یعنی حیات کے معنی عقیدہ رکھنے اور اس عقیدے کی راہ میں جہاد کرنے کے ہیں۔ لیکن یہ اہل مغرب اور فرنگیوں کے خیال سے مطابقت رکھتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ ایک عقیدہ رکھتا ہو اور اپنے اس عقیدے کی راہ میں جہاد بھی کرے۔

قرآن اس سلسلے میں حق کا ذکر کرتا ہے اور قرآن میں مذکور جہاد اور قرآن کے نظریہ حیات کے مطابق زندگی یہ ہے کہ حق پرستی کا طریقہ ہو اور حق کی راہ میں جہاد ہو نہ یہ کہ ایک عقیدہ ہو اور اس ”عقیدے“ کی راہ میں جہاد ہو۔

اس بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقیدہ ممکن ہے کہ حق ہو اور ممکن ہے کہ باطل ہو، کیونکہ وہ ایک بندھن ہے۔

تاہم یہ ایک اور مکتب فکر ہے جو کہتا ہے کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ”عقیدہ“ ایک مقصد اور ایک ممتنع نظر رکھے اور اپنے مقصد کی راہ میں کوشش بھی کرے۔ اب وہ عقیدہ کیا ہو، تو وہ خواہ کچھ بھی ہو، اس کی انتہی کوئی فکر نہیں ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ بڑے پیے تلے ہیں، وہ فرماتا ہے: حق پرستی اور حق کی راہ میں جہاد۔ نہ کہ عقیدہ اور ”عقیدے“ کی راہ میں جہاد، قرآن کا کہنا ہے کہ پہلے تمہیں اپنے عقیدے کی اصلاح کرنی چاہیے۔ یعنی عموماً تمہارا پہلا جہاد خود اپنے عقیدے کے ساتھ ہونا چاہیے تمہیں چاہیے کہ پہلے اپنے عقیدے کے ساتھ جہاد کرو اور پھر درست، صحیح اور سچا عقیدہ اختیار کرو۔ پھر جب تمہیں حق کا پتہ چل جائے تو اس کی راہ میں جہاد کرو۔

بہر حال جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ بنیادی طور پر ”کامل انسان“ کا مطلب ”مقتدر انسان“ اور ”طاقن انسان“ ہے تو اس کی بنیاد بھی تنازع بقار کے اصول پر ہے۔ یہ وہی نظریہ ہے جس پر ڈارون کے فلسفے کی بنیاد قائم ہے اور وہ کہتا ہے کہ زندگی ”تنازع بقار“ ہے۔ چنانچہ حیوانات ہمیشہ اپنے وجود کی بقار کی جنگ کرتے رہتے ہیں اگرچہ اس معاملے میں انسان بھی ایسے ہی ہیں۔

ہم انسان کو اس بنا پر حیوانات کا ہم بلہ نہیں سمجھ سکتے کہ انسان کی زندگی بھی بقا کے لیے جنگ کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ اس قول کے معنی یہ ہیں کہ بقار کے لیے تعاون ہو۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تنازع بقار ہے، ان کا بیان ہے کہ تعاون کو تنازع بقا ہی نے مسلط کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں: اگر یہ بات ہے تو پھر انسانوں کے درمیان یہ اخلاص، یہ تعاون، یہ اتحاد عمل، یہ وحدت اور محبت وغیرہ کیا چیز ہیں؟ وہ کہتے ہیں: آپ نے غلط سمجھا ہے، کیونکہ اسی اخلاص، تعاون، محبت اور دوستی وغیرہ کے نیچے تنازع دبا ہوتا ہے۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسے؟ وہ کہتے ہیں کہ انسانوں کی زندگی میں بنیادی چیز جنگ ہے، لیکن جب ان کا مقابلہ ایک اپنے سے بڑے دشمن کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ ان پر دوستی مسلط کر دیتا ہے۔ یہ دوستی درحقیقت دوستی نہیں ہوتی، خالص نہیں ہوتی، حقیقت نہیں ہوتی اور ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ ایک زیادہ بڑے دشمن کے مقابلے میں انکا اشتراک عمل ہونا ہے جیسے اصطلاح میں THESIS اور ANTITHESIS کہا جاتا ہے۔ جب ایک بڑے دشمن کا سامنا ہو تو محض اس کا مقابلہ کرنے کے

یہ لوگوں میں لغادان اور اخلاص پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ دشمن کو بیچ میں سے ہٹا دیں تو دیکھیں گے کہ یہ لوگ جو متحد تھے بکھر گئے، ان میں گروہ بندی پیدا ہو گئی اور وہ دشمنوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ پھر وہ اسی طرح تحلیل ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ فرد باقی رہ جاتے ہیں۔ جب دو فرد باقی رہ جاتے ہیں اور کوئی تیسرا ان کے مقابلے پر نہیں ہوتا تو وہ آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: تمام دوستیاں، صلحیں، ٹھیکیاں، انسانیتیں، یگانگتیں اور ایک جہتیاں وغیرہ کو انسانوں کی دشمنیاں ہی ان پر مسلط کرتی ہیں۔ بس تنازع اصل ہے اور اتحاد اس کی پیداوار ہے، اس کا پچھلے ہے اور اس کی شاخ ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح مکتب عقل کے مقابل ایک نظریہ تھا کہ جس کا وہ منکر تھا۔ اسی طرح مکتب عشق کے مقابلے میں بھی ایک نظریہ ہے اور اس مکتب کے پیرو اس کے منکر ہیں اور اسے محض خام خیالی قرار دیتے ہیں۔ پھر بعض لوگوں نے قدرت کی اہمیت کو بے حد گھٹایا اور یہ سمجھا کہ بنیادی طور پر انسان کا کمال اس کی کمزوری میں ہے۔ اس مکتب میں کمال انسان سے مراد وہ انسان ہے جو قدرت نہ رکھتا ہو کیونکہ اگر اسے قدرت حاصل ہو تو تجاوز کرتا ہے۔ سعدی کو بھی ایک باغی کہتے ہوئے ایک ایسی ہی بڑی غلط فہمی ہوئی جیکہ وہ کہتے ہیں:

من آن مورم کہ در پائیم بمالند نہ زنبورم کہ از نیشم بمالند  
چکو نہ شکو این نعمت گزارم  
کہ زور مردم آزاری مدارم

۱۵۳

میں بھڑ نہیں کہ میرے ڈنک سے لوگ رویا کریں، بلکہ میں وہ چیونٹی ہوں جسے وہ پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔  
میں خدا کی نعمت کا شکر کیوں کر ادا کروں کہ مجھ میں لوگوں کو تکلیف دینے کی طاقت نہیں ہے۔

(گلستان سعدی - باب سوئم)

نہیں جناب! کیا بیٹے شدہ امر ہے کہ انسان کو چیونٹی بننا چاہیے یا زنبور۔ تاکہ وہ کہے کہ اگر چیونٹی ہونے یا زنبور ہونے کے درمیان انتخاب کرنا ہے تو میں چیونٹی ہونے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ چیونٹی ہو کہ پاتھ اور پاؤں کے نیچے مسیلے جاؤ اور نہ زنبور ہو کہ لوگوں کو ڈنک مارو۔ اس کی بجائے یوں کہنا چاہیے تھا:

نہ آن مورم کہ در پایم بمالند

نہ زنبورم کہ از نیشتم بنالند

چگو نہ شکر اس نعمت گزارم

کہ دارم زور و آزاری ندارم

میں بھڑ نہیں کہ میرے ڈنک سے لوگ رویا کریں، میں وہ

چیونٹی بھی نہیں ہوں کہ جسے وہ پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔

میں خدا کی اس نعمت کا شکر کیوں کر ادا کروں کہ طاقت

رکھتا ہوں اور کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔

شکر کا مقام یہ ہے کہ انسان زور رکھتا ہو لیکن کسی کو تکلیف نہ

پہنچاتا ہو۔ اگر وہ زور نہ رکھتا ہو اور کسی کو تکلیف بھی نہ پہنچاتا ہو تو یہ کوئی

۱۵۴

بڑی بات نہیں ہے۔ وہ سینک نہیں رکھتا کہ کسی کو ان سے مارے لیکن اگر وہ سینک رکھتا اور کسی کو سینک نہ مارتا تو یہ ایک کارنامہ ہوتا۔  
پھر سعدی یہ کہتے ہیں :

بدیدم عابدی در کوہساری  
قناعت کردہ از دنیا بہ غاری  
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی  
کہ باری بند از دل برگشائی  
میں نے ایک عابد کو دیکھا کہ جس نے ایک غار میں پناہ لی  
بہ نئی چادر وہاں عبادت میں مشغول ہے۔  
میں نے اسے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے تاکہ لوگوں  
کی خدمت کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرو۔  
تاہم ایک مقام پر سعدی نے اس کے برعکس بھی کہا ہے :  
صاحب دلی بہ مدرسہ آمد نہ خانقاہ  
یہ شکست عہد صحبت اہل طریق را  
گفتم میان عالم و عابد چہ فرق بود  
تا اختیار کردی از آن این فریق را  
گفت آن بگیم خویش برون می برو ز موج  
این سعی می کنند کہ بگیو غریق را  
ایک عابد خانقاہ سے مدرسہ میں آگیا اور اس نے اہل طریقت کی صحبت  
کا عہد توڑ ڈالا۔



میں نے اس سے پوچھا کہ عابد اور عالم میں کیا فرق ہے کہ تو خالق تہ کو چھوڑ کر مدرسے آگیا ہے۔

اس نے جواب دیا کہ عابد صرف اپنا دامن بچاتا ہے اور عالم گنہگاروں کو نیکی کی طرف لے آتا ہے۔

انہوں نے عالم اور عابد کے فرق کے بارے میں صحیح بات کہی ہے اور یہ جوانوں نے کہا ہے:

میں نے ایک عابد کو دیکھا کہ جس نے ایک غار میں پناہ لی ہوئی ہے۔  
میں نے اسے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے تاکہ لوگوں کی خدمت کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرو۔

جب وہ عابد — سعدی کے جواب میں اپنا عذر پیش کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سعدی بھی اس کا عذر قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بلغت آنجا پیر و یارِ نغمہ  
چو گل بسیار شد پیلایں باغِ زند

وہ کہنے لگا کہ شہر میں بہت سے حسین چہرے ہیں اور حیرت کیچڑ زیادہ ہو تو ہاتھی بھی پھسل پڑتے ہیں۔

یعنی شہر میں حسین لوگ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ میری نگاہ ان پر پڑے اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکوں، اس لیے میں یہاں آگیا ہوں اور میں نے اپنے آپ کو غار کے دامن میں مقید کر لیا ہے۔

انسان کے اس کمال کے کیا کہنے کہ وہ پہاڑوں میں جا کر اپنے آپ کو ایک جگہ مقید کر لیتا ہے تاکہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچا سکے۔ یہ تو کوئی کمال نہ ہوا۔



۱۵۶

جناب سعدی — قرآن مجید نے آپ کے لیے احسن نقص کی داستان نقل کی ہے — قرآن کا بہترین قصہ، یعنی حضرت یوسفؑ کا قصہ!

نحہ اس میں شک نہیں کہ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اور صبر کرے تو وہ ایسے نیکو کاروں کا اجر ہرگز برباد نہیں کرتا۔  
(سورۃ یوسف ۳۰ آیت ۹۰)

خواہش کو پورا کرنے کی تمام شرائط موجود ہیں اور اس کے تمام وسائل اور امکانات بھی فراہم ہیں۔ ادھر محل کے سب دروازے بند ہیں اور فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی آپ اپنی عفت کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے سامنے کے بند دروازوں کو کھول لیتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب آپ کھوارے جوان ہیں اور بے انتہا خوب صورت ہیں لیکن بجائے اس کے کہ آپ عورتوں کا پیچھا کریں، خود عورتیں آپ کے پیچھے آتی ہیں۔ کوئی دن نہیں گزرتا جب سیکڑوں خط اور سیکڑوں پیغام آپ کے لیے نہ آتے ہوں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مصر کی معزز ترین عورتیں آپ پر دل و جان سے عاشق ہو گئی ہیں۔

قرآن یوں درس دیتا ہے کہ شرائط فراہم کر دی گئی ہیں اور آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ کیونکہ آپ سے کہا جاتا ہے: یا تم میری خواہش پوری کرو یا میں تمہیں قتل کروں گی اور تمہارا خون بہاؤں گی۔ تب حضرت یوسف علیہ السلام کیا کرتے ہیں؟ آپ اس نفل سے باز رہتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۵۷

اے میرے پالنے والے! جس بات کی یہ عورتیں مجھ سے  
خواہش رکھتی ہیں، اس کی بہ نسبت قید خانہ مجھے زیادہ  
پسند ہے۔ اگر تو ان عورتوں کے فریب کو مجھ سے دفع  
نہ فرمائے گا تو مبادا میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں۔

(سورہ یوسف: آیت ۳۳)

اے پروردگار! یہ عورتیں مجھے جس چیز کی دعوت دیتی ہیں، اس  
سے میرے لیے قید خانہ بہتر ہے۔ اے خدا! تو مجھے قید خانے بھیج دے اور  
ان عورتوں کے چٹائیوں کو تباہ کر دے۔ اے میرے بھائی! میں شہوت کے عمل کی  
طاقت رکھتا ہوں، لیکن پھر بھی وہ کام نہیں کرتا۔

لہذا انسان کا کمال انسان کی کمزوری میں نہیں ہے۔ ہمارے بہت  
سے ادبی اشعار میں یہ نظر آتا ہے کہ انسان کا کمال اس کی کمزوری میں بتایا  
گیا ہے۔ حتیٰ کہ بابا طاہر عربیان ہمدانی بھی اپنے اشعار میں کہتے ہیں:

زدست دیدہ دل ہر دو فریاد

چراغِ دل کسبِ دل کسبِ یاد

بسازم بیری بیشش ز فولاد

زخمِ بر دیدہ تادل گردد آزاد

میں اپنی آنکھ اور دل کے خلاف فریادی ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں  
دیکھتا ہوں، میرا دل اس چیز کی خواہش کرتا ہے۔ لہذا میں ایک خنجر  
چاہتا ہوں تاکہ اس کے ساتھ اپنی آنکھ پھوڑ دوں اور میرے دل کو سکون  
میسر ہو۔

۱۵۸

اے باباطاہر۔۔۔ بہت خوب! آپ ایک چیز سنتے ہیں اور آپ کا دل اس کی خواہش کرنے لگتا ہے، لہذا آپ کو ایک منجر حاصل کرنا چاہیے تاکہ اپنا کان کاٹ ڈالیں۔

انہوں نے عجیب کامل انسان تیار کیا ہے۔۔۔ باباطاہر کا کامل انسان بڑا شاندار ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو نہ ہاتھ رکھتا ہے نہ پاؤں۔۔۔ نہ کان رکھتا ہے نہ آنکھیں۔۔۔ نہ اعضائے مردانہ رکھتا ہے، غرضیکہ وہ کچھ بھی نہیں رکھتا۔

ہمیں اپنی ادبیات کے کوئی کھدوں میں ایسے ”عجیب“ اور ”ذلیل پرور“ اخلاق ہوتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بشرِ آفرینہ اور غلطی کر جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ تفریط کی حالت میں رہتا ہے۔ جب انسان ان مکاتب فکر کا مقابلہ اسلام کے حقیقی مکتب سے کرتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی اسلام خدا کے علاوہ کسی اور کی جانب سے نہیں آیا۔ کیونکہ سقراط ایک گوشہ لیتا ہے اور غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ افلاطون بھی ایک گوشہ لیتا ہے اور غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ بوعلی سینا ایک گوشہ لیتا ہے اور غلط فہمی میں جا پڑتا ہے۔ محی الدین عربی یا مولوی معنوی بھی ایک گوشہ لیتے ہیں اور غلط فہمی میں گرفتار ہوتے ہیں۔ کارل مارکس ایک گوشہ لیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اسی طرح نطشے، ژان پال سارتر وغیرہ میں سے بھی ہر ایک۔۔۔ اخلاق کا ایک گوشہ لیتا ہے اور غلطی کھاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ ایک بشر ہوں اور انہوں نے اپنی رائے ایک بشر کی سوچ کے ساتھ ظاہر کی ہو اور پھر بھی ان کا مکتب اتنا جامع،

بلند اور ترقی پذیر ہو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مفکرین بچے ہیں اور آنحضرتؐ ایک معلم ہیں جو اپنی بات آخر میں کہتے ہیں اور وہ بات کتنی بلند ہوتی ہے۔  
بہر حال مکتب قدرت بھی ایک مکتب ہے اور مکتبِ عجز اس کے مقابل کا مکتب ہے۔

کامل انسان کے بارے میں ایک اور مکتب بھی ہے، جسے مکتب ”محبت“ کہا جاسکتا ہے اور اسے مکتب ”معرفت“ یعنی ”مَعْرِفَةُ النَّفْسِ“ کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ مشرقی ایشیا میں اب سے چند ہزار سال پہلے بڑے بلند تمیلات موجود تھے۔ اس وقت بھی بہت قدیم ہندی کتابیں موجود ہیں جن کا فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ نیز اُپنیشند بھی موجود ہے جو بہت ہی گرانقدر ہے۔

چند سال پہلے ہمارے بزرگوار استاد علامہ طباطبائی سلمہ اللہ تعالیٰ سے مذکورہ بالا کتاب پڑھی تو وہ اس کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کتابوں میں بڑے بلند مطالب ہیں، جن کی طرف نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے۔

اس مکتب میں انسان کے تمام کمالات کا محور ”خوشناسی“ ہے۔ یعنی اے انسان! اپنے آپ کو پہچان — ہاں پہلے اپنے آپ کو پہچان — سقراط نے بھی کہا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو پہچان! پھر تمام پیغمبروں نے بھی اور پھر پیغمبر اسلامؐ نے بھی فرمایا ہے: اپنے آپ کو پہچان! لکھ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ (غیر الحکم - حرف مبہم)

لیکن اس مکتب میں فقط اسی ایک نکتے پر تکیہ کیا گیا ہے کہ ”اپنے آپ کو پہچان“ مشہور کانگریسی رہنما ایم کے گاندھی کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انکے مقالات اور خطوط شامل ہیں اور اس کا نام ہے ”یہ ہے میرا مذہب“ میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں ایک جگہ گاندھی کہتے ہیں:

میں نے اپنشدوں کے مطالعہ سے تین اصول اخذ کیے ہیں

اور یہ ستر بھر میری زندگی کا دستور العمل رہے ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ فقط ایک حقیقت وجود رکھتی ہے اور وہ نفس کا پہچانتا ہے۔ فارسی ترجمے میں لکھا ہے ”شناختن ذات است“ یعنی ذات کا پہچانتا ہے لیکن ترجمے میں غلطی ہوئی ہے اور وہ غلطی اس لیے ہوئی ہے کہ ذات اور نفس ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ فارسی ترجمے میں لکھا چاہیے تھا۔ ”شناختن نفس“ اسی بنا پر گاندھی فرنگ اور مغرب کی دنیا پر بڑے عمدہ انداز سے حملہ کرتا ہے اور کہتا ہے: فرنگی نے دنیا کو پہچانا اور اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔ چونکہ اس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اس لیے اپنے آپ کو بھی تباہ کیا اور دنیا کو بھی تباہ کر رہا ہے۔ یہاں اس نے عجیب اور غیر معمولی طور پر اعلیٰ انداز میں داؤ سخن دی ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو پہچان لے وہ خدا کو بھی پہچان لیتا ہے اور پھر دوسروں کو بھی پہچان لیتا ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ فقط ایک طاقت وجود رکھتی ہے اور وہ اپنے آپ پر تسلط کی طاقت ہے۔ جو شخص اپنے آپ پر تسلط ہو جائے اس کا

دوسری چیزوں پر تسلط صحیح اور درست ہے۔ یعنی وہ مسلط ہو جاتا ہے اور اس کا مسلط ہونا درست بھی ہوتا ہے۔ نیز فقط ایک نیکی وجود رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے لیے اسی چیز کو دوست رکھے جسے وہ اپنے لیے دوست رکھتا ہے اور دوسروں کے لیے وہی چیز پسند کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

معرفت سے ان کا مقصود معرفتہ النفس (اپنے آپ کو پہچاننا) ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہندی فلسفے میں ”مراقبہ“ یعنی ”اپنے اندر آنے“ کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ اب اس نے سخت ریاضتوں کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس میں مجدد دوسری چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ میں ان کا ذکر نہیں کرتا اور مختصراً کہتا ہوں کہ اس فلسفے کی بنیاد ”نفس کی پہچان“ اور ”مراقبہ“ پر ہے۔

ایک شخص کامل انسان کو ”بے طبقہ انسان“ سمجھتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ جو انسان طبقوں میں اور یا مخصوص اونچے طبقوں میں ہو وہ ہمیشہ ایک معیوب انسان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ طبقاتی مساوات کے لیے کبھی بھی درست اور سالم انسان کا وجود نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک کامل انسان یعنی بے طبقہ انسان وہ انسان ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ ایک جیسی حالت میں زندگی بسر کرے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مکاتب بھی ہیں جو زیادہ تر انسان کی آزادی اور آگاہی کے پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ اس آگاہی میں ان کی بیشتر توجہ انسان کی اجتماعی آگاہی کی جانب ہوتی ہے۔ مثلاً ایگزسٹینشلزم (Existentialism) کا مکتب جو زیادہ تر اجتماعی آزادی

۱۶۲

آگاہی اور ذمہ داری پر دھیان دیتا ہے۔ ان کے نزدیک کامل انسان کے معنی آزاد، آگاہ اور ذمہ دار انسان کے ہیں اور آزادی کا لازمی جز جنگ و جدل ہے کہ جو بجائے خود ایک علیحدہ مکتب ہے۔

## مکتب انتفاع

اس ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ ان مکاتب کے ساتھ ایک اور مکتب فکر بھی وجود رکھتا ہے اور وہ مکتب انتفاع ہے۔ گویا یہ مکتب اور مکتب قدرت کسی حد تک ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس مکتب کا فلسفہ ہے کہ کامل انسان تکمیل ہوتا ہے یا کامل انسان خدا تک پہنچتا ہے۔ یہ سب کچھ کی باتیں ہیں اور صرف فلسفہ بائیاں ہیں۔ نہیں — بلکہ کامل انسان کے معنی انتفاع گیر انسان کے ہیں۔ اگر آپ اپنے انسانی کمال تک پہنچنا چاہتے ہیں تو عالم فطرت سے انتفاع کی کوشش کریں۔ کیونکہ آپ فطرت سے جتنا زیادہ انتفاع کریں گے، اتنے ہی زیادہ کامل انسان ہوں گے۔

لہذا علم کے مورد میں بھی وہ حکمت کو نہیں بلکہ علم کو انسان کا کمال سمجھتے ہیں۔ پھر وہ علم کو بھی فطرت کی پہچان سے تعبیر کرتے ہیں اور فطرت کی پہچان محض اس پر تسلط پانے کے لیے کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ انسان کی خدمت کرے اور وہ اس سے بہرہ مند ہو۔ آخر میں ان کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ انسان کے لیے علم کی اہمیت بھی ذاتی نہیں بلکہ ایک وسیلے کے طور پر ہے یعنی علم انسان کے لیے فطرت پر تسلط پانے اور اسے مسخر کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ کیونکہ جب انسان فطرت کو تسلیم کر لیتا ہے تو اس سے بہتر طور پر بہرہ مند، مستفید اور انتفاع کرتا ہے۔



اگر آپ انسان کو کمال تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کو کشش کریں کہ انسانوں کو فطرت سے انفساخ کے مقام تک لے جائیں۔ اس لیے کہ فطرت سے انفساخ کے علاوہ کسی کمال کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ جو علم کے ذاتی نقصان قدر اور کمال کی باتیں ہیں یہ نمری لفاظی ہے اور علم ایک آلے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ علم انسان کے لیے ایسے ہی ہے جیسے گائے کے لیے سینک، عینے کے لیے پنچے یا خیر کے لیے دانت ہیں۔ مختصر یہ کہ علم انسان کے لیے اس کے ہاتھ میں ایک آلے کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تھان نظریات کا ایک سلسلہ جو کمال انسان کے بارے میں وجود رکھتے ہیں۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کی رائے بیان کریں گے۔ اور بتائیں گے کہ اسلام ”عقل“، ”عشق“، ”قدرت“، ”اجتماعی ذمہ داری“ اور ”بے طبقہ معاشرہ“ وغیرہ کو کیا اہمیت دیتا ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک لمبی چوڑی داستان ہے۔

میں نے پچھلی نشست میں عرض کیا تھا کہ انسان کے کمال کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ وہ موت کا سامنا کیسے کرتا ہے مثلاً جب موت آتی ہے تو وہ کیسے سوچتا ہے اور موت سے کتنا خوفزدہ ہوتا ہے۔ موت کا خوف انسان کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور اس کی بہت سی بد فیسیاں موت کے خوف سے جنم لیتی ہیں۔ یہ موت کا خوف ہی ہے جس کی وجہ سے انسان پستی، ذلت اور ہزاروں دوسری مصیبتیں برداشت کر لیتا ہے۔

اگر کوئی شخص موت سے نہ ڈرے تو اس کی زندگی سرسبز بدل جاتی ہے۔ چنانچہ عظیم اور بہت ہی عظیم انسان وہ ہوتے ہیں جو موت کا سامنا کرنے

۱۶۴

وقت انتہائی دلاوری کے ساتھ اور اس سے بھی بڑھ کر خندہ پیشانی کے ساتھ موت کو گلے لگاتے ہیں، لیکن اس موت کو جو خودکشی نہ ہو بلکہ کسی ہدف کی خاطر ہو، کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تبلیغ حق اور فرض کی ادائیگی میں شہادت خوش آئند ہے۔

۳؎ میری نظر میں یہ موت خوش نصیبی ہے اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا ایک اذیت ہے۔ (حسین بن علیؑ)  
اولیاء حق کے علاوہ اس طرح موت کا سامنا کرنے کا دعویٰ کوئی نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کے علاوہ کہ بن کے بے موت ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہونے یا امام حسین علیہ السلام کی نجیر کے مطابق ایک پل عبور کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ صبح عاشور آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:  
۴؎ موت ایک پل کے علاوہ کچھ نہیں جس پر سے تم گزر رہے ہو۔

اے میرے ساتھیو! ہمارے لیے ایک پل ہے۔ جس پر سے ہمیں گزرنا ہے اور اس کا نام موت ہے۔ جب ہم اس پل پر سے گزر جائیں گے تو ایک ایسی جگہ پہنچیں گے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جوں جوں موت نزدیک آرہی تھی، آپ کا چہرہ اتنا ہی بشاش ہوتا جاتا تھا۔  
ایک شخص عمر سعد کے ہمراہ اور واقعات کو بلا کار پور ٹرٹھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور امام حسینؑ شہید ہوئیوالے تھے۔ ان آخری لمحات میں ان پیشہ ور نیک لوگوں کی طرح جو ایسے مواقع پر ثواب کا کام کرتے ہیں۔ جب انہیں کوئی رحمت نہ اٹھانی پڑے۔ اس نے عمر سعد سے درخواست کی اور کہا:

۱۶۵

اب میں حسینؑ ابن علیؑ کو پانی پلاؤں یا نہ پلاؤں۔ انہیں شہید تو ہو ہی جانا ہے  
 انہا مجھے اجازت دو کہ میں ان کے لیے کچھ پانی لے جاؤں، اگرچہ اسکا انہیں  
 کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ لیکن جب وہ پانی لے کر گیا تو وہ ازلی اور ابدی لعین  
 (شمر) امام علیہ السلام کا مقدس سر لیے ہوئے واپس آ رہا تھا۔ جو شخص امامؑ  
 کے لیے پانی لایا تھا وہ کتنا ہے:

۱۔ امام علیہ السلام کے چہرے کی بشاشت نے مجھے  
 فرصت نہ دی کہ میں ان کے مارے جانے کے متعلق سوچوں  
 — یعنی اس عالم میں کہ آپ کا سر کٹا ہوا تھا۔ پھر  
 بھی آپ کا چہرہ بشاشت تھا.....

میں کامل انسان وہ شخص ہے جس کے چہرے پر ہر دنیٰ حوادث کا کوئی  
 اثر نہ ہو۔ علیؑ وہ انسان ہیں جو اجتماعی مراحل اور مراتب کے لحاظ سے سب سے  
 نچلے درجے پر ہیں۔ یہ سب سے نچلا درجہ کیا ہے؟ اقتصادِ نقطہ نگاہ سے  
 سب سے نچلا درجہ محنت، مزدوری کا ہے۔ یعنی وہ حالت کہ جب انسان  
 محنت کرتا ہے اور اس کی ہجرت لیتا ہے۔ چنانچہ امام علیؑ اسلام ہی ایک  
 ایسے شخص ہیں جو مزدوری کرتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں کہ ان کے پاس  
 کچھ نہ تھا۔ نہیں۔ بلکہ علیؑ کے پاس جو کچھ ہوتا، حتیٰ کہ جنگی غنائم  
 بھی خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ پھر دوسرے ہی دن کام کے لیے  
 تشریف لے جاتے اور محنت سے روزی کماتے تھے۔

وہ تو نچلے درجے کا تذکرہ۔ اب دیکھیے کہ معاشرتی مراحل میں  
 سب سے اونچا مرحلہ حکومت اور خلافت کا ہے۔ یہ تاریخ ہے بقول علیؑ لوری

جو کہتے ہیں: علیؑ نے کارل مارکس کا فلسفہ الٹ دیا۔ کیونکہ آپ جس طرح محل میں سوچتے تھے، جھوٹیڑیوں میں بھی اسی طرح سوچتے تھے۔ یعنی آپ کی سوچ میں جھوٹیڑے اور محل کی اقامت سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

وہ کہتے ہیں: علیؑ محنت مزدوری کرتے ہوئے بھی ویسے ہی سوچتے تھے۔ جیسے خلافت کے عہدے پر ہوتے ہوئے سوچتے تھے۔ پس اسی بنا پر انہیں ”کامل انسان“ کہا جاتا ہے۔

ہم یہاں کس چیز کے لیے جمع ہوئے ہیں؟ یہاں ہم ایک کامل انسان کا سوگ منانے بیٹھے ہیں۔ لیجیے، اب سنیے کہ علیؑ کورات کے وقت دفن کیا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ جس طرح آپ غیر معمولی طور پر مخلص دوست رکھتے تھے اسی طرح آپ کے بدترین دشمن بھی تھے۔ ہم نے اپنی کتاب جاذبہ دافعہ میں بتایا ہے کہ ایسے انسان جہاں غیر معمولی طور پر قوی کشش رکھتے ہیں وہاں اسی نسبت سے رد کرنے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ وہ انتہائی مخلص دوست رکھتے ہیں، جو ان پر جان قربان کر دینا معمولی بات سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ دشمن بھی ایسے رکھتے ہیں جن سے زیادہ تو خوار خوار ڈھونڈے نہیں ملتے۔ ان دشمنوں میں بالخصوص داخلی دشمن یعنی تقدس مآب دشمن خوارج تھے۔ جو واقعی اعتقاد سے آراستہ اور ایمان ہوتے ہوئے بھی بڑے جاہل تھے۔ ان کے متعلق خود علیؑ نے اعتراف کیا تھا کہ وہ مومن تو ہیں مگر ہیں جاہل! آپ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: آپ خوارج دماقین، اور معادیہ کے ساتھیوں (قاسطین) کا آپس میں مقابلہ کرتے اور فرماتے ہیں:

۴۷ ان (خوارج) کو میرے بعد ذلت نہ کرنا کیونکہ یہ ان (معاویہ کے

۱۶۷

ساتھیوں، سے مختلف ہیں۔ یہ حق چاہتے ہیں لیکن احمق ہیں جب کہ وہ حق کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر حق کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔

علیؑ کے اتنے دوست ہوتے ہوئے بھی انہیں رات کو خفیہ طور پر کیوں دفن کیا گیا؟ ہاں — آپ کے جسد مبارک کو خوارج کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ علیؑ مسلمان نہیں ہیں اور اس بات کا خطرہ تھا کہ مبادا وہ رات کے وقت آپ کی قبر کھود ڈالیں اور آپ کی میت باہر نکال لیں۔

امام علیؑ علیہ السلام شہید ہوئے اور امام صادق علیہ السلام میں وفات پائی۔ چنانچہ اس واقعہ سے پورے سو سال بعد — یعنی امام صادقؑ کے آخری دور تک سوائے ائمہ علیہم السلام اور کچھ اصحاب کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ علیؑ کو کہاں دفن کیا گیا ہے۔

رمضان کی ۲۱ ویں رات کو امام حسن علیہ السلام نے خازنہ کی ایک شہید بنا کر اسے آراستہ کیا اور فرمایا: اس کو مدینہ لے جاؤ اور وہاں دفن کر دو۔ تب عام لوگوں نے تیار کیا کہ امام علیؑ علیہ السلام کو یہاں سے مدینہ لے جا کر دفن کیا گیا ہے۔ پھر اس رات فقط علیؑ کی اولاد اور کچھ خاص شیعوں نے آپ کو دفن کرنے کے کام میں شرکت کی۔ اس کے بعد وہ لوگ کبھی کبھی آتے اور کوفہ کے نزدیک موجودہ مقام پر اپنے مولا کے مدفن کی زیارت کرتے تھے۔ امام صادقؑ کے زمانے میں خوارج کا خاتمہ ہو گیا اور وہ خطرہ دور ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے صفوان (دعائے غلقہ کے ناقل) کو حکم دیا کہ وہ مدفن علیؑ کی جگہ پر

بطور علامت ایک چھپر بنا دے۔ اس کے بعد سب کو معلوم ہو گیا کہ علیؑ کا مدفن کہاں ہے۔ نب اور لوگ اپنے امیر المومنینؑ کے مقبرے کی زیارت کے لیے نجف اشرف آنے لگے اور آتے رہیں گے۔

ہمارے مولا کے جنازے کے ساتھ ساتھ تھوڑے سے لوگ تھے جن میں آپ کے چند اصحاب شامل تھے۔ ان میں سے ایک بزرگوار معصوم بن صوحان ہیں جو امیر المومنینؑ کے خاص اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ وہ بڑے اچھے خطیب تھے اور امیر المومنینؑ کے حضور اشعار پڑھا کرتے تھے۔ چاہد نے اسیان میں ان کے بارے میں کچھ واقعات نقل کیے ہیں۔

میں اس سے زیادہ ذکر مصائب نہیں کر سکتا اور انہیں چند جھٹکوں پر اکتفا کروں گا۔ پس جس وقت امام علیؑ کو دفن کیا گیا تو سب پر غیر معمولی غم و اندوہ طاری ہو گیا اور مارے غم کے ان کے گلے رندھے ہوئے تھے۔ دریں اثنا معصوم اس حال میں آگے بڑھے کہ ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ انہوں نے مولا علیؑ کی قبر سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اپنے سر پر ڈال لی۔ پھر انہوں نے ایسا ہاتھ اپنے دل پر رکھا اور اپنے شہید امامؑ سے یوں خطاب ہوئے:

اے میرے مولا! آپ نے کتنی سعادت مند زندگی گزاری اور کتنے سعادت مند ہو کر اس دنیا سے گئے۔

آپ کی ولادت خدا کے گھر میں ہوئی اور آپ خدا کے گھر میں ہی شہید ہوئے۔ یا علیؑ! آپ کتنے عظیم تھے اور ہم سب لوگ کتنے کمتر ہیں۔ اگر لوگ آپ کے منصوبوں پر عملدرآمد کرتے تو یہ عالم ہوتا:

اے یہ یعنی ان کے لیے زمین و آسمان سے (مادی اور روحانی)

۱۶۹

نفتیس بڑی کثرت سے آتیں۔

لیکن افسوس کہ لوگوں نے آپ کی قدر نہ پہچانی اور بجائے اس کے کہ آپ کے احکام پر عمل کرتے۔ انہوں نے آپ کو بے انتہا دکھ دیے۔ پھر آخر کاریہ ہوا کہ انہوں نے آپ کو پھٹے ہوئے سر کے ساتھ قبر اور مٹی کی جانب روانہ کر دیا۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

ۛ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْ مُحَمَّدٍ ۛ آلِہ الطَّاهِرِیْنَ



## چھٹی نشت

### کامل انسان اور مختلف نظریات (۱)

اے وہی خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول (محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔

(سورہ فتح - آیت ۲)

قدما کی اصطلاح میں ”کامل انسان“ اور آجکل کی اصطلاح میں ”مثالی انسان“ کی پہچان بڑی لازم اور ضروری ہے۔ ہر مکتب فکر میں تربیت اور اخلاق کا نظام اس کے نقطہ نظر سے ”کامل انسان“ یا ”مثالی انسان“ کی پہچان پڑی ہے۔ کامل انسان کے بارے میں انسان کی رائے جاتے کے لیے ہم مجبور ہیں کہ اس سلسلے میں جو مکاتیب فکر موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کا جائزہ لیں، اس پر تفصیلی بحث کریں اور پھر ہر ایک کے منفعت اسلام کا نقطہ نظر بیان کریں۔ مگر ششہ

رات میں نے مجل طور پر مختلف مکاتب کا ذکر کیا تھا اور آج رات ہم مکتب عقل کے نظریات سے اپنی بحث شروع کرتے ہیں :

میں نے عرض کیا تھا کہ قدیم فلاسفوں کے عقیدے کے مطابق انسان کا بنیادی جوہر اس کی عقل ہے۔ جس طرح انسان کا بدن اس کی شخصیت کا جزو نہیں اسی طرح اس کی روحانی اور نفسیاتی قوتوں اور صلاحیتوں میں سے کوئی بھی اس کی حقیقی شخصیت کا جزو نہیں ہے۔ انسان کی حقیقی شخصیت اس کی وہی قوت ہے جو سوچتی ہے اور وہی سوچنے والا ”انسان“ ہے۔ یعنی وہ جو سوچتا ہے نہ وہ جو دیکھتا ہے۔۔۔ جو چیز دیکھتی ہے وہ اس سوچنے والی ہستی کا ایک آلہ ہے۔۔۔ نہ وہ جو تخیل کا عمل کرتا ہے کیونکہ وہ بھی اس سوچنے والے کا ایک آلہ ہے۔ اسی طرح مثلاً وہ عنصر بھی حقیقی انسان نہیں جو کسی کو چاہتا ہے، دوست رکھتا ہے یا ستھوت اور غصہ رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان کا اصلی جوہر سوچنا ہے اور کامل انسان وہ ہے جو سوچنے میں کمال کی حد تک پہنچ گیا ہو۔ پھر سوچنے میں کمال کی حد تک پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جہاں ہستی جو جیسا کہ وہ ہے۔۔۔ دریافت اور معلوم کر لیا ہو۔

اس مکتب میں کچھ اور چیزیں بھی قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ انسان کا حقیقی جوہر اور خوبی اس کی عقل ہے۔ دوسری یہ کہ عقل ایک ایسی قوت ہے جو اس بات کی قدرت رکھتی ہے کہ دنیا کو جیسی کہ وہ ہے دریافت کرے اور دنیا کی حقیقت کو کما حقہ اپنے اندر منعکس کرے۔ گویا کہ وہ ایک آئینہ ہے جو دنیا کی شکل کو اپنے اندر صحیح اور درست طور پر منعکس کر سکتا ہے جن اسلامی حکماء نے یہ نظریہ قبول کر لیا ہے۔ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ

اسلامی ایمان یعنی وہ ایمان جو قرآن میں آیا ہے یہی ہے۔ یعنی یہ دنیا جیسی کہ وہ ہے اس کی عام طور پر پہچان، دنیا کی مبداء کی پہچان، دنیا کی روش کی پہچان، دنیا کے نظام کی پہچان اور اس بات کی پہچان کہ دنیا کس نقطے کی جانب لوٹ رہی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ جو قرآن میں خدا پر ایمان اور خدا کے فرشتوں پر ایمان کہ جو وجود کے واسطے اور مرحلے ہیں، نیز دنیا کے مخلوق ہونے اور اس بات پر ایمان کہ خدا نے دنیا کو پورے نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ اس نے دنیا کی رہنمائی کی۔ اور بنی نوع انسان کی رہنمائی ابدی کے ذریعے کی ہے۔ علاوہ ازیں اس بات پر ایمان کہ ہر چیز خدا کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لیے کہ وہ خدا کی طرف سے آئی ہے اور خدا کی طرف ہی واپس جاتی ہے۔ اسی کا نام معاوہ ہے۔ یعنی جس معاوہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ یہی ہے اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ان حکماء نے اپنی تفاسیر میں ایمان کی تفسیر ایک معرفت، پہچان اور حکمت کی شکل میں کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایمان کے معنی پہچان کے ہیں۔ لیکن دنیا کی یہ پہچان ایک فلسفیانہ اور حکیمانہ پہچان ہے، یہ علمی پہچان نہیں کہ جو ایک ادھوری پہچان ہوتی ہے، فلسفیانہ، کامل اور حکیمانہ پہچان کے معنی یہ ہیں کہ ہم دنیا کے میدان اور مفتاح، ہستی کے مراتب اور دنیا کے پورے طرزِ عمل کو دریافت کریں اور جان لیں۔ چنانچہ ایسے مکاتبِ فکر ہیں جو ہمیشہ عقلیت پسندوں کے اس مکتب کے خلاف برسرِ پیکار رہے ہیں۔ چنانچہ وہ پہلا مکتب جو ان کی ضد ہے اور جس نے اسلام کے دور میں ان کے خلاف جنگ کی۔ وہ مکتب اشراق یعنی ”عرفاء“ اور

”اہل عشق“ کا مکتب ہے جس کی تشریح ہم بعد میں کریں گے۔

ایک اور مکتب ”اہل حدیث“ کا ہے کہ اخباری اور اہل حدیث عقل کی اس اہمیت سے انکار کرتے ہیں جو انہوں نے اسے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل کو وہ قدر و قیمت حاصل نہیں جو تم اسے دیتے ہو۔ اس کے بعد گویا کہ جدید دور میں عقلیت پسندوں کے مقابلے پر مکتب حس یعنی ”مکتب حسوں“ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور گزشتہ تین چار صدیوں میں اس مکتب نے کافی ترقی کر لی ہے۔ حسوں آئے اور انہوں نے کہا: عقل وہ قدر و قیمت نہیں رکھتی جس کا تم اسے اہل سمجھتے ہو۔ ہاں عقل کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ وہ حس کی تابع ہے اور انسان میں بنیادی چیز اس کے حواس اور محسوسات ہیں۔ انسان کی عقل زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ حواس اسے جس بات سے زیادہ آگاہ کرتے ہیں وہ اس کے بارے میں کوئی کام انجام دیتی ہے۔

آپ ایک کارخانے کو لیں جس میں کچھ خام مواد لایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کارخانے کی مشینری اس خام مواد کا تجزیہ کرتی ہے۔ مثلاً اگر وہ روئی کاٹنے اور کپڑے بنانے کا کارخانہ ہے تو پچھلے روئی صاف لی جائے گی، پھر سوت کاٹا جائے گا اور بعد میں اسے ایک خاص کپڑے کی شکل میں بنا جائے گا۔ عقل بھی ایک کارخانہ ہے جس سے سوائے اس کے کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ حواس کے راستے سے اس کو جو خام مواد ملے وہ اس پر کچھ کام انجام دیتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عقلیت پسندوں کا مکتب پورے طور پر اعتبار سے نہیں گرا بلکہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ تاہم بالفعل ہم عقلیت پسندوں اور دوسرے مکتب کا باہم موازنہ کرنا ان کا تفصیلی مطالعہ کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہمیں یہاں

اسلام کا نظریہ بیان کرنا ہے۔

عقلیت پسندوں کے مکتب میں کچھ باتیں پائی جاتی ہیں جن پر ہم ایک ایک کر کے نظر ڈالنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ اسلام کے نظریے سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں؟

عقلیت پسندوں کی پہلی بحث اور نظریہ ”عقلی معرفت کا اعتبار اور اصالت“ ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ انسانی عقل اس بات پر قادر ہے کہ اس دنیا کے حقائق دریافت کر سکے اور عقلی زبان ہی حقیقی بیان اور قابل اعتماد و قابل استناد ہے۔ تاہم بہت سے دوسرے مکاتب ہیں جو عقل کو اس قدر معتبر نہیں سمجھتے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا اسلامی علوم سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ عقل معتبر ہے یا نہیں؟ چنانچہ اسلامی علوم میں ہمیں عقل کے لیے ایسی غیر معمولی حاکمیت نظر آتی ہے جو دنیا کے کسی دوسرے دین میں دکھائی نہیں دیتی۔ یعنی دوسرے ادیان کی جانب سے عقل اور عقل کے سند حجت اور معتبر ہونے کی حمایت نہیں کی گئی۔

آپ اسلام کا مقابلاً مسیحیت سے کوہاں لکھیں کہ مسیحیت

ایمان کی قلمرو میں عقل کی دخل اندازی کے سنی قابل نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جہاں انسان کو کسی چیز پر ایمان لانا ہو، وہاں وہ سوچنے کا حق نہیں رکھتا۔ کیونکہ سوچنا عقل کا کام ہے اور وہ ان مسائل میں دخل اندازی کا حق نہیں رکھتی۔ جس چیز پر ایمان رکھنا ضروری ہو، اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیے اور عقل کو چون و چرا کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

ایک با ایمان پادری اور لوگوں کے ایمان کے محافظ کا فرض یہ ہے کہ

وہ عقل کی سوچ بچار اور استدلال کے ایمان کی قلمرو میں داخل دینے کا سدباب کرے  
— اور درحقیقت یہی مسیحی تعلیمات کی بنیاد ہے۔

لیکن اسلام میں اس معاملے کی صورت اصلاً اس کے برعکس ہے۔ اسلام  
میں عقل کے علاوہ کسی چیز کو اصول اسلام اور اصول دین میں مداخلت کا  
حق نہیں ہے۔ یعنی اگر آپ سے اصول دین میں سے ایک کے بارے میں  
پوچھا جائے تو آپ کہیں گے کہ وہ خدائے بگائے کے وجود کی توحید ہے۔ پھر  
اگر پوچھا جائے کہ آپ کس دلیل کی بنا پر ایمان لائے ہیں تو اسلام آپ سے  
عقل کی راہ کے علاوہ کوئی اور راہ قبول نہیں کرتا۔ اگر آپ کہیں کہ یہ میں نہیں  
جاتا اور میں نے اثر قبول کیا ہے کہ خدا ایک ہے، میرے پاس اس کی کوئی  
دلیل بھی نہیں اور آپ کو اس سے کیا غرض؟ آپ نتیجے کو لیں۔ — مبادی  
سے آپ کا کیا کام؟ میں نے اپنی دادی کے قول پر اعتبار کیا ہے اور پھر میں  
نے ایک حقیقت کے بارے میں خود یقین پیدا کیا ہے۔ اب خواہ وہ یقین  
دادی اماں کے قول سے ہو یا میں نے خواب دیکھا ہو یا اپنے باپ دادا سے سنا  
ہو۔ اسلام کہتا ہے: نہیں۔ جس اعتقاد کی بنیاد خواب، تقلید یا معاشرے  
کے اثر پر ہو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ پس سوائے ایسی تحقیق کے جس میں عقل  
نے دلیل اور برہان کے ساتھ مطالب کو دریافت کیا ہو، یہاں کوئی دوسری  
چیز قبول نہیں ہے۔

مسیحیت کے اصول ایمان — عقل کے داخلے کی حد تک ایک ممنوعہ  
علاقہ ہیں اور ایک مسیحی پادری کا فرض ہے کہ وہ عقلی اور فکری قوتوں کے حملے  
سے اس علاقے کی حفاظت کرے لیکن اسلام میں ایمان کا علاقہ ایک

ایسا علاقہ ہے جو عقل کے لیے مخصوص اور اس کے اختیار میں ہے۔ حسی کے عقل کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس علاقے میں داخلے کا حق نہیں رکھتی۔ اسلامی مآخذ میں اس موضوع پر غیر معمولی طور پر بلند اور عمیق باتیں کہی گئی ہیں۔

سب سے پہلے قرآن مجید ہے جو ہمیشہ عقل کی بات کرتا ہے اور شاید آج رات میں اس بات میں کامیاب ہو جاؤں کہ ایک حدیث کے ضمن میں قرآن کی چند آیات پڑھوں۔ یعنی امام موسیٰ کاظم ؑ کی وہ حدیث پڑھوں جس میں قرآن سے استنباط کرتے ہوئے عقل کی اصالت بیان کی گئی ہے۔ انشاء اللہ۔ علاوہ ازیں ہماری روایات اور احادیث میں عقل کو اتنا بڑی اور اہم گردانا گیا ہے کہ جب آپ حدیث کی کتابیں کھولیں تو دیکھیں گے کہ ان کا پہلا باب ہی ”کتاب العقل“ ہے۔ مثلاً اگر آپ اصول کافی کو دیکھیں تو اس کی پہلی کتاب ”کتاب العقل“ ہے۔ چنانچہ کتاب العقل میں آپ اول سے آخر تک دیکھیں گے کہ اہل تشیع کی احادیث عقل کی حمایت کرتی ہیں۔ اس ذیل میں امام موسیٰ کاظم ؑ کی ایک ایسی تعبیر ہے جو غیر معمولی طور پر عجیب ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

خدا کی دو جہتیں ہیں۔ اس کے دو پیغمبر ہیں۔ ایک پیغمبر باطنی ہے، وہ انسان کی عقل ہے اور دوسرا پیغمبر ظاہری ہے۔

(اصول کافی جلد ۱ کتاب العقل والجمل)

ظاہری پیغمبر انسانوں میں سے ہیں اور انہوں نے لوگوں کو دعوت دی ہے۔ چنانچہ خدا کی دو جہتیں ہیں اور یہ دونوں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں یعنی اگر عقل ہوا اور نبیارت ہو تو انسان اکیلا اپنی خوشنختی کا راستہ



طے نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر انبیاء ہوں، مگر انسان عقل نہ رکھتا ہو تو بھی وہ خوش قسمتی کے راستے تک نہیں پہنچ پاتا۔ گویا کہ عقل اور پیغمبر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک کام انجام دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر عقل کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس اس قسم کی بہت زیادہ تقبیریں ہیں۔ مثلاً ”عقل مند کا سوتا جاہل کی عبادت سے بہتر ہے“ ”عقل مند کا کھانا جاہل کے روزہ رکھنے سے بہتر ہے“ ”عقل مند کی خاموشی اور سکون جاہل کی حرکت سے بہتر ہے“ نیز خدا نے کوئی پیغمبر معصوم نہیں کیا مگر یہ کہ پہلے اس کی عقل کو اس طرح کمال کی حد تک پہنچا کر اس کی عقل اس کی ساری امت سے زیادہ کامل تھی۔

ہم رسول اکرمؐ کو ”عقل کل“ کہتے ہیں اور یہ بات مسیحیت کے ذوق کے ساتھ ہرگز مطابقت نہیں رکھتی۔ درحقیقت مسیحیت میں عقل اور دین کا دائرہ الگ الگ ہے جبکہ ہم آنحضرتؐ کو ”عقل کل“ کہتے اور سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر شناخت کے عمل میں عقل کی اصالت یعنی حیثیت عقل کے معنی یہ ہیں کہ عقل ایک صحیح معرفت حاصل کر سکتی ہے۔ لہذا اسلام اس مطلب کی قطعی طور پر تائید کرتا ہے جو حکما بر کے نظریے کا ایک حصہ ہے۔

فلسفیوں کے نقطہ نگاہ کے مطابق انسان کا جوہر فقط اس کی عقل ہے اور باقی سب آلے اور وسیلے اس کے طفیلی ہیں۔ اگر بدن دیا گیا ہے تو یہ عقل کے لیے ایک آلہ ہے۔ اگر آنکھیں دی گئی ہیں، کان دیے گئے ہیں، حافظہ دیا گیا ہے اور تحریک کی قوت دی گئی ہے، غرض کہ جو قوتیں اور استعدادیں ہمارے وجود میں ہیں، وہ ہماری ذات کے لیے آلے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہماری ذات

وہ عقل کی سوچ بچار اور استدلال کے ایمان کی قلمرو میں داخل دینے کا سدباب کرے  
 اور درحقیقت یہی مسیحی تعلیمات کی بنیاد ہے۔

لیکن اسلام میں اس معاملے کی صورت اصلاً اس کے برعکس ہے۔ اسلام  
 میں عقل کے علاوہ کسی چیز کو اصول اسلام اور اصول دین میں مداخلت کا  
 حق نہیں ہے۔ یعنی اگر آپ سے اصول دین میں سے ایک کے بارے میں  
 پوچھا جائے تو آپ کہیں گے کہ وہ خدائے بگائے کے وجود کی توحید ہے۔ پھر  
 اگر پوچھا جائے کہ آپ کس نبی کی بنیاد پر ایمان لائے ہیں تو اسلام آپ سے  
 عقل کی راہ کے علاوہ کوئی اور راہ قبول نہیں کرتا۔ اگر آپ کہیں کہ یہ میں نہیں  
 جانتا اور میں نے اس کو قبول کیا ہے کہ خدا ایک ہے، میرے پاس اس کی کوئی  
 دلیل بھی نہیں اور آپ کو اس سے کیا غرض؟ آپ نتیجے کو لیں۔ مبادی  
 سے آپ کا کیا کام؟ میں نے اپنی دادی کے قول پر اعتبار کیا ہے اور پھر میں  
 نے ایک حقیقت کے بارے میں خود یقین پیدا کیا ہے۔ اب خواہ وہ یقین  
 داری اماں کے قول سے ہو یا میں نے خواب دیکھا ہو یا اپنے باپ دادا سے سنا  
 ہو۔ اسلام کہتا ہے: نہیں۔ جس اعتقاد کی بنیاد خواب، تقلید یا معاشرے  
 کے اثر پر ہو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ پس سوائے ایسی تحقیق کے جس میں عقل  
 نے دلیل اور برہان کے ساتھ مطالب کو دریافت کیا ہو، یہاں کوئی دوسری  
 چیز قبول نہیں ہے۔

مسیحیت کے اصول ایمان۔ عقل کے داخلے کی حد تک ایک ممنوعہ  
 علاقہ ہیں اور ایک مسیحی پادری کا فرض ہے کہ وہ عقلی اور فکری قوتوں کے حملے  
 سے اس علاقے کی حفاظت کرے۔ لیکن اسلام میں ایمان کا علاقہ ایک

ایسا علاقہ ہے جو عقل کے لیے مخصوص اور اس کے اختیار میں ہے۔ حشری کہ عقل کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس علاقے میں داخلے کا حق نہیں رکھتی۔ اسلامی مآخذ میں اس موضوع پر بغیر معمولی طور پر بلند اور عمیق باتیں کہی گئی ہیں۔

سب سے پہلے قرآن مجید ہے جو ہمیشہ عقل کی بات کرتا ہے اور شاید آج رات میں اس بات میں کامیاب ہو جاؤں کہ ایک حدیث کے ضمن میں قرآن کی چند آیات پڑھوں۔ یعنی امام موسیٰ کاظمؑ کی وہ حدیث پڑھوں جس میں قرآن سے استدلال کرتے ہوئے عقل کی اصالت بیان کی گئی ہے۔ انشاء اللہ۔

علاوہ ازیں ہماری روایات اور احادیث میں عقل کو اتنا عبادی اور اہم گردانا گیا ہے کہ جب آپ حدیث کی کتابیں کھولیں تو دیکھیں گے کہ ان کا پہلا باب ہی ”کتاب العقل“ ہے۔ مثلاً اگر آپ اصول کافی کو دیکھیں تو اس کی پہلی کتاب ”کتاب العقل“ ہے۔ چنانچہ کتاب العقل میں آپ اول سے آخر تک دیکھیں گے کہ اہل تشیع کی احادیث عقل کی حمایت کرتی ہیں۔ اس ذیل میں امام موسیٰ کاظمؑ کی ایک ایسی پیغمبر ہے جو بغیر معمولی طور پر عجیب ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

خدا کی دو جہتیں ہیں۔ اس کے دو پیغمبر ہیں۔ ایک پیغمبر باطنی ہے، وہ انسان کی عقل ہے اور دوسرا پیغمبر ظاہری ہے۔

(اصول کافی جلد ۱ کتاب العقل والجہل)

ظاہری پیغمبر انسانوں میں سے ہیں اور انہوں نے لوگوں کو دعوت حق دی ہے۔ چنانچہ خدا کی دو جہتیں ہیں اور یہ دونوں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں یعنی اگر عقل ہو اور انبیاء نہ ہوں تو انسان اکیلا اپنی خوش بختی کا راستہ

طے نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر انبیاء ہوں، مگر انسان عقل نہ رکھتا ہو تو بھی وہ خوش قسمتی کے راستے تک نہیں پہنچ پاتا۔ گویا کہ عقل اور پیغمبر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک کام انجام دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر عقل کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس اس قسم کی بہت زیادہ تعبیریں ہیں۔ مثلاً ”عقل مند کا سوتا جاہل کی عبادت سے بہتر ہے“ ”عقل مند کا کھانا جاہل کے روزہ رکھنے سے بہتر ہے“ ”عقل مند کی خاموشی اور سکون جاہل کی حرکت سے بہتر ہے“ نیز خدا نے کوئی پیغمبر مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ پہلے اس کی عقل کو اس طرح کمال کی حد تک پہنچا جائے کہ اس کی عقل اس کی ساری امت سے زیادہ کامل تھی۔

ہم رسول اکرمؐ کو ”عقل کل“ کہتے ہیں اور یہ بات مسیحیت کے دوق کے ساتھ ہرگز مطابقت نہیں رکھتی۔ درحقیقت مسیحیت میں عقل اور دین کا دائرہ الگ الگ ہے جبکہ ہم آنحضرتؐ کو ”عقل کل“ کہتے اور سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر شناخت کے عمل میں عقل کی اصالت یعنی حجت عقل کے معنی یہ ہیں کہ عقل ایک صحیح معرفت حاصل کر سکتی ہے۔ لہذا اسلام اس مطلب کی قطعی طور پر تائید کرتا ہے جو حکما کے نظریے کا ایک حصہ ہے۔

فلسفیوں کے نقطہ نگاہ کے مطابق انسان کا جو ہر فقط اس کی عقل ہے اور باقی سب آلے اور وسیلے اس کے طفیل ہی ہیں۔ اگر بدن دیا گیا ہے تو یہ عقل کے لیے ایک آلہ ہے۔ اگر آنکھیں دی گئی ہیں، کان دیے گئے ہیں، حافظہ دیا گیا ہے اور تخیل کی قوت دی گئی ہے، غرض کہ جو قوتیں اور استعدادیں ہمارے وجود میں ہیں، وہ ہماری ذات کے لیے آلے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہماری ذات

عقل ہے۔

کیا ہم اسلام کے حوالے سے اس مطلب کی تائید کر سکتے ہیں؟ نہیں! ہمیں اس بات کی تائید اسلام سے نہیں مل سکتی کہ انسان کا جوہر فقط عقل ہے اور بس۔ بلکہ اسلام ان دوسرے نظریوں کی تائید کرتا ہے جن کے مطابق عقل انسان کا تمام وجود اور تمام ہستی نہیں اور یہ اس کے وجود کی ایک شاخ ہے۔

اب ہم دوسرے مطالب کی جانب آتے ہیں۔

عمرامہارے فلسفے کی کتابوں حتیٰ کہ ملا صدرا کی کتابوں میں کہ جہتوں نے ان میں کسی حد تک عارفوں کا ذوق بھی داخل کر دیا ہے۔ یہ بات موجود ہے کہ اسلامی ایمان کی تفسیر فقط ”پہچان“ سے کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے معنی ”پہچان“ کے ہیں اور بس۔ یعنی خدا پر ایمان کے معنی خدا کی پہچان کے ہیں، پیغمبر پر ایمان کے معنی پیغمبر کی پہچان کے ہیں، فرشتوں پر ایمان کے معنی فرشتوں کی پہچان کے ہیں اور یوم آخر (معاد) پر ایمان کے معنی بھی معاد کی پہچان کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں ایمان کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے معنی معرفت اور پہچان کے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ اور مراد نہیں ہے۔ تاہم یہ بات کسی بھی وجہ سے اس بات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی جو اسلام کہتا ہے۔ اسلام میں ایمان ”پہچان“ سے بڑھ کر ایک حقیقت ہے۔ اب آپ اس بات کی طرف توجہ فرمائیں:

پہچاننے کا مطلب جاننا ہے۔ ایک انسان جو آپ شناس ہے۔ پانی کو پہچانتا ہے۔ ایک اور شخص جو ستارہ شناس ہے، وہ ستاروں کو پہچانتا ہے۔ ایک اور انسان جو جامعہ شناس ہے، وہ معاشرے کو پہچانتا ہے۔ ایک اور شخص جو

ماہرِ نفسیات ہے اور وہ لوگوں کی نفسیات کو جانتا ہے۔ ایک اور حیوان شناس — حیوان کو پہچانتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی متعلقہ چیز کی حقیقت اس شخص پر واضح ہے اور وہ اسے جانتا ہے۔ کیا قرآن میں بھی ایمان کے معنی فقط پہچاننے کے ہیں؟ کیا خدا پر ایمان کے معنی فقط خدا کو سمجھنے کے ہیں۔ کیا یہ منہ پر ایمان کے معنی فقط ان کو سمجھنے کے ہیں؟ نہیں — قرآن میں ایمان کا مطلب یہ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ”پہچان — ایمان کا رکن اور ایمان کا جزو ہے“ اور ”پہچان“ کے بغیر ایمان ایمان نہیں ہے — لیکن فقط ”پہچان“ ہی ایمان نہیں ہے۔ ایمان میلان ہے، ایمان تسلیم ہے۔ ایمان میں میلان کا عنصر، تسلیم کا عنصر، تصنع کا عنصر اور عہد و محبت کا عنصر بھی رہا ہوتا ہے لیکن پہچان میں میلان کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ایک شخص کے کنارہ شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ ستارے سے میلان بھی رکھتا ہے۔ نہیں — وہ فقط ستارے کو پہچانتا ہے۔ ایک شخص کے معدن شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ معدنیات سے میلان بھی رکھتا ہے۔ ایک شخص کے آب شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ پانی سے میلان بھی رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات انسان ایک ایسی چیز کو پہچانتا ہو جس سے وہ بے حد نفرت کرتا ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سیاست میں اکثر ایک دشمن اپنے دشمن کو اپنے آپ سے زیادہ پہچانتا ہے۔ مثلاً اسرائیل میں ممکن ہے کہ وہ اشخاص مسلمانوں سے زیادہ ہوں۔ جو عرب شناس اور مسلمان شناس ہوں حتیٰ کہ بعض ایک معنی میں اسلام شناس بھی ہوں۔ مسلمہ طور پر اس وقت اسرائیلی میں مصر شناس، سوریہ شناس، الجزائر شناس ایران سے کہیں زیادہ موجود ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ایران میں ایک بھی حقیقی مصر شناس نہ ہو، جب کہ اسرائیل کے پاس ایسے سیکڑوں آدمی موجود ہیں لیکن اگر اسرائیل مصر کو پہچانتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس سے میلان رکھتا ہے؟ یا اگر مصر اسرائیل کو پہچانتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس سے میلان رکھتا ہے؟ اتفاقاً معاملہ اس کے برعکس ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔

مسلم علماء کہتے ہیں :

اسلام میں ایمان فقط پہچان نہیں ہے جیسا کہ فلسفی دعویٰ کرتے ہیں اس بات کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بہترین پہچانتے والوں کے بہترین نمونے بتلائے ہیں اور بہترین پہچاننے والوں کا تعارف یہ کہہ کر کیا ہے کہ وہ خدا کو اپنے درجے تک پہچانتے ہیں، معاد کو اپنے درجے تک پہچانتے ہیں اور اس کے باوجود وہ پھر کافر ہیں۔ مومن نہیں ہیں۔ وہ کون ہیں؟ وہ شیطان ہے! کیا شیطان خدا کو جانتا ہے یا اس شخص کو جو مادہ پرست اور خدا کا دشمن ہے؟ ہاں۔ شیطان ہمارے اور آپ کے مقابلے میں خدا کو بہت زیادہ پہچانتا ہے۔ اس نے ہزار ہا سال خدا کی عبادت کی ہے۔ کیا شیطان فرشتوں کو پہچانتا ہے یا نہیں پہچانتا؟ انہیں فرشتوں کو جن پر ایمان لانے کا حکم ہمیں قرآن نے دیا ہے۔ جی ہاں۔ وہ ہزاروں سال فرشتوں کی صف میں رہا ہے اور وہ ایک ہی درجے میں عمل کرتے رہے ہیں۔ وہ جبرائیل کو مجھ سے اور آپ سے بہت بہتر طور پر پہچانتا ہے۔ پیغمبروں کا معاملہ کیسا ہے؟ کیا وہ پیغمبروں کو پہچانتا اور جانتا ہے کہ یہ پیغمبر ہیں یا ایسا نہیں ہے؟ جی ہاں! وہ سب پیغمبروں کو پہچانتا ہے اور ہم سے بھی بہتر پہچانتا ہے۔



معاد کا معاملہ کیسا ہے؟ جہاں تک معاد کا تعلق ہے وہ خود ہمیشہ خدا سے قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، یوں وہ معاد کو بھی مکمل طور پر پہچانتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود قرآن شیطاں کو کیوں کافر قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

”مگر ابلیس نے جو شیخی میں آگیا (سجدہ نہ کیا) اور کافروں میں ہو گیا۔ (سورہ ص - آیت ۷۴)

جیسا کہ فلسفی کہتے ہیں کہ ایمان فقط پہچان ہے تو شیطاں کو پہلا مومن ہونا چاہیے لیکن وہ مومن نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسا پہچانتے والا ہے جو جاہل ہے۔ یعنی پہچانتا ہے لیکن اس کے باوجود حق سے دشمنی رکھتا اور مخالفت کرتا ہے۔ وہ جس حقیقت کو پہچانتا ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا، اس کے لیے کوئی میلان اور رگڑ نہیں رکھتا اور اس حقیقت کی جانب حرکت نہیں کرتا۔ پس ایمان فقط پہچان نہیں ہے۔

”ہم نے انسان کو بہت اچھے انداز سے پرہیز کیا، پھر رفتہ رفتہ پست تر حالت کی طرف پھیر دیا۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے۔ (سورہ تین - آیت ۶)

ہمارے بعض حکماء اس آیت مبارکہ کے بارے میں ”مگر وہ لوگ جو ایمان لائے“ کہتے ہیں کہ یہ حکمت عملی ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ ”وہ لوگ جو ایمان لائے“ اس میں ایک ایسی چیز ہے جو حکمت نظری سے بالاتر ہے اور حکمت نظری اس کا ایک پایہ ہے اور یہ پوری حکمت، دریافت، علم اور معرفت نہیں ہے، اس میں پہچان سے بالاتر ایک چیز وجود رکھتی ہے جو تسلیم اور میلان ہے۔

- پس یہاں تک ہم نے عقیدت پسندوں کے مکتب کے تین مسئلے بیان کیے ہیں:
- ① عقل جوت ہے، جو چیزیں وہ دریافت کرتی ہے وہ قابل اعتماد ہیں اور وہ صحیح معرفت حاصل کر سکتی ہے۔ (اسلام بھی اس کی تائید کرتا ہے)
- ② عقل آدمی کا واحد جوہر ہے اور اسلام اس کی تائید نہیں کرتا۔
- ③ یہ دعویٰ کہ اسلامی ایمان بس عقل کی دریافت، معرفت اور پہچان ہے۔ اس کے سوا وہ کوئی چیز نہیں، اس کے متعلق بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام اس کی نفی کرتا ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ایمان اصلالت رکھتا ہے، ایمان عمل کی تہدید ہے اور کوئی اصلالت نہیں رکھتا۔ یہاں ہم اس بات سے قطع نظر کرتے ہیں کہ آیا ایمان کو فقط معرفت سمجھیں یا معرفت کو ایمان کا ایک جزو گردانیں؟ کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ معرفت — ایمان کا جزو ہے۔ ایمان کوئی اصلالت رکھتا ہے یا نہیں رکھتا؟ یہاں پھر دو عظیم مکاتب ایک دوسرے کے مقابلے پر صاف آ رہے ہیں۔ یہ ہم جو کہہ رہے ہیں کہ ایمان اصلالت رکھتا ہے تو اس سے مراد کیا ہے؟ کیا یہ اس لفظ نگاہ سے ہے کہ ایمان انسان کے عمل کی اعتقادی بنیاد ہے؟ یعنی اس لحاظ سے کہ دنیا میں انسان کو چاہیے کہ کوشش کرے، سرگرم ہو، جہاد کرے اور ہمیشہ مصروف عمل رہے۔ لیکن ضروری ہے کہ یہ سرگرمی کسی لقمے کی بنیاد پر ہو، اس کا کوئی مقصد ہو، اس میں کوئی ترتیب ہو اور کوئی اعتقادی بنیاد بھی ہو۔ چونکہ انسان برہال ایک موجود ہے اور اس کی فعالیت فطری ہے، اس لیے اگر وہ چاہے کہ اس کی زندگی کا ایک لائحہ عمل ہو اور یہ بھی چاہے کہ وہ زندگی میں اپنا مقصد پالے تو یہ ایک فطری اور اعتقادی بنیاد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

پس ضروری ہے کہ اسے ایک فکری اور اعتقادی بنیاد مہیا کی جائے تاکہ وہ اس پر اپنے فکری نظام کی بنیاد رکھ سکے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص ایک عمارت، ایک مکان یا ایک ہال بنانا چاہتا ہو۔ ہال بنانے والے کا مقصد یہی ہے کہ اس کی چار دیواری ہو، چھت ہو اور دروازے ہوں۔ لیکن جو کام زمین کھود کر بنیادوں میں کیا جاتا ہے اور پھر اس پر دیواریں اٹھائی جاتی ہیں اگرچہ وہ ہال بنانے والے کا ہدف اور مقصد نہیں۔ لیکن اس غرض سے کہ عمارت کھڑی رہے، نہ پہلے اور نہ گھرے تو پھر ضروری ہے کہ بنیاد اس طرح تیار کی جائے کہ وہ عمارت مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

آج کل کے اجتماعی مکاتب — مثلاً کمیونزم میں فکری اور اعتقادی اصول موجود ہیں جن کی بنیاد مادیت MATERIALISM پر ہے اور وہ مادیت پر مبنی اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی اصولوں کا ایک ضابطہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک فکری نظام کے نقطہ نظر سے وہ اصول، اعتقادی لحاظ سے اس کی فکری بنیاد ہیں، مگر وہ فکری اصول اس کا ہدف نہیں ہیں۔ درحقیقت مادیت ایک کمیونسٹ کا ہدف نہیں ہے اور وہ اس کے لیے کوئی اصالت نہیں رکھتا۔ بنیادی طور پر وہ لوگ بھی جو مادیت کی گود میں جا گرے ہیں۔ اس کی وجہ وہ احمقانہ مخالفتیں ہیں جو ایک کلیسا نے ان سیاسی، اجتماعی اور خصوصاً آزادی پسندانہ خیالات کے بارے میں کیں۔ اس مذہبی حماقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی دنیا میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ انسان کو چاہیے کہ یا تو وہ خدا کو چھوڑ کر معاشرے میں آزاد اور حقدار بن کر رہے اور اپنے آپ کو حقدار سمجھے یا خدا پر اعتقاد رکھے، — اپنے آپ کو حقدار نہ سمجھے اور اپنے آپ کو آزاد نہ جانے۔ بعد میں آزادی

کی اس منزل کے لیے ایک راستہ تیار کرنے کی خاطر سب سے پہلے مذہب کی بنیاد پر ضرب لگائی گئی۔ ایک کمیونسٹ کے لیے مادیت واقعی کوئی اصلیت نہیں رکھتی لیکن وہ سوچتا ہے (اور اس کی یہ سوچ بھی غلط ہے) کہ مادیت کے بغیر ان اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی اصولوں کی کسی طور پر توجہ نہیں ہو سکتی۔ پس ان کی توجہ کرنے کے لیے ہم مادیت کے فکری اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

آج کی دنیا میں بہت سے ایسے کمیونسٹ پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے تجزیہ کیا اور کہا کہ مادیت ہمارے لیے کوئی اصلیت نہیں رکھتی اور ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف کمیونزم چاہتے ہیں تو وہ مادیت کے بغیر ہی کیوں نہ ہو۔ کیا کئی ایک کمیونسٹ ایسے نہیں ہیں جو مذہب کی مخالفت میں رفتہ رفتہ کمی کر رہے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادیت کے فکری اصولوں پر ان کا ایمان کوئی اصلیت نہیں رکھتا اور وہ اصول فقط ان کی سوچ کی اعتقادی اور فکری بنیادیں ہیں۔ چونکہ کوئی نظریہ جہاں بینی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا، اس لیے وہ

اپنی جہاں بینی کو اس عمارت کی بنیاد قرار دیتے ہیں تاکہ اس نظریے کے سارے جزئیات جہاں بینی پر مبنی کر سکیں اس نظریے کے تمام جزئیات کی بنیاد اور ہدف جہاں بینی ہی ہے۔ اسلام میں کیا صورت ہے؟ اسلام میں ایمان — جو خدا پر ایمان، فرشتوں

پر ایمان، انبیاء و اولیاء پر ایمان اور معاد پر ایمان ہے، کیا اس نے یہ چیزیں فقط اس لیے پیش کی ہیں کہ ان کے ذریعے ایک فکری اور اعتقادی بنیاد فراہم کر کے وہ اپنے اس نظریے IDEOLOGY کو (جو اصل ہدف بھی ہے) ایک فکری اصول پر استوار کرنا چاہتا ہے اور اس لیے یہ فکری اصول اس لیے دیے تاکہ وہ بنیاد کا کام دیں۔ ورنہ خود یہ فکری اصول کوئی اصلیت نہیں رکھتے؟ یا ایسا ہے

کہ یہ اصول خود اصالت رکھتے ہیں کیونکہ اسلام کے نظریے کی فکری اور اعتقادی بنیاد ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت صرف بنیاد میں ڈالے گئے مواد کی نہیں ہے۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ اگر ایک عمارت کو بنیاد پر کھڑا نہ کیا جائے تو یہ ایک لغو عمل شمار ہوتا ہے۔

اسلام میں — باوجودیکہ اسلامی ایمان، فکری اور اعتقادی بنیاد ہے اور اسلامی نظریہ اس بنیاد پر استوار ہوا ہے۔ وہ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی اصالت رکھتا ہے۔ یعنی اس بارے میں فلسفی حق پر ہیں کہ ایمان خود اصالت رکھتا ہے اور اس کی حیثیت نقطہ عمل کے لیے ایک تمہید کی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے عمل ہے، جو کچھ ہے فعالیت ہے اور جو کچھ ہے کوشش ہے۔ لیکن اگر ایمان کو عمل سے الگ کر لیں تو کیا کچھ ہو سکتا ہے؟ نہیں — اگر ہم ایمان کو عمل سے نکال لیں تو بھی ہم نے ایک ستون گرا دیا اور اسی طرح اگر عمل کو ایمان سے نکال لیں تو بھی ہم نے ایک ستون گرا دیا۔

قرآن ہمیشہ فرماتا ہے :

”وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے۔“

یعنی عمل کو منہا کر کے ایمان نیک بختی کا ایک رکن ہے اور اس کا دوسرا رکن عمل ہے۔

نیک بختی کا خیمہ ایک ستون پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ایمان ذاتی قیمت اور اصالت رکھتا ہے اور درحقیقت ان دنیا میں اور یا انھیں دوسری دنیا میں انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ ایمان رکھتا ہو کیونکہ اسلام میں روح واقعی ایک مستقل چیز ہے اور اس کا اپنا کمال ہے۔ روح انسان

کے مرنے کے بعد باقی رہتی ہے اور اگر وہ اپنے کمالات تک نہ پہنچے تو ناقص اور فاسد ہے اور خوش بختی حاصل نہیں کر سکتی۔

آپ قرآن مجید کو دیکھیں کہ وہ ان موضوعات پر کیا فرماتا ہے:

۱۵۲ اور جو شخص اس دنیا میں (عقل کا) اندھا بن رہا وہ آخرت میں اندھا اور راستے سے بھٹکا ہوا ہوگا۔

(سورہ نبی اسرائیل - آیت ۷۲)

صاف ظاہر ہے اس آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دنیا میں جس شخص کی ظاہری آنکھیں اندھی ہوں گی وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ابولہبیر جو امام صادق ؑ کے اصحاب میں تھے اور ان کی ظاہری آنکھیں نابینا تھیں، آیا دوسری دنیا میں ان کی حالت خراب ہوگی؟ نہیں۔ بلکہ اس دنیا میں جس شخص کی باطن کی آنکھیں حقائق دیکھنے کو اور اس چیز کا ادراک کرنے سے جس پر اسے ایمان رکھنا چاہیے (یعنی اپنے خدا اور اس کی نشانیوں کو دیکھنے سے) اندھی ہوں گی وہ اس دنیا میں اندھا اٹھایا جائے گا اور اس کے علاوہ کوئی تغیر ممکن نہیں ہے۔

اگر ہم فرض کریں کہ ایک شخص اس دنیا میں ایمان نہیں رکھتا۔ تاہم اگر اس دنیا کے تمام اچھے کام انجام دیے ہوں، وہ تمام اچھی کوششیں کی ہوں جو انسان کرتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں تمام امر بالمعروف انجام دیے ہوں، تمام نہی عن المنکر پر عملدرآمد کیا ہو، اس نے دنیا میں عظیم ترین پرہیزگاروں جیسی زندگی گزاری ہو اور اس نے اپنی زندگی خلق خدا کے لیے وقف کر دی ہو، لیکن اگر وہ خدا کو نہ پہچانتا ہو، عالم ہستی کو نہ پہچانتا ہو اور

معاد و قیامت کو نہ پہچانتا ہو تو وہ اندھا ہے اور بلاشبہ اس دنیا میں بھی اندھا ہو گا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایمان اعمال کی تمہید ہے اور جس شخص کے اعمال اچھے ہیں، اگر اس کا ایمان درست نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں — یہ بات نہیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو۔

۱۳؎ وہ کہے گا الٹی میں آنکھ والا تھا، تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا۔ خدا فرمائے گا اس طرح کہ ہماری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں، تو انھیں بھٹلا بیٹھا تھا۔ اسی طرح آج تو بھی بھٹلا دیا جائے گا۔ (سورہ طہ - آیت ۱۲۵-۱۲۶)

قیامت کے دن ایک بندہ اندھا اٹھایا جاتا ہے اور وہ اعتراض کرتا ہے کہ اے خدا! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ میں جو دنیا میں آنکھیں رکھتا تھا، یہاں اندھا کیوں ہوں؟

جواب ملتا ہے کہ تو دنیا میں جو آنکھیں رکھتا تھا وہ یہاں کام نہیں آتیں۔ یہاں دوسری آنکھوں کی ضرورت ہے۔ وہ معنوی اور باطنی آنکھیں ہیں جنہیں تم نے دنیا میں اندھا کر لیا تھا اور آج یہاں بھی اندھے ہو۔ اس دنیا میں ہماری نشانیاں موجود تھیں لیکن تو نے یجائے اس کے کہ ہماری نشانیاں کو دیکھتا، ہمیں پہچانتا، حقیقت کو سمجھتا اور عالم حقیقت میں حقیقی بصیرت کے ساتھ آتا — تو نے اس دنیا میں حقیقت کو نہ سمجھا اور وہاں اپنے آپ کو اندھا کر لیا تھا۔

ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن یہ بھی کہتا ہے :  
۱۴؎ بے شک یہ لوگ اس دن اپنے پروردگار کی رحمت سے



الگ تھلک کر دیے جائیں گے۔ (سورۃ تطفیف - آیت ۱۵)  
 یہ ان لوگوں کا حال ہے جو اس دنیا میں حق و حقیقت کو پہچاننے کی کوشش  
 نہیں کرتے اور ایمان و یقین کی منزل پر نہیں پہنچ پاتے۔

ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اے انسان! تو اس دنیا میں آیا ہے تاکہ تیری  
 آنکھ اس دنیا میں اس دنیا کو دیکھے اور تیرا کان اس دنیا میں اس دنیا کی  
 آواز سنے۔

میں نے کئی بار کہا ہے کہ میں بڑا خوش نصیب ہوں جو دیکھتا ہوں کہ  
 ہمارے جوان سچ البلاغہ کی جانب توجہ رکھتے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ  
 سچ البلاغہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھیں۔ آپ دیکھیں کہ سچ البلاغہ اس قسم کے  
 ناشنواکانوں سے کیا بات کہتی ہے۔ کیونکہ سچ البلاغہ ایمان کی اصلیت کی  
 قائل ہے۔ سچ البلاغہ یہ نہیں کہتی کہ ایمان کی حیثیت فقط فکری اور اعتقادی  
 بنیاد کی سی ہے۔ میں بھی یہ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ بنیاد نہیں ہے، بلکہ بنیادی اور اعتقادی  
 حیثیت کے ساتھ ساتھ یہ ذاتی قیمت بھی رکھتا ہے۔

امام علی علیہ السلام اہل اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں :  
 ۵۵ وہ اسے پکارنے کی وجہ سے عفو و بخشش کی ہواؤں  
 میں سانس لیتے ہوں۔ (سچ البلاغہ مفتی جعفر حسین مطبوعہ ۲۱۹)

صفحہ ۶۰۸

یہ وہ لوگ ہیں جو اس حالت میں خدا کو پکارتے ہیں، استغفار کرتے  
 ہیں اور استغفار میں محو ہو جاتے ہیں تو اچانک اپنے اندر بخشش کی ٹھنڈی  
 ہوا محسوس کرتے ہیں۔

امام علیؑ مزید فرماتے ہیں:

۱۸۶ بے شک اللہ سبحانہ نے اپنی یاد کو دلوں کا صیقل قرار دیا ہے جس کے باعث وہ (امرو نہی سے) ہمراہ ہونے کے بعد سننے لگے اور اندھے ہونے کے بعد دیکھنے لگے اور دشمنی و عناد کے بعد فرمانبردار ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے ہر عہد اور نبیاء سے غالی دور میں رب العزت کے کچھ مخصوص بندے ہمیشہ مخصوص رہے ہیں کہ جن کی فکروں میں وہ سرکشوں کی صورت میں (حقائق و معارف کا) انقار کرتا ہے اور ان کی عقلوں سے الہامی آوازوں کے ساتھ کلام کرتا ہے۔

(منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۱۹ صفحہ ۲۰۶)

یعنی وہ ہر دور میں وجود رکھتے ہیں اور کوئی دور ایسا نہیں جس میں وہ موجود نہ ہوں۔ امام علیؑ کے ارشاد کے مطابق وہ ہمارے دور میں بھی وجود رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اندر اور اپنی سوچ کے اندر اپنے خدا کے ساتھ بائیں کرتے ہیں۔ فخر رازی کی ایک بڑی پرکشش اور عمدہ رباعی ہے:

ترسم بروم عالم جان نادیدہ

بیرون روم از جہاں، جہان نادیدہ

در عالم جان چوں روم از عالم تن؟

در عالم تن عالم جان نادیدہ

وہ کہتا ہے:

مجھے بڑھے کہ میں مر جاؤں گا لیکن میرے دل کی آنکھ کھلی نہ ہوگی۔ میں دنیا

کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا لیکن حقیقت میں اس کو دیکھا ہی نہ ہوگا۔

اس سے رازسی کی مراد یہ نہیں کہ اس نے دروازوں اور دیواروں کو نہیں دیکھا یا سمندر اور ستاروں کو نہیں دیکھا، نہیں — دنیا سے اس کی مراد دنیا کی روح اور دنیا کا میدان ہے کہ اسلام جسے ”ایمان“ سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تن کی دنیا میں روح کی دنیا کو نہیں دیکھا۔ پھر جب میں تن کی دنیا سے روح کی دنیا میں جاؤں گا تو اسے وہاں کیسے دیکھ سکوں گا؟ مجھے چاہیے تھا کہ اسے یہیں دیکھ لیتا لیکن نہیں دیکھ سکا۔ اور جو شخص اس دنیا میں (مطلقاً) اندھا بنا رہا، وہ آخرت میں اندھا اور راستے سے ہٹکا ہوا ہوگا۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۴)

رازسی کی جو رباعی اوپر درج ہوئی ہے، وہ اسی آیت کی تشریح کر رہا ہے۔ اس آیت کا تعلق ایمان اور معرفت سے ہے۔ یعنی خدا کی معرفت، خدا کے فرشتوں کی معرفت جو عالم وجود کے واسطے ہیں، خدا کے انبیاء اور اولیاء کی معرفت جو ہمارے حجاب ایک اور انداز میں خدا کے فیض کا واسطہ ہیں اور اس بات کی معرفت کہ ہم اس دنیا میں آئے ہیں تو کیوں آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ اس بات کی معرفت کہ ہمیں بالآخر اور پھر حال (معاد و قیامت میں) خدا کی جانب لوٹنا ہے اور یہ کہ ہر چیز کو خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ ساری معرفتیں بجائے خود اصالت رکھتی ہیں اور ان حقائق پر ایمان بھی ایک اصالت رکھتا ہے لیکن خود اصالت رکھنے کے ساتھ یہ اسلام کے فکری اور اعتقادی نظریے کی بنیاد بھی ہے اور ایک اصل ایمان کسی نظریے IDEOLOGY کے لیے ایک بہت اچھی فکری اور اعتقادی بنیاد بن سکتا ہے۔ پس کبھی عمل کو ایمان پر

قربان نہ کرو اور ایمان کو بھی عمل پر قربان نہ کرو، گویا ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔

اب مجموعی طور پر فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان \_\_\_\_\_ درحقیقت ”کامل انسان“ نہیں ہے، بلکہ ایک ناقص انسان ہے یعنی وہ اپنے اندر کمال کا صرف ایک حصہ رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو عقلی کمال کی اصالت کے قابل ہیں، اگرچہ ان کی یہ بات صحیح ہے لیکن انہوں نے انسانی کمالات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے انسان کے تمام کمالات کو اس کے عقلی کمال میں تلاش کیا ہے۔ اس بنا پر فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان ”آدھا کامل“ ہے، فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان فقط دانی کا ایک ٹھسہ ہے جو فقط عالم ہستی کو جانتا ہے یعنی جو کامل انسان انہوں نے فرض کیا ہے وہ ایک ایسا وجود ہے جو روزِ فطر کو خوب جانتا ہے۔ لیکن شوق، حرکت، حرارت اور صفائے باطن سے یکسر خالی ہے۔ کیونکہ وہ فقط جانتا ہے اور بس! یعنی وہ ایک ایسا وجود ہے جس کا تمام تر کمال یہ ہے کہ وہ خوب جانتا ہے اور وہ بہت خوب جانتا ہے۔ اس کا یہ جاننا \_\_\_\_\_ اس کائنات کو اپنی ذہنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور بقول ان کے وہ ایک وسیع دنیا ہے جو ایک گوشے میں سمٹ گئی ہو، تاہم یہ اسلام کا بنایا ہوا کامل انسان نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کی رو سے ایک نیم کامل انسان ہے۔

عقل کی قدر و قیمت اور فلسفیوں کی جاتی سے عقل کی تائید کہ جو بجا و درست ہے۔ میں اس کی تائید میں حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کی روایت نہیں بیان کر سکا۔ لیکن اس موضوع کے تحت بہت زیادہ مطالب ہیں اور اگر ہم اس

۱۹۲

اس بارے میں گفتگو کرنا چاہیں تو اس کے لیے مزید ایک باد و رایتیں درکار ہونگی۔  
بہر طور آج رات میں اپنی تقریر ہمیں ختم کرتا ہوں۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ  
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

## ساتویں نشست

### کامل انسان اور مختلف نظریات ④

وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول  
(محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو  
پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا، اس سے پہلے  
تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔

(سورہ جمعہ - آیت ۲)

اس مقدس جلسے میں جو بحث کی جانے والی ہے، یہ اس گفتگو کے تسلسل  
میں ہے جو چند یوم قبل مسجد جاوید میں کی گئی تھی۔ تاہم مجھے یہ علم نہیں کہ کتنے معزز  
حاضرین نے ان جلسوں میں شرکت کی اور کتنے شریک نہیں ہوئے۔ لہذا ہم یہ بحث  
اس انداز میں کریں گے کہ جو حضرات ان جلسوں میں شریک نہیں ہوئے وہ بھی  
اس کا مطلب سمجھ لیں۔ وہاں ایک رات ہم نے مختصر طور پر کامل انسان کے  
متعلق مختلف مکاتب کے نظریات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا

کہ فلسفیوں کے نقطہ نظر کے مطابق ”کامل انسان“ ایک طرح کا ہے، عرفا کے خیال میں ایک اور طرح کا اور بہت سے جدید فلسفیوں کے نظریے کے مطابق ایک اور طرح کا ہے۔ اس وقت ہم نے مختلف مکاتب کا اجمالی طور پر تعارف کرایا تھا اور ان کے بارے میں تفصیلی بحث ہم بعد میں کریں گے۔ مکتب عقل، مکتب عشق، مکتب محبت، مکتب قدرت اور مکتب خدمت وغیرہ کے بارے میں میں نے اجمالاً عرض کیا تھا۔ آج رات ہم ان مکاتب میں سے ایک مکتب کے متعلق تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے اور اس مکتب کے مختلف حصوں کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر بیان کریں گے۔

بچھنی نشست میں ہماری بحث کتب عقل یعنی عقلیت پسندوں سے مخصوص تھی۔ لیکن آج کی نشست میں ہماری بحث کامل انسان کے متعلق مکتب عرفان و تصوف کے نقطہ نظر کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ عرفان و تصوف کے نقطہ نظر کے مطابق کامل انسان کے بارے میں بحث ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ کامل انسان کے متعلق ارسطو اور ابن سینا وغیرہ جیسے فلسفیوں نے جو کچھ بیان کیا، وہ لوگوں میں قبولیت نہیں پاسکا کیونکہ وہ محض ان فلسفیوں کا ایک قول تھا جو فلسفے کی کتابوں کے متن میں آیا اور پھر وہاں سے باہر نہیں نکلا۔ لیکن مکتب عرفان و تصوف نے کامل انسان کے متعلق اپنا نقطہ نظر لوگوں کے درمیان نظم و شد و لوں ذریعوں سے پھیلا دیا ہے عرفان و تصوف کی کتابیں خواہ وہ نظم میں ہوں یا نثر میں ہوں، وہ ان مطالب کو متشیل اور شعر کی زبان میں بیان کرتی ہیں۔ فلسفیوں کے مکتب کی طرح یہ مکتب بھی کچھ ایسے قابل قبول مطالب اور مسائل کا حامل ہے جو اسلام کے نقطہ نظر کے



مطابق قابل قبول ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ تنقید و تنقیح سے میرا نہیں ہیں اور اسلام کا مطلوبہ کامل انسان — اہل عرفان و تصوف کے مجوزہ کامل انسان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ فلسفی تنہا عقل کو ہی انسان کی ذات اور جوہر سمجھتے ہیں اور جو چیزیں عقل کے علاوہ ہیں وہ انسان کی ذات سے خارج ہیں اور اس کے لیے صرف وسیلوں اور آٹوں کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ انسان کی من، انسان کی سوچنے کی قوت یعنی انسان کی منطقی سوچ بچار۔ عرفا انسان کی عقل اور انسان کی فکر کو اس کی من (ذات) سمجھتے، بلکہ وہ عقل اور فکر کو انسان کے لیے ایک آلہ خیال کرتے ہیں۔ وہ شخص کی حقیقی من اور ذات اس چیز کو سمجھتے ہیں جسے وہ ”دل“ کہتے ہیں۔ حکیم اور فلسفی من کو وہ چیز سمجھتا ہے جسے وہ عقل سے تعبیر کرتا ہے اور عارف انسان کی واقعی من اس چیز کو سمجھتا ہے جسے وہ دل سے تعبیر کرتا ہے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک عارف جس چیز کو دل کہتا ہے، اس سے مراد گوشت کا وہ لوتھرا نہیں جو انسان کی بائیں جانب ہوتا ہے، بلکہ دل سے مراد انسان میں احساس، خواہش اور غور و فکر کا مرکز ہے۔

عارف عشق اور احساس کو بہت اہمیت دیتا ہے جو انسانی احساسات میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ البتہ جس عشق کا عارف ذکر کرتا ہے وہ ہمارے عمومی عشق و محبت سے مختلف چیز ہے۔ جبکہ ہمارا عشق عام طور پر جسمانی پہلو رکھتا ہے لیکن ایک عارف کا عشق وہ عشق ہے جو پہلے خدا تک بلند ہوتا ہے، کیونکہ عارف کا حقیقی معشوق خدا ہے۔ علاوہ ازیں جس عشق کا عارف ذکر کرتا ہے وہ صرف عارف تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ عارف کا عقیدہ یہ ہے کہ عشق تمام موجودات عالم

میں بچا بسا ہوا ہے۔ عرفانی کتابوں اور بعض فلسفیانہ کتابوں — مثلاً اسفار میں کہ جس کا جھکاؤ عرفان کی طرف ہے ”فی سریان العشق فی جمیع الموجودات“ کے تحت ایک مستقل باب نظر آتا ہے۔ یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ عشق ایک ایسی حقیقت ہے جو وجود کے تمام ذرات میں جاری و ساری ہے۔ اس ہوا میں بھی عشق ہے اور اس کے علاوہ آپ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ مجاز ہی مجاز ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں مولوی معنوی نے کہا ہے :

عشق بحری است آسمان بروی کفی

چول زلیخا در ہوا ی یوسفی

عشق ایک سمندر ہے اور یہ زمین و آسمان سمندر کے جھاگ کی طرح ہے جو پانی سے اس طرح محبت رکھتا ہے جس طرح زلیخا کو یوسف سے محبت تھی۔ (معنوی مولانا روم۔ صفحہ ۵۲)

حافظ شیرازی کہتے ہیں:

ماورایں در نہ پنی شمت و جاہ آمدہ ایم

از بہ حادثہ اینچا یہ پناہ آمدہ ایم

دہر و منزل مشتم ز سرحد عدم

تائبہ اقلیم وجود ایں ہمہ راہ آمدہ ایم

ہم اس دنیا میں دولت اور اقتدار حاصل کرنے نہیں آئے۔ ہمیں تو ایک حادثے کے باعث یہاں پناہ لینے آنا پڑا۔

اصل میں ہم راہ عشق کے مسافر ہیں اور اس کی خاطر ہی عدم سے وجود کے مرحلے تک پہنچے ہیں۔

یہ اشعار کتنے بلند پایہ ہیں — حافظ کے یہ اشعار صحیفۂ سجادہ کے ایک جملے کا ترجمہ ہیں۔ جیسا کہ حمد و ثنا کے بعد امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

۵۷ خدا نے موجودات کو عدم سے پیدا کیا اور ابداع کیا۔ ابداع کے معنی یہ ہیں کہ اس کے لیے پہلے سے کوئی نمونہ نہ تھا۔ بعد میں اس نے ان موجودات کو اپنی محبت کی راہ پر ڈالا۔ (صحیفۂ سجادہ - دعار اول)

جیسا کہ حافظ شیرازی نے اوپر دی گئی رباعی میں کہا ہے کہ اصل میں ہم راہ عشق کے مسافر ہیں اور اس کی خاطر ہی عدم سے وجود کے مرحلے تک پہنچے ہیں۔ جب عرفا یہ کہتے ہیں کہ انسان میں اور تمام دنیا میں ایک سے زیادہ حقیقت کا وجود نہیں ہے اور وہ ایک حقیقت عشق ہے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان کی حقیقت کیا ہے؟ ایک عارف کسی فلسفی کی مانند یہ نہیں کہتا کہ انسان کی حقیقت ”فکر“ ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ انسان کی حقیقت اس کا دل ہے اور دل وہی چیز ہے جو عشق الہی کا مرکز ہے۔ پس یہاں عارف اور فلسفی میں ایک تفاوت ہے اور وہ یہ کہ عرفان میں ”من“ وہ چیز ہے جو ”عشق“ کرتی ہے، نہ وہ جو ”فکر“ کرتی ہے۔

جب انسان — کامل انسان کے مقام پر پہنچنا چاہے تو فلسفی کے نقطہ نظر کے مطابق اسے کن ذرائع کے ساتھ جانا چاہیے؟ وہ کہتا ہے منطق کے ساتھ، منطق کے پاؤں کے ساتھ، استدلال کے سہارے کے ساتھ، قیاس کی مدد کے ساتھ، صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب دینے، سوچنے سمجھنے اور ان مقدمات کے نتیجے تک پہنچنے کے ساتھ انسان — ”کامل انسان“ کے مرتبے تک جا پہنچنا

ہے لیکن عارف کا نظریہ کچھ اور ہے :

در سر عارف سواد و حرف نیست  
جز دل اسپید، بچوں برف نیست  
عارف کے تصور میں دو حرف (توحید و نبوت) کے علاوہ  
کچھ نہیں ہونا اور اس کا دل تنک و شبہ سے پاک ہوتا ہے۔  
عارف — حرف، سواد، مقدمہ، صخری، کبرئی، استدلال اور نتیجہ وغیرہ  
کی بات نہیں کرتا اور ان سب باتوں کی بجائے کہتا ہے :  
تصفیہ نفس اور اصلاح نفس کرو، برے اخلاق کو اپنے آپ سے  
دور کرو اور جہاں تک ممکن ہو غیر حق کی جانب سے اپنی توجہ ہٹاؤ، نیز اپنے  
خیالات پر زیادہ سے زیادہ قابو پاؤ۔ تمہارے دل میں خدا کے علاوہ جو کسی دوسرے  
کا خیال آتا ہے وہ دیو (شیطان) ہے۔ پس جب تک دیو ہاں موجود ہے، فرشتہ  
جو خدا کا لوزر ہے وہ تیرے دل میں ہرگز نہیں آئے گا۔  
حافظ شیرازی کہتے ہیں :

بر سر آتم کہ گر دوست بر آید  
دست بہ کاری زخم کہ غصہ سر آید  
خلوت دل نیست جای صحبت اغیار  
دیو چوں بروں رود فرشتہ در آید

صحبت احکام، ظلمت شب بیداست  
نور ز خورشید جوی گو کہ در آید

بردر اربابہ بنی مروت دنیہ  
چند نشینی کہ خواجہ کی برہم  
ترک گدائی مکن کہ گنج بیانی  
از نظر دہروی کہ در نظر آید  
میں اس بات پر آمادہ ہوں کہ ہاتھوں کو کام میں لگائے رکھوں  
تاکہ غم غلط ہو جائے۔

دل میں دو مخالف جمع نہیں ہوتے اور جب شیطان وہاں  
سے نکلتا ہے تو پھر فرشتہ آتا ہے۔

اہل عقل کی صحبت اندھیری رات کی طرح ہے۔ تم سورج سے  
روشنی حاصل کرو کہ جو تمہارے اندر آئے۔

دنیا کے بے مروت امرا کے دروازے پر کب تک بیٹھے دیکھتے  
رہو گے کہ صاحب کب باہر آتے ہیں۔

جو صاحب نظر سالک ہے اس سے طلب فیض ترک نہ کرو تاکہ  
تمہیں معرفت کا خزانہ ملی جائے۔

ایک انسان کے — کامل انسان — کے مقام پر پہنچنے کے لیے یہ  
مکتب جو وسیلہ بتاتا ہے، وہ اصلاح نفس، تصفیہ نفس اور خدا کی جانب توجہ  
ہے۔ انسان خدا کی طرف جتنی زیادہ توجہ کرے، غیر خدا کی جانب توجہ کو جتنا  
زیادہ اپنے ذہن سے دور کرے، جتنا زیادہ اپنے آپ کے اندر ڈوب جائے  
اور باہر سے جتنا زیادہ اپنا رابطہ منقطع کرے، وہ اتنا ہی بہتر طور پر کامل انسان  
کے بلند مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارف لوگ بحث اور استدلال

کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔

مولوی معنوی نے کہا ہے :

پای استدلالیاں جو ہیں بود  
پای جو ہیں سخت بی تمکین بود  
اہل منطق کا پاؤں کھڑی کا ہے اور کھڑی کا پاؤں بڑا ہی ناپائیدار  
ہوتا ہے۔ (مثنوی مولانا روم - صفحہ ۵۶)

وہ ایک اور مقام پر کہتے ہیں :

بحث عقلی گر در و مرجان بود  
آں دگر باشد کہ بحث جان بود  
بحث جان اندر مقامی دیگر است  
بادۂ جان را قوامی دیگر است  
عقل و منطق کی بحث اگر موتی اور مونگے کی طرح چمک رکھتی ہو  
تو بھی روحانی بحث اس سے جدا چیز ہے۔  
روح کی بحث کا مقام اور ہے اور اس کی ترکیب کسی اور جواہر  
سے ہوتی ہے۔ (مثنوی مولانا روم - صفحہ ۴۱)

اس راستے کی انتہا کیا ہے ؟

فلسفی کے راستے کی انتہا یہ تھی کہ اس نے کہا : انسان ایک ”دنیا“  
ہی جائے لیکن وہ عقل و فکر کی دنیا ہو، چنانچہ فلسفی نے کہا :  
”انسان کے کمال کی انتہا یہ ہے کہ تمام دنیا کا نقش خواہ وہ  
مہم ہی کیوں نہ ہو، اس کی عقل کے آئینے میں پڑتا ہے یعنی

وہ دنیا کو اپنے اندر دیکھتا ہے۔

فلسفی کے راستے کی انتہا دانائی اور دنیا کو دیکھنا تھا۔ عارف کے راستے کی انتہا کیا ہے؟

عارف کا کام راستے کی انتہا تک پہنچنا ہے نہ کہ دیکھنا — کہاں پہنچنا؟ حق تک اور ذاتِ خفی تک پہنچنا۔ عرفا کا عقیدہ ہے کہ اگر انسان اپنے باطن کی صفائی کرے، عشق کی سواری کے ساتھ حرکت کرے اور راستے کی منزلیں ایک کامل تر انسان کی زیر نگرانی طے کرے تو اس راستے کی انتہا یہ ہے کہ اس کے اور — خدا کے درمیان سے حجاب اٹھ جاتا ہے اور خود ان کی تعبیر کے مطابق وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ قرآن میں ”لقاء اللہ“ کا مسئلہ ہمیشہ کیا گیا ہے لیکن عارف یہ نہیں کہتا کہ میں ایسے مقام پر پہنچ جاؤں کہ جہاں ”فکر“ کی ایک دنیا بن جاؤں اور وہ آئینہ بن جاؤں کہ ساری دنیا مجھ میں منعکس ہو جائے۔ اس کی بجائے وہ کہتا ہے: میں جا رہا ہوں تاکہ دنیا کے مرکز تک پہنچ جاؤں۔

۹۹ اے انسان! تو اپنے پروردگار کی حضوری کی کوشش کرتا ہے۔ پس تو اس کے سامنے حاضر ہو گا۔

(سورۃ الشقاق - آیت ۶)

جب تو ادھر کو چلے اور وہاں پہنچ جائے تو گویا تو نے ہر چیز کو پالیا۔

۱۰۰ اللہ کی بندگی ایک جوہر ہے جس کی انتہا آفتابی یعنی قورنٹ و توانائی ہے۔

جب تو وہاں پہنچ گیا تو ہر چیز سزا پا گیا۔ لیکن تو کوئی چیز لینا نہیں چاہتا۔



۲۰۲

معہ یہ ہے کہ تو ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں ہر چیز تجھے دی جاتی ہے  
لیکن تو اس (ذاتِ حق) کے سوا کسی چیز کی جانب توجہ نہیں دیتا۔

ابوسعید ابوالخیر نے کیا خوب کہا ہے :

ہر کس کہ تو را شناخت جان را چہ کند

فرزند و عیال و خانمان را چہ کند

دیوانہ کنی و ہر دو جہانش بخشی

دیوانہ تو ہر دو جہان را چہ کند

اے خدا! جس شخص کو تیری معرفت حاصل ہو جائے اسے

جان، مال اور عیال سے کیا سروکار!

تو نے اسے اپنا دیوانہ کر لیا اور پھر اس کو دو جہان پر اختیار

دیتا ہے، تیرا دیوانہ بھلا دو جہان کو کیا کرے گا؟

ایک وقت ہوتا ہے جب تو اسے دونوں جہاں دیتا ہے لیکن وہ ان

کو نہیں چاہتا۔ جس دن تک وہ تجھے نہیں پہچانتا وہ ہر چیز چاہتا ہے لیکن

اس وقت تو اسے نہیں دیتا۔ مگر جب وہ تجھے پہچان لیتا ہے اور تو اسے ہر چیز

دیتا ہے تو اس وقت وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ جس نے تجھے پہچان لیا

اگر تو نے اسے تمام چیزیں بھی بخش دیں تو وہ کسی چیز کی جانب توجہ نہیں

دیتا کیونکہ تو دنیا اور آخرت سے بلند تر ہے۔

یہاں اگر ہم چاہیں کہ اس موضوع پر اسلام کا نظریہ بیان کریں کہ آیا

یہ چیزیں اسلامی معیارات سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں تو اس کے لیے

وقت نہیں ہے لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ عرفاء کا مطلوبہ کامل انسان

۲۰۳

کیسا ہے۔ وہ ایسا انسان ہے جو خدا تک پہنچتا ہے اور جب وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے تو خدا کے تمام اسماء و صفات کا کامل مظہر بن جاتا ہے اور اصطلاح میں وہ ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں ذات حق ظہور کرتی اور جلوہ دکھاتی ہے۔ جیسے ہم نے مکتب فلسفہ کے بیان میں کہا ہے کہ وہ شخص جسے فلسفی کامل انسان سمجھتے ہیں۔ اسلام کے نقطہ نگاہ کے مطابق نیم کامل ہے، کامل انسان نہیں ہے۔

یہاں ہم اس بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں کہ آیا اسلام میں تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کے نام سے کوئی مسئلہ پیش کیا گیا ہے یا نہیں؟ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ یہ قرآن کے متن میں آیا ہے:

۱۹ جس نے اپنے نفس کو گناہ سے پاک رکھا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گناہ سے دبا دیا وہ نامراد رہا۔

(سورہ شمس - آیت ۹-۱۰)

اس کے بعد قرآن یکے بعد دیگرے گیارہ قسمیں کھاتا اور فرماتا ہے:

نجات ان لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے تزکیہ نفس کیا۔ اور بدبخت وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفس اور باطن کو فاسد اور تباہ کر دیا ہے۔ آیا اسلام میں تزکیہ نفس معرفت حق کی جانب ایک راستہ ہے یا معرفت کا راستہ فقط دلیل، برہان اور استدلال ہے جو حکماء اور فلسفیوں کا راستہ ہے۔ بلاشبہ اس حد تک تزکیہ نفس کے راستے کو اسلام کی تائید حاصل ہے۔ رسول اکرمؐ کا ایک ارشاد ہے جسے شیعہ و سنی دونوں نے روایت کیا اور وہ مسلمات میں سے ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

۲۰۴

۹۲ جو شخص چالیس شب روز خالص اللہ کی یاد میں رہے تو خدا علم و حکمت کے چشمے اس کے قلب سے اس کی زبان پر جاری کر دے گا۔ (سفینۃ البحار - مادہ خالص)

جو شخص چالیس دن رات تک اپنے آپ کو خدا کے لیے خالص کر سکے یعنی چالیس دن رات تک خدا کی رضا کے علاوہ کوئی اور خواہش اس کے وجود پر حاکم نہ ہو۔ چنانچہ وہ خدا کے لیے یوں، خدا کے لیے خاموش رہے، خدا کے لیے دیکھے، خدا کے لیے آنکھیں بند کر لے، خدا کے لیے غذا کھائے، خدا کے لیے غذا چھوڑ دے، خدا کے لیے سوتے اور خدا کے لیے جاگے۔

یعنی اپنا لانا نچا نکل اس طرح ترتیب دے کہ سوائے خدا کے کئی سری چیز کے لیے قطعاً کوئی کام نہ کرے اور چالیس دن رات تک ہوا دھوس کو ترک کر دے تو وہ ابراہیمؑ خلیل اللہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ جن کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

۹۳ میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سراسر اللہ کے لیے ہے۔ (سورۃ الفام - آیت ۱۶۲)

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اگر کوئی شخص اس بات میں کامیاب ہو جائے کہ چالیس دن رات تک ہوا دھوس کو مکمل طور پر رخصت کر دے اور ان ۴۰ دن رات میں کوئی حرکت نہ کرے بجز اس کے کہ وہ خدا کے لیے ہو اور کوئی کام نہ کرے بجز اس کے کہ وہ خدا کے لیے ہو اور اس کی زندگی خدا کے سوا کسی اور کے لیے نہ ہو تو چالیس دن رات کے بعد معرفت اور حکمت کے چشمے اس کے اندر سے ابلتے

۲۰۵

اور اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بھی اس علم کو قبول کرتا ہے جسے ”علم افاضی“ کہتے ہیں۔ یعنی وہ علم جو انسان کے باطن سے ابھرتا ہے جبکہ اس سلسلے میں وہ عقلی علم کو قبول کرتا ہے کیونکہ خود اس کی دعوت دیتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ سے کہتا ہے:

۹۴ ہم نے اس کو اپنی بارگاہ سے ہمرہ ولایت دیا اور اسے اپنی طرف سے کچھ علم عنایت کیا۔ (سورہ کہف - آیت ۶۵)

ہمارا ایک بندہ ہے، تم جاؤ اور اس سے علم سیکھو۔

یعنی ہم نے اس بندے کو اپنے پاس سے علم عطا کیا ہے یعنی اس نے کسی بشر سے علم نہیں سیکھا، بلکہ ہم نے علم کو اس کے اندر اور باطن سے اُٹھا دیا ہے۔ چنانچہ اسلامی مباحث میں ”علم لدنی“ کا کلمہ بھی اسی آیت شریف سے لیا گیا ہے۔ حافظ شیرازی اپنی مرموز زبان میں حدیث کے معنی بیان کیے ہیں:

شبنم در سیر زینبی

ہمی گفت ایں معنا باقرینبی

کہ ای صوفی شراب آنگاہ شود صاف

کہ در شبشہ بمسند اربعینی

میں نے سنا کہ ایک راہگیر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ اے صوفی! شراب صاف اور تیز ہوتی ہے جبکہ وہ چالیس روز تک صراحی میں پڑی رہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

۹۵ اگر شیاطین بنی آدم کے دلوں کے ارد گرد حرکت نہ کرتے

۲۰۶

اور ان میں غبار اور تاریکی پیدا نہ کرتے تو یہ بنی آدم اپنے دل کی آنکھ کے ساتھ عالم ملکوت کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔

(معراج السعاده - صفحہ ۱۱)

آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے :

۹۶ اگر تمہارے دل خواہشوں میں نہ کھوئے ہوتے یا تم لمبی چوڑی باتیں نہ کیا کرتے تو جو میں سنتا ہوں، تم بھی سنتے۔

(مسند احمد حنفی - صفحہ ۲۶۶)

اس مضمون کی ایک اور روایت بھی آتی ہے :

۹۷ اگر تم لمبی چوڑی باتیں نہ کیا کرتے اور تمہارے لوں میں خیالی جمن نہ کھیلے رہتے تو تم وہ دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہ سنتے جو میں سنتا ہوں۔

(معراج السعاده)

یعنی اگر تم زیادہ بولنے والے نہ ہوتے کہ یہ زبان انسان کو بہت نقصان

پہنچاتی ہے۔ نیز اگر تمہارے دل کی حالت ایک باغی جیسی نہ ہوتی کہ جس میں

ہر جوان چرتا ہے تو جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھ سکتے اور جو میں سنتا ہوں

تم بھی سن سکتے تھے۔ یعنی ان اسرار و رموز کو دیکھنے یا سننے کے لیے انسان کا پیغمبر

ہونا ضروری نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ شخص بھی سن سکتا ہے جو پیغمبر نہ ہو۔

جیسے کہ حضرت مرثد سنا کرتی تھیں۔

امام علی علیہ السلام دس سال کے تھے جب وہ رسول اکرمؐ کی خدمت

میں آئے۔ وہ معبد میں بھی آنحضرتؐ کی ہمراہ تھے اور کوہ حرا میں بھی ان کے

ہمراہ تھے۔ جب رسول اکرمؐ پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ کی دنیا بدل گئی تھی۔

۲۰۷

اس وقت آپ غیب اور ملکوت سے جو آوازیں سن رہے تھے — وہ علیؑ بھی سن رہے تھے۔ جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں:

۹۸۔ جب آپ پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی۔ جس پر میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آواز کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ شیطان ہے جو اپنے پوجے جانے سے مایوس ہو گیا ہے۔ (اے علیؑ!) جو میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو، فرق اتنا ہے کہ تم نبی نہیں ہو، بلکہ میرے وزیر اور جانشین ہو اور تم یقیناً بھلائی کے راستے پر ہو۔

(منہج البلاغہ - مفتی جعفر حسین خطبہ ۱۹ صفحہ ۵۳۴)

لہذا نفس کی صفائی، اخلاص اور ہوا و ہوس کو دور کرنے کا اثر فقط یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں انسان کے قلب کو صاف کرتی ہیں، بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ اور بلند تر اثر رکھتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سے علم اور حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے: ایک دن اصحاب نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم میں نفاق کی کوئی بات تو نہیں! آپ دیکھیے کہ وہ مومن لوگ تھے لیکن انہوں نے اپنے اندر ایک ایسی حالت دیکھی کہ ان کے اندر خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم منافق نہ ہوں اور ہمیں پتہ بھی نہ چلے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: کیوں؟ انہوں نے عرض کیا: اس لیے کہ جب ہم آتے ہیں، آپ کی خدمت میں بیٹھتے ہیں، آپ باتیں کرتے ہیں، دعوت

۲۰۸

انفصاحت فرماتے ہیں، خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، قیامت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور بتاتے ہیں تو توبہ و استغفار کی بدولت ہم میں ایک بڑی اچھی اور بلند حالت پیدا ہو جاتی ہے لیکن بعد میں جب ہم آپ کے حضور سے رخصت ہوتے ہیں، اپنے بیوی بچوں کے پاس جاتے ہیں اور کچھ ان کے پاس بیٹھتے ہیں تو اچانک دیکھتے ہیں کہ ہماری پہلی حالت لوٹ آئی ہے اور ہم وہی پہلے والے آدمی ہیں۔ یا رسول اللہ! کیا یہ نفاق نہیں ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں، یہ نفاق نہیں ہے۔ نفاق دور ٹی ہے اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور جس کیفیت میں تم ہو وہ دو الگ حالتیں ہیں۔ یعنی بعض اوقات انسان کی روح بلند ہوتی اور اذیہ جاتی ہے اور بعض اوقات نیچے آ جاتی ہے۔ البتہ جب تم میرے پاس ہوتے ہو اور میری باتیں سنتے ہو تو قدرتی طور پر تم میں روح کی بلندی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر فرمایا کہ میرے پاس تم جس حالت میں ہوتے ہو اگر اس حالت پر باقی رہو تو:

۹۹ فرشتے آئیں اور تم سے مصافحہ کریں۔ پھر یہ کہ تم یا نبی کی سطح پر بھی چل سکتے ہو۔ (اصول کافی جلد ۲ باب تنقل احوال قلب)

اگر یہ حالت تم میں ایک ملکہ (فطرت ثانیہ) کی شکل میں باقی رہے تو تم ان مقامات پر پہنچ سکتے ہو۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہماری عرفانی ادبیات جو آجکل دنیا کے ادبی شاہکاروں کا جزو ہیں، ان میں جو خوبی ہے وہ اسلام کی بدولت ہے۔



## سبیل سکینہ

### جدد ابا ولطف آباد، پرنٹ نمبر ۱۸-۵۱

۲۰۹

اب استعمار کے کارندے جو جی چاہتے لکھیں، لیکن وہ تمام لطف جو مولوی معنوی میں ہے، حافظ شیرازی میں ہے، سعدی میں ہے اور ناصر خسرو میں ہے، غرض کہ جو لطف و حلاوت ان سب میں ہے وہ اسلام کی بدولت ہے۔ جیسا کہ حافظ نے تصریح کی ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، قرآن کی بدولت ہے، سعدی، شیرازی نے اس صاف باطنی اور غیبی چیزوں کو دیکھنے اور سننے کی قوت کو ایک اور شکل میں حضرت یعقوبؑ کی زبانی اس مطلب کو پیش کیا ہے:

یکی پرلید از آں گم گشتہ فرزند  
کہ ای روشن روان پیر خرد مند  
ز مصرش بوی پیرین شنیدی  
چراور چاہ کتانش ندیدی  
حضرت یعقوبؑ کہ جن کے بیٹے حضرت یوسفؑ گم ہو چکے  
تھے، ایک شخص نے ان سے یہ سوال کیا کہ اے روشن ضمیر بزرگ!  
آپ نے اپنے بیٹے کی خوشبو مصر سے عسوس کر لی لیکن اس  
کی کیا وجہ ہے کہ اپنے شہر کنعان کے کنوئیں میں اس کو نہ دیکھ  
پائے تھے؟

یہ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی داستان ہے، جب مصر میں حضرت  
یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اپنا تعارف کرایا اور اپنی قتیض انہیں  
دی اور کہا کہ یہ لے جاؤ وہ ابھی کنعان پہنچے نہیں تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام  
نے کہا:

۲۱۰

تِلہ یعنی اگر تم مجھے سٹھپایا ہوا نہ سمجھو تو میں یوسفؑ کی خوشبو  
سوگھ رہا ہوں۔ (سورہ یوسف۔ آیت ۹۴)

خوب! آپ نے ان کی قمیض کی خوشبو مصر سے تو سوگھ لی لیکن کنعان  
کے کنوئیں سے ان کی خوشبو محسوس نہ کی کہ جہاں آپ خود رہے تھے۔ یہ کیا ہوا  
اور کیونکر ہوا؟ آپ نے انہیں کنعان کے کنوئیں ہی میں کیوں نہ دیکھ لیا؟

یہ گفتا حال ما برق جہان است

دمی پیدا و دیگر دم نہاں است

حضرت یعقوبؑ نے جواب دیا کہ ہماری حالت کو ندی ہوئی، بجلی کی  
مانند ہے جو لحظہ پھر لے لیے کو ندی ہے اور دوسرے لحظے مُند ہو جاتی ہے۔

برقی از منزل یعلیٰ بدر نصیبِ سحر

وہ کہ با خرمنِ محنوں دل افکار چہ کرد

صبحدم بیلی کے گھر سے جو بجلی چمکی، اس نے دکھیا کے محنوں

کے دل و جان پر کچھ اور ہی اثر ڈالا۔

مثنویات میں برقی کی یہ تفسیر امیر المومنینؑ کے لیے بھی ہے، 'طیبة سعدی'

شیرازی کے سابق اندکڑ شعر میں کہا گیا کہ ہماری حالت کو ندی ہوئی، بجلی کی مانند  
ہے، 'وہ ایک لحظہ کے لیے کو ندی ہے اور دوسرے لحظے میں مند جاتی ہے۔'

یہاں تک تو اس سوال کا ذکر تھا جو حضرت یعقوبؑ سے کیا گیا اور وہ جواب  
جو انہوں نے دیا۔ اس کے بعد سعدی کہتے ہیں:

اگر درویشِ جاتی بماندی

سرو دست از دو عالم برکشاندی

اس وقت درویش کی جو حالت ہوتی ہے اگر وہ باقی رہے تو وہ  
دونوں جہان سے بھی اوپر چلا جاتا ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: میرے قرب میں تمہاری جو حالت ہوتی ہے اگر  
تم اس پر باقی رہو تو:

فرشتے آئیں اور تم سے مصافحہ کریں، پھر یہ کہ تم پانی کی سطح  
پر بھی چل سکتے ہو۔

اب ہم ان باتوں کی تائید کے لیے نبیؐ البلاغہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے  
فوجان جب نبیؐ البلاغہ میں سے کوئی بات سنتے ہیں تو وہ ان کے دلوں کو زیادہ  
لگتی ہے اور وہ ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے کئی بار کہا ہے کہ  
خود نبیؐ البلاغہ بھی امام علی علیہ السلام کی مانند ہے۔ کیونکہ انسان کا کلام خود  
اس آدمی کی مشعل ہوتا ہے۔ کلام انسان کی روح کا نزول ہے اور اس کی روح  
کی تجلی ہے۔ ایک بست روح کا کلام پست ہوتا ہے اور ایک بلند روح کا کلام  
بلند پایہ ہوتا ہے۔ ایک یک جہتی روح کا کلام یک جہتی ہوتا ہے اور  
ایک ہمہ جہتی روح کا کلام ہمہ جہتی ہوتا ہے۔

چونکہ امام علی علیہ السلام ایک جامع الاضداد شخصیت ہیں اس لیے  
ان کا کلام بھی جامع الاضداد ہے۔ ان کے کلام میں عرفان، عرفان کی روح  
فلسفہ۔ فلسفہ کی روح آزادی خواہی، آزادی خواہی کی روح شجاعت  
شجاعت کی روح — اور اخلاق، اخلاق کی روح ہے — مختصر یہ کہ آپ جو  
صفت بھی دیکھنا چاہیں اس کی مثال خود علیؑ ہیں جیسا کہ آپ اپنے ایک  
جامع کلام میں سالک کے متعلق فرماتے ہیں:

انشاء (سالم) مومن نے اپنی عقل کو زندہ رکھا اور اپنے نفس کو مار ڈالا۔ یہاں تک کہ اس کا ڈیل ڈول لاغراور تن و نوکش ہلکا ہو گیا۔ اس کے لیے بھرپور درخشندگیوں والا نور ہدایت چمکا کہ جس نے اس کے سامنے راستہ نمایاں کر دیا اور اسے سیدھی راہ پر لے چلے۔ مختلف دروازے اس کو دھکیلتے ہوئے سلامتی کے دروازہ اور دائمی قرار گاہ تک لے گئے اور اس کے پاؤں بدن کے ٹکاوے ساتھ امن و راحت کے مقام پر جم گئے۔ کیونکہ اس نے اپنے دل کو عمل میں لگائے رکھا اور اپنے پروردگار کو راضی و خوشنود کیا تھا۔

(بخاری المصنف جعفر حسین خطبہ ۲۱۷ صفر ۵۹۹ھ)

یوں سالم منزل بہ منزل بلند ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ اس آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے جو سلامتی کی منزل اور اس راستے کی انتہا ہے۔

اس بنا پر کامل انسان کے لیے ان حدود میں پہنچنے تک یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ ایک سالم انسان ہے یا نہیں؟ کیونکہ کامل انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہو جس نے تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کر لیا ہو۔

اسلام کہتا ہے: ہاں اس سے بھی کچھ بڑھ کر آیا اسلام کا مطلوبہ کامل انسان — ایک سالم انسان ہے؟ ہاں! وہ اس دروازے سے اس دروازے تک اور اس منزل سے اس منزل تک چلتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک دروازے تک پہنچتا ہے، جسے باب السلامتہ کہا جاتا ہے۔ آیا خدا سے قرب کی بات درست ہے؟ بلکہ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے

کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ ہاں وہ اپنے خدا کو بغیر کسی حجاب کے دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ پھر وہ ہماری طرح کا نہیں ہونا چاہتا کہ مشہور قول کے مطابق آسمان سے موثر تک پہنچے۔ جیسا کہ ہم آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تاکہ خدا کا نشان پائیں۔ زمین کی طرف دیکھتے ہیں تاکہ خدا کا نشان پائیں۔ لیکن اس سالک اور کامل انسان کے لیے خدا اس درخت کے پتے اور اس زمین و آسمان سے زیادہ ظہور رکھتا ہے۔

امام حسینؑ بھی یہی فرماتے ہیں :

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَمَا تَرَى سَوَاسِيَّيَ وَأَمَّا ظُهُورُ الْيَسَاءِ فَكَأَنَّهُ يَرَى  
لِيَهْ بِمَنْ هُوَ حَتَّى كَمَا تَرَى لِيَهْ مَطَرُ بَنِي كَيْتُ أَوْ اسْ وَقْتُ  
تَكْ پُوشیدہ اور اس کا محتاج ہے کہ کوئی راہنما تیری طرف  
رہنمائی کرے۔ کیا تو اس وقت تک دور ہے کہ کچھ نشانیاں  
تجھ تک رسائی کراویں۔ وہ آنکھ اندھی ہو کہ جو تجھے نہیں  
دیکھتی اور ان نشانیوں پر نظر جاتے رکھتی ہے۔

ایک شخص نے امام علی علیہ السلام سے پوچھا: کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟  
آپ نے فرمایا: میں نے جس خدا کو نہ دیکھا ہو اس کی ہرگز عبادت نہیں کرتا۔ پھر  
فرمایا: یہ خیال نہ کرنا کہ میں آنکھ سے دیکھنے کی بات کر رہا ہوں اور خدا کسی ایک  
سمت بیٹھا ہے۔

اس (خدا) کو آنکھیں ظاہری طور پر نہیں دیکھتیں  
لیکن دل اسے ایمان کی حقیقتوں کے ساتھ  
دیکھتے ہیں۔

میں تے اسے ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی آنکھ سے دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

اس حد تک عرفاء کے مجوزہ کامل انسان کی اسلام کی جانب سے تائید کی جاسکتی ہے لیکن مکتب عرفان کی طرف سے ایک چیز کی تحقیر کی گئی ہے اور اسلام اس کے ساتھ موافق نہیں ہے۔ عرفان میں علم اور عقل کی بہت تحقیر کی گئی ہے اور اسی دلیل کی بنا پر عرفان کا مجوزہ کامل انسان — ایک نیم کامل انسان ہے۔

اسلام جہاں دل کو قبول کرتا ہے وہاں عقل کی بھی تحقیر نہیں کرتا، جہاں دل کو قبول کرتا ہے وہاں عشق کو بھی قبول کرتا ہے اور سیر و سلوک کو بھی قبول کرتا ہے۔ لیکن وہ عقل، فکر، استدلال اور منطق کی تحقیر کرنے پر ہرگز تیار نہیں اور وہ ان کا بے حد احترام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فروغ اسلام کے بعد کی صدیوں میں ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا کہ جس نے دل اور عقل کو ساتھ ساتھ رکھا ہے۔

چنانچہ شیخ اشراق شہاب الدین سہروردی کا تقریباً یہی راستہ ہے اور ان سے پہلے صدر المتعالیہین ملا صدرا شیرازی ہیں جو ان لوگوں میں سے ہیں جو قرآن کی پیروی کرتے ہوئے عقل اور دل دونوں راستوں کا احترام کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ بوعلی سینا کی طرح دل کے راستے کی تحقیر کریں اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ بعض عرفاء اور صوفیوں کی طرح عقل کی تحقیر کریں بلکہ وہ دونوں راستوں کو محترم شمار کرتے ہیں۔

۱۔ بوعلی سینا نے کچھ مدت کے بعد دل یعنی عشق کے راستے کی تحقیر کا نظریہ ترک کر دیا تھا۔

پس معلوم ہوا کہ اسلام اس بات سے موافق نہیں کہ علم، عقل اور عشق کی تحقیر کی جائے۔ لہذا اس تحقیر کو اسلام کی تائید حاصل نہیں ہے۔ قرآن کا مطلوبہ کامل انسان وہ ہے جس نے عقلی کمال بھی پیدا کیا ہو اور عقلی کمال بھی اس کی شخصیت کا جزو ہو۔

ایک اور مسئلہ جو عرفان کے کامل انسان میں ہے اور اسلام اس کی تائید نہیں کرتا وہ یہ ہے :

عرفان میں انسان کا جھکاؤ فقط اندر کی طرف ہے یعنی باہر کا جھکاؤ اس اندر کے جھکاؤ میں دب گیا ہے۔ اس میں انفرادی پہلو زیادہ نمایاں ہے اور اجتماعی پہلو یوں کہیں کہ تقریباً مٹ گیا ہے یا اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ عرفان کا مجوزہ کامل انسان ایک اجتماعی انسان نہیں ہے، وہ ایک ایسا انسان ہے جو فقط اپنا سراپے گریبان میں ڈالے رکھتا ہے اور بس! لیکن اسلام کا مطلوبہ کامل انسان دل و عشق، سیر و سلوک، علم افاضی و معنوی اور تمدنی و نفس کے بارے میں تمام تر باتوں کی تائید کرتے ہوئے اپنے سے باہر بھی جھانکتا ہے، معاشرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنا سر گریبان میں نہیں ڈالے رہتا۔ اگر وہ رات کو اپنا سر گریبان میں ڈالے رہتا ہے اور دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیتا ہے تو دن کے وقت معاشرے کے درمیان سرگرم عمل بھی ہوتا ہے۔

حضرت امام حمادی علیہ السلام کے اصحاب کی تعریف یوں کی گئی ہے اور وہ ہمارے لیے کامل مسلمان اور کامل انسان کے نمونے ہیں۔ ان کے متعلق بہت سی روایات میں آیا ہے :



۴۷۔ وہ رات کے وقت مست راہب اور دن کے وقت

شیر نہ ہیں۔ (سفینۃ البحار، مادہ صعب)

اگر آپ رات کو ان سے ملنے جائیں تو آپ کچھ راہبوں سے ملنے جاتے ہیں جو پہاڑی کی ایک غار میں رہتے ہیں اور انہیں عبادت کے علاوہ کچھ نہیں سوچتے، لیکن دن کے وقت وہ شیرازہ ہوتے ہیں۔ یعنی رات کے راہب اور دن کے شیرازہ ہیں۔

خود قرآن مجید ان کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے :

۱۵۔ یہ لوگ تو یہ کہنے والے، عبادت کرنے والے، چم کرنے والے،

(ماطن میں) سفر کرتے والے، کوخ کرتے والے، سجدہ کرتے والے،

نیک کام کا حکم دینے والے اور برے کام سے روکنے والے اور

خدا کی حمد و ثناء کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ دوسرے رسول (ص)

مومنین کو خوشخبری دے دو۔ (سورہ توبہ - آیت ۱۱۲)

اس آیت میں توبہ کرنے والے سے سجدے کرتے والے تک تمام پہلو انسان کے باطن سے نطق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ”نیک کام کا حکم دینے والے اور برے کام سے روکنے والے ہیں“ تو یہاں باطن کے بعد وہ فوراً ان کے باہمی تعلقات اور معاشرے سے ان کے رابطے کو بیان کرتا ہے۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے :

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان

کے ساتھ ہیں کافروں یہ بڑے سخت اور اسی میں بڑے رحمدل

۲۱۷

ہیں، تو ان کو دیکھیے، کاکہ رکوع اور سجود میں جھکے خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواستگار ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر کثرتِ سجود سے گھٹے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف توریت میں اور یہی حالات انجیل میں بھی مذکور ہیں۔ وہ گویا جتنی ہیں جس نے پہلے زمین سے سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا تو وہ موٹی ہوئی۔ تب وہ اپنی جڑ پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور اپنی تازگی سے کسانوں کو خوش کرنے لگی تاکہ ان کی ترقی سے کافروں کو حیلانے، جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے خدا نے ان سے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

(سورہ فتح - آیت ۲۹)

رسول اکرمؐ اور آپ کے ساتھی ان لوگوں کے مقابلے میں جوتی اور حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں اور وہ لوگ جوتی اور حقیقت کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں، ان کے خلاف ثابت قدمی اور قوت کے ساتھ ڈٹ جاتے ہیں اور اہل ایمان کے لیے مکمل طور پر محبت، مہربانی، خیر اور رحمت ہیں۔ یہ معاشرے کی جانب ان کے جھکاؤ کا پہلو ہے اور پھر اس معاشرے کی جانب جھکنے والوں کو آپ رکوع کی حالت میں اور سجود کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ جب کہ وہ اپنے خدا سے فراخی مانگ رہے ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر قانع نہیں ہیں بلکہ بار بار زیادہ طلب کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو دنیا جمع کرنا چاہتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں، کیونکہ خدا کی رضا ان کے لیے ہر چیز سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ آپ ان

کے چہروں پر عبادت اور سجدوں کے اہتمام دیکھتے ہیں۔ یہ ایک اور نقطہ ہے جہاں تصوف کے کامل انسان میں ضعیف نظر آتا ہے۔ البتہ مکتب عرفان کے بہت سے پیشرو جو اسلامی تعلیمات کے سخت پابند تھے انہوں نے اس کی جانب توجہ دی اور اپنے کلام میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس پہلو میں کم و بیش افراط پیدا ہو گئی اور ”اندر“ کی جانب جھکاؤ اس حد تک پہنچ گیا کہ ”باہر“ کی جانب جھکاؤ معدوم ہو گیا ہے، مگر اسلام اس چیز کی تائید نہیں کرتا۔

ایک اور پہلو بھی ہے اور اس کا تعلق ”نفس کشی“ سے ہے۔ ہماری اسلامی تعبیرات میں ”نفس کشی“ کا لفظ نہیں ہے۔ اس کی بجائے ہمارے پاس ”مُؤَلِّوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا“ کی تعلیم ہے۔ یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ، اس میں تہذیب نفس کی جانب اشارہ ہے اور اس کی غرض نفس کی اصلاح ہے۔ تاہم شعرا کی تعبیروں میں ”نفس کو مارنا“ اور ”نفس کشی“ کا ذکر زیادہ آیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ دوسرے الفاظ بھی آتے ہیں جن کا مطلب اپنے آپ کو توڑنا اور اپنے آپ کو مارنا ہے۔ چنانچہ ہمارے عرفان میں خود میں نہ ہوتے، خود پسند نہ ہونے اور خود خواہ نہ ہونے کے موضوع پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اسلام کا وہ بنیادی نکتہ غفلت کا شکار ہو گیا۔ جسے ہم کرامت نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اس بارے میں کسی حد تک مفصل بحث ہے اور جیسا کہ میں نے تقریر کے شروع میں کہا تھا کہ عرفاء نے کامل انسان کے بارے میں جو بحث کی ہے وہ بڑی شیریں ہے۔ کیونکہ انہوں نے نظم و اثر کی ادبی زبان میں اپنا نظریہ کھل کر بیان کیا اور پھیلایا ہے، لہذا اس کا ہمارے

۲۱۹

معاشرے کے مقدر پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر ہم اس بلند پایہ اور عالی قدر انسان یعنی کامل انسان کو ویسا ہی سمجھتے ہیں، جیسا کہ عرفائے متعارف کرایا ہے۔ پس ضروری ہے کہ جس بلند مرتبہ انسان کو عرفا نے متعارف کرایا ہے۔ ہم اس کے بارے میں قدرے کھل کر بحث کریں۔  
میں نے اس وقت جو گفتگو کی ہے اس کی غرض یہ تھی کہ میں آپ سے عرض کروں کہ یہ ایک اور کمزور نقطہ ہے۔ انشاء اللہ کل رات میں اس موضوع کے کچھ دوسرے حصوں پر بحث کروں گا۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ  
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

## آٹھویں نشست

### کامل انسان کے بارے میں اسلامی نظریہ

وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول  
(محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو  
پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے، اس سے پہلے  
تو یہ لوگ کھلی گراہی میں پڑے تھے۔

(سورۃ جمعہ - آیت ۲)

ان راتوں میں ہماری یہ گفتگو اسلام کے نقطہ نگاہ سے کامل انسان کو  
پہچاننے کی ایک کوشش ہے۔

اس سے پیشتر ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان وہ واحد موجود ہے جو اپنی خصوصیت  
کو چھوڑ سکتا ہے۔ یعنی ہم کوئی ایسا بہتر نہیں لا سکتے جس میں پیچتر بن نہ ہو، ہمیں  
کوئی ایسی جلی نہیں مل سکتی جو جلی پین سے عاری ہو۔ کوئی ایسا کتا نہیں مل سکتا جو  
کتا بن نہ رکھتا ہو اور کوئی ایسا چیتا نہیں جو چیتا بن نہ رکھتا ہو، بلکہ جو بھی چیتا

دنیا میں آتا ہے وہ اپنی جبلت کی بنا پر وہ خصلتیں رکھتا ہے جنہیں ہم جیتا پن کہتے ہیں لیکن یہ انسان ہے جو انسان کی صفت یعنی انسانیت نہیں رکھتا اور ضروری ہے کہ وہ اسے حاصل کرے کیونکہ انسان کا انسان ہونا اسکے حیاتیاتی پہلو سے مربوط نہیں ہے یعنی وہ صفت جسے قدیم زبان میں انسانیت یا آدمیت کا نام دیا گیا۔ جیسا کہ سعدی نے کہا:

تن آدمی شریف است بہ جان آدمیت  
نہ ہمیں لباس زیباست نشان آدمیت

انسان کا جسم اس کی روح کی بدولت محرم ہے اور تنہا یہ مناسب جسم ہی آدمیت کی علامت نہیں ہے۔

تجمل طور پر بھی جانتے ہیں کہ محض اس لیے کہ انسان ایک زندہ موجود ہے یعنی علم حیاتیات کی رو سے ایک انسان ہے یا علم طب کی رو سے ایک انسان ہے تو یہ اس کو انسان کہنے کی کافی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا آدمی ہونا بجائے خود ایک الگ چیز ہے اور ہر وہ شخص جو ماں کے پیٹ سے آدمی کی صورت لے کر پیدا ہو وہ حقیقی معنوں میں آدمی نہیں ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

ملا شدن چہ آسان آدم شدن چہ مشکل

عالم دین بن جانا کتنا آسان اور انسان بننا کس قدر مشکل ہے یعنی جیسے انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ عالم بالفعل نہیں بلکہ عالم بالقوة ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ بالقوة انسان ہوتا ہے بالفعل انسان نہیں ہوتا۔ بالآخر بات یہ بنتی ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے ہر شخص کو آدمی بننا چاہیے اور ہر شخص کو انسان بننا چاہیے تو خود یہ انسانیت کیا چیز ہے؟ ایک ماہر علم حیاتیات

انسانیت کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا دنیا کے سخت سے سخت مادہ پرست مکاتب بھی انکار نہیں کرتے، تاہم اسے مادی پیمانوں سے پایا نہیں جاسکتا، اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ انسان خود اپنے لیے معنویت کا دروازہ ہے۔ ان میں سے ایک دروازہ انسان کا وجود ہے جس کے ذریعے وہ عالم معنات تک پہنچ سکتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ مادی مسائل کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں لیکن وہ محسوس نہیں ہوتیں۔ وہ چیزیں موجود ہیں چھوٹی نہیں جاسکتیں اور مستقل حیثیت رکھتی ہیں لیکن سمجھ بگاڑوں میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت ایک ایسی چیز ہے جو علم حیاتیات سے ماورئی ہے۔ حتیٰ کہ دنیا کے کٹر مادہ پرست بھی ایسے غیر مادی انسانی امور کے قائل ہیں۔ جنہیں انسانی قدروں کا نام دیتے ہیں۔

لہذا ہم چاہتے ہیں کہ اصل انسانی قدروں کو اسلام کی بنیاد پر پہچانیں یعنی ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اسلام اصل انسانی قدروں کو کیا تعریف کرتا ہے؟ ہم مختلف مکاتب کے خیالات پیش کر کے حسب تک ان پر تنقید کر لیں کہ جو حقیقی معنوں میں تنقید ہو، اس وقت تک ہم اس بارے میں اسلام کی پیش کردہ توجیہات کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تنقید فقط اعتراض کرنا نہیں بلکہ صرف کے عمل کی مانند ایک عمل ہے جو ایک صراف کسی سکے کے متعلق انجام دیتا ہے، یعنی وہ اسے کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اس کے کھوٹا کھرا ہونے کا پتا چلاتا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ مثلاً اس میں اتنے فی صد خالص سونا، اتنی خالص چاندی ہے اور اتنی ملاوٹ ہے۔ ہماری تنقید کے معنی ان سارے کے سارے نظریات کو رد کرنے کے نہیں ہیں۔ اس کی بجائے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ فلاسفہ عرفا



اور دوسرے مکاتیب نے جو نظریے پیش کیے ہیں، وہ اسلامی معیارات پر کس حد تک پورے اترتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب تک ہم مختلف مکاتیب کے خیالات پیش نہ کریں اور ان کا دقیق مطالعہ و تحقیق نہ کریں اس وقت تک ہم اسلام کے نقطہ نظر کو نہیں سمجھ سکتے۔ بصورت دیگر ہر شخص یہ دعوے کرے گا کہ انسانی قدریں یہ ہیں، وہ ہیں یا ان کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ پھر وہ مطمئن بھی ہو گا۔ کیونکہ کوئی شخص اسے یہ کہنے والا نہ ہو گا کہ جناب! یہاں ایک اور چیز بھی ہے یا یہ کیوں ہے اور وہ کیوں نہیں ہے؟ لیکن جب مختلف مکاتیب کا مطالعہ کر لیا جائے ان پر تنقید ہو جائے اور انہیں اسلامی معیار پر جانچ لیا جائے تو ہم متعلق اور استدلال کی بنا پر تدبیریں کریں گے جناب۔ اسلام نے انسان کے بارے میں یہ اور یہ قدریں معین کی ہیں۔ پھر ان حساسیتوں کی بنا پر جن کی اسلام نے اس سلسلے میں خود نشانہ دی کی ہے، ہم ان مکاتیب کی بتائی ہوئی انسانی قدروں کی فی صد قیمت بتا سکتے ہیں یعنی اس میں کتنے فی صد حقیقت ہے اور اس میں کتنے فی صد! بعض اوقات کچھ لوگ جلدی میں ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: جناب! جہاں تک ہو سکے آپ ہمیں جلدی سے بتائیں کہ اصل اسلامی قدریں کیا ہیں تاکہ ہم انہیں سمجھ لیں لیکن اگر مکاتیب کا مطالعہ کیے بغیر ہی انہیں کچھ بتایا جائے تو وہ درست نہیں ہو گا۔ لہذا کچھ بتانے سے پہلے ہم دیگر مختلف مکاتیب کا مطالعہ کر کے ان پر تنقید کریں گے۔

گزشتہ نشست میں ہماری بحث مکتب عرفان کے بارے میں تھی۔ مکتب عرفان — حتیٰ کہ اسلامی عرفان کہ جو دوسرے عرفانی نظریوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں اسلامی تعلیمات کا اثر بہت زیادہ ہے اور

کامل انسان کے بارے میں اس کا نظریہ اسلام کے کامل انسان کے بہت نزدیک ہے، لیکن اس کے باوجود بھی وہ تنقید کے قابل ہے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ مکتب عرفان — ”کامل انسان“ کے بارے میں قدیم اور جدید مکاتب کے مقابلے میں زیادہ علم رکھتا ہے، پھر بھی یہ تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔

پچھلی نشست میں عرفان کے مطلوبہ کامل انسان پر ہم نے دو میں سے ایک اعتراض کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں ہم نے کہا تھا کہ انہوں نے عقل کی بجد تحقیر کی ہے، بلکہ بعض اوقات وہ عقل کو بے اعتبار ٹھہراتے اور عشق کو عقل سے بالاتر قرار دیتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بقول حافظ:

جناب عشق را در گہ بسی بالاتر از عقل است  
جناب عشق کا مقام — عقل سے بالاتر ہے۔

وہ عقل کی تحقیر کے معاملے میں کبھی کبھی افراط کی حد تک بھی بڑھ گئے ہیں۔ یعنی بنیادی طور پر انہوں نے تعقل، تفکر، منطقی، استدلال اور زبان کو سخت بے اختیار قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ اسے حجاب الصغر کا نام دیا ہے چنانچہ اگر انہوں نے دیکھا کہ ایک حکیم فلسفی عقل کے دستے سے کسی روحانی مقام پر پہنچ گیا ہے تو وہ اس پر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ اس بارے میں ایک مشہور داستان بھی ہے جو بعض کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔

بوعلی سینا کا زمانہ جو تھنی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے اوائل کا ہے اور اس کی وفات ۴۲۸ ہجری میں واقع ہوئی۔ یہ عظیم مشائی، عقلی اور خشک حکیم — ایک بہت عظیم غارف، ابو سعید ابو الحیر کا ہم عصر

تھا۔ بوعلی اپنی جائے پیدائش ماوراء النہر (بلخ و بخارا) میں رہا کرتا تھا۔ بعد میں وہ سلطان محمود کے ڈر کے مارے وہاں سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ سلطان اسے اپنے دربار میں لے جانا چاہتا تھا اور وہ اس پر تیار نہ تھا چنانچہ وہ نیشاپور آیا اور وہاں اس نے ابوسعید ابوالخیر سے ملاقات کی۔

کہتے ہیں کہ انہوں نے تین دن رات ایک دوسرے کے ساتھ خلوت کی اور باہم گفتگو کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ نماز یا جماعت ادا کرنے کے علاوہ باہر نہیں آتے تھے۔ بعد میں جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور بوعلی سینا وہاں سے چلا گیا تو اس سے پوچھا گیا: تم نے ابوسعید کو کیسا پایا؟ بوعلی سینا نے کہا: جن چیزوں کو ہم نقل کے ذریعے درک کرتے ہیں وہ اسکا پس منظر کے ذریعے مشاہدہ کرتا ہے اور جب ابوسعید سے سوال کیا گیا کہ تم نے بوعلی سینا کو کیسا پایا؟ تو ابوسعید نے جواب دیا: جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اندھا بھی اپنی لاکھڑی کے سہارے وہاں آجاتا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم جس باطنی مقام پر بھی پہنچے وہ اندھا لاکھڑی ٹیکتا ہوا ہمارے پیچھے آتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل عرفان عقل کی ہر ت زیادہ حقیر کرتے ہیں ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم قرآن کی منطق کو ایک طرف رکھیں اور عقل کے متعلق عرفان کی منطق کو دوسری طرف رکھیں تو یہ آپس میں میل نہیں کھاتیں۔ عرفان کے مقابلے میں قرآن عقل استعمال کرنے پر زور دیتا ہے اور عقل کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس نے عقل و فکر حتیٰ کہ خالص عقلی استدلال پر تنبیہ کیا ہے۔

عرفا فر خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی — اپنے سلسلوں کو امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے منسلک کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عرفا فر نیز منقصب ترین شیعوں کے نزدیک بھی عرفان کا سلسلہ امام علی علیہ السلام پر منتهی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے

کہ ان کے ساٹھ ستر سلسلوں میں سے فقط ایک سلسلہ ایسا ہے جسے وہ ابو بکر پر ختم کرتے ہیں۔ وہ امام علی کو قطب العارفین سمجھتے ہیں اور بقول ابن ابی الحدید ان عرفانے جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھا۔ آپ نے تیج البلاغہ میں اسے چار سطروں میں بیان کر دیا ہے لیکن ایک دوسرے مقام پر آپ گویا فلسفی بن جاتے ہیں اور ایسا فلسفیانہ اور عقلی استدلال کرتے ہیں کہ کوئی فلسفی آپ کی گردن تک بھی پہنچ پاتا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام علی علیہ السلام ہرگز عقل کی تحقیر نہیں کرتے۔

لہذا یہاں اسلام کا مطلوبہ کامل انسان — عرفان کے مطلوبہ کامل انسان سے اس بنا پر مختلف ہے کہ اسلام نے کامل انسان کے وجود میں تسلسل ترقی کرتی ہے جب کہ عرفان کا پروردہ کامل انسان عقل کی تحقیر کرتا ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے؛ از خود بطلب ہر آنچه خواہی کہ دہی۔

یعنی جو چیز تو چاہتا ہے کہ مجھے دی جائے وہ اپنے آپ سے طلب کر۔ اپنے آپ سے طلب کرنے کے معنی ہیں کہ اپنے دل سے طلب کر اور اپنے اندر سے طلب کر!

عرفان ایک ایسا مکتب ہے جس کا جھکاؤ اندر کی طرف ہے اور وہ کہتا ہے کہ ”دل سے طلب کر۔“

کیونکہ اس مکتب کے خیال میں ”دل“ ساری دنیا سے وسیع اور عظیم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ ساری دنیا کو ایک طرف رکھ دیں تو دل ساری دنیا سے بڑا ثابت ہوگا۔ ان کے نزدیک دل سے مراد وہ روح الہی ہے جو ہر انسان میں پھونکی گئی ہے :

۲۲۷

نئے تو جس وقت میں اسکو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس  
میں اپنی طرف سے رُح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے  
سامنے سجدے میں گر پڑنا۔ (سورہ حجر۔ آیت ۲۹)

وہ دنیا کو انسان صغیر (چھوٹا انسان) اور دل کو انسان کبیر (بڑا انسان)  
کہتے ہیں۔ چونکہ وہ دنیا اور دل کو دو مختلف عالم سمجھتے ہیں، اس لیے دنیا کو  
عالم صغیر اور دل کو عالم کبیر کہتے ہیں۔ جبکہ ہم اس دنیا کو عالم کبیر کہتے ہیں اور وہ  
اسے عالم صغیر کہتے ہیں۔ گویا کہ اہل عرفان کے نزدیک یہ دنیا انسان صغیر ہے اور  
انسان کبیر وہ چیز ہے جو آپ کے اندر وجود رکھتی ہے۔

جیسا مولوی معنوی نے کہا ہے:

مگر تو آدم زادہ ای چوں اوشین  
جسد ذرات را در خود بین  
چہیت اندر خم کا ندر نہر نیست  
چہیت اندر خانہ کا ندر شہر نیست  
ایں جہان خم است دل چوں منہر آب  
ایں جہان حجرہ است دل شہری محباب  
اگر تو آدم کا بیٹا ہے تو اسی کی طرح ایک جگہ بیٹھ جا اور دنیا  
کی ہر چیز کو اپنے ہی اندر دیکھ لے۔  
وہ کیا چیز ہے جو تالاب میں ہے اور دریا میں نہیں یا وہ کیا  
چیز ہے جو گھروں میں ہے اور شہر میں نہیں ہے؟  
یہ دنیا تالاب اور دل ایک دریا ہے، یہ دنیا گھر ہے اور دل

ایک شہر ہے۔ (مثنوی مولانا روم - صفحہ ۳۶۰)  
 کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز گھر میں ہو اور شہر میں نہ ہو۔ جبکہ خود گھر  
 بھی شہر کا ایک جزو ہے۔ پس جو کچھ گھر میں ہے وہ اس کا نمونہ ہے جو  
 شہر میں ہے۔

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز پانی کے تالاب میں ہو اور نہر میں نہ ہو؟  
 جو کچھ تالاب میں ہے وہ اس چیز کا ایک چھوٹا سا جزو ہے جو دریا میں ہے۔  
 کیا انسان گھر کی تلاش میں جاتا ہے یا شہر کی تلاش میں؟ ظاہر ہے کہ جس کا  
 گھر شہر میں ہو وہ شہر کی تلاش میں جاتا ہے۔ کیا انسان ایک تالاب اور چھوٹے  
 سے برتن کی تلاش میں جاتا ہے یا دریا کی تلاش میں؟ ظاہر ہے کہ وہ پانی  
 کے ایک چھوٹے سے برتن کی تلاش میں نہیں بلکہ دریا کی تلاش میں جاتا ہے۔  
 معلوم ہوا کہ عرفان کی بنیاد اندر کی جانب جھکاؤ، دل کی طرف توجہ، باطن  
 کی طرف میلان اور باہر سے قطع تعلقی پر قائم ہے اور حدیہ ہے کہ وہ باہر کی  
 قدر و قیمت کی نفی کرتا ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا ہم اپنے مطلوب یعنی حق  
 کو باہر کی دنیا سے حاصل کر سکیں گے، تو عرفان و تصوف کہتا ہے کہ نہیں!  
 بلکہ اسے اندر ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے :

ساہما دل طلب جام جم از ما می کرد  
 آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

گو ہری کز صدف کون و مکاں بیرون بود  
 کہ طلب از گمشدگان لب دریا می کرد

بی دلی در ہمہ احوال خدا با او بود  
 او نمی دیدش از دور خدایا می کرد  
 مشکل خویش بر پیر معصاں بردم دوش  
 کو بہ تائبہ نظر حل معصی می کرد  
 گفتیم این جام جهان بین بتو کی داد حکیم  
 گفت آن روز کہ این گنبد مینا می کرد  
 گفت آن یار کز او هست سردار بلند  
 جرمش آن بود کہ اسرار ہویدا می کرد

دل نے ہم سے برسوں روشنی طلب کی ہے، جو پتہ خود اس  
 کے پاس تھی وہی غیر سے مانگتا رہا۔

وہ موتی جو زمین و آسمان کی حدوں کے پار ہے، دل اس کی طلب  
 ان سے کرتا ہے جو ساحل سمندر پر بھٹکتے پھرتے ہیں۔

دل سے نا آشنا شخص کہ خدا ہر وقت اس کے ساتھ تھا، وہ  
 اسے دیکھ نہ سکا اور اے خدا! اے خدا! کہہ کر دور سے پکارتا رہا۔  
 میں اپنی یہ آنکھیں لے کر اپنے مرشد کے پاس گیا جو اپنی نگاہ باطن  
 سے ایسی گرہیں کھول دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کو یہ آئینہ کب ملا تھا؟ اس نے کہا جس  
 دن کہ یہ نیلا آسمان بنایا گیا تھا۔

اس نے وہ بات کہی جس سے اس کو سولی پر لٹکا دیا گیا،  
 اس کا جرم یہ تھا کہ راز حقیقت کو فاش کرنا تھا۔



اپنے باطن کی طرف اس توجہ میں عرفان وہاں تک آگے بڑھ گیا ہے، جہاں تک آپ کی سوچ پہنچتی ہے، اس بارے میں مولوی معنوی نے مثنوی کی چھٹی جلد میں ایک تمثیلی داستان بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

ایک آدمی خزانے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ خدا سے دعا کرتا اور کہتا: اے پروردگار! وہ سب لوگ جو دنیا میں آئے۔ انہوں نے خزانے جمع کیے اور پھر زمین میں دفن کر دیے۔ ایک وقت وہ دنیا سے خود بھی چلے گئے اور ان کے خزانے زمین کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ اے خدا! ان خزانوں میں سے کسی ایک کا پتہ مجھے بتا دے۔ وہ مدتوں رات سے صبح تک گریہ رازی کرتا رہا۔ آخر کار ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ ایک شخص نے اس سے پوچھا: تم خدا سے کیا چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا: خدا سے خزانہ لینا چاہتا ہوں۔ اس شخص نے کہا: میں خدا کی طرف سے مامور ہوں کہ تمہیں خزانے کا پتہ بتاؤں۔ اس نے کہا: بہت خوب!

پھر اس شخص نے ایک جگہ کی نشاندہی کی اور کہا: تم تیرا کمان لے کر فلاں ٹیلے پر جاؤ اور ایک تیرا کمان میں جوڑ کر پھینکو۔ تمہارا وہ تیرا کمان جا کر گئے گا وہیں خزانہ دفن ہے۔ جب وہ شخص جاگا اس نے خیال کیا کہ یہ بڑا واضح خواب ہے۔ وہ کہنے لگا: میں ابھی وہاں جاتا ہوں، جو نشانیاں بتائی گئی ہیں یا تو درست ہیں یا درست نہیں ہیں۔ اگر نشانیاں درست ہیں تو پھر میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ چنانچہ وہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ تمام نشانیاں درست ہیں اور مجھے فقط ایک تیرا ہی پھینکنا ہے۔ جہاں وہ تیسرے گئے گا وہاں سے مجھے خزانہ مل جائیگا۔

وہ دل ہی دل میں کہنے لگا: اوہو! مجھے خواب میں یہ تو بتایا ہی نہیں گیا کہ تیر کس طرف پھینکنا ہے۔ پھر بولا: اس وقت تو میں قبلہ کی سمت کو تیر پھینکتا ہوں! خدا نے چاہا تو خزانہ اسی طرف سے برآمد ہوگا۔ چنانچہ اس نے کمان میں تیر جوڑا اور پوری قوت کے ساتھ قبلہ کی طرف پھینک دیا۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کے لیے ادھر نگاہ ڈالی کہ تیر کہاں گر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ کدال اور بیلچہ لے کر گیا۔ تیر گرنے کی جگہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ تاہم اس نے جتنی گرائی تک کھودا خزانہ نظر نہ آیا۔ تب اس نے سوچا کہ اب مجھے کسی اور طرف تیر پھینکنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اس نے قبلہ اس نے شمال کی طرف تیر پھینکا، لیکن خزانہ نہ ملا۔ پھر بڑی دیر تک وہ جنوب مشرق، جنوب مغرب، شمال مشرق، شمال مغرب کی سمتوں میں تیر پھینکنا رہا۔ لیکن خزانہ کہیں سے بھی نہ ملا۔ وہ شخص اس صورت حال سے اذہر پریشان ہو گیا۔

وہ دوبارہ مسجد میں آیا اور کہنے لگا: اے پروردگار! یہ تو نے میری کیسی رہنمائی کی کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بعد وہ بڑی مدت تک پیٹنے کی طرح نالہ و ناری کرتا رہا۔ کچھ عرصہ گزر گیا تو اس نے اسی شخص کو دوبارہ خواب میں دیکھا۔ اس نے اسے سرزنش کی اور کہا کہ تو نے مجھے غلط نشانیاں بتائی تھیں۔ اس نے پوچھا: کیا تمہیں وہ جگہ مل گئی؟ اس نے جواب دیا: ہاں! اس نے پوچھا: پھر تو نے کیا کیا؟ اس نے جواب دیا: میں نے تیر چلے پر چڑھایا اور پوری قوت کے ساتھ قبلہ کی جانب چلا دیا۔ اس نے کہا: میں نے کب کہا تھا کہ تیر قبلہ کی جانب پھینکنا اور یہ کب کہا تھا کہ کمان قوت کے ساتھ کھینچنا۔ میں نے تیر کھینچنے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ تیر جہاں کہیں

۲۳۲

گرے گا — وہیں سے خزانہ ملے گا۔

دوسرے دن وہ کدال، بیلچہ اور تیر کمان لے کر اس جگہ پہنچا — تیر کمان میں رکھا اور کہنے لگا: اب دیکھیے کہ تیر کہاں جاتا ہے؟ جب اس نے تیر چھوڑا تو دیکھا کہ وہ اس کے پاؤں کے قریب ہی گر رہا ہے۔ تب اس نے اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھودی اور اسے معلوم ہوا کہ خزانہ وہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر مولوی معنوی کہتے ہیں:

اے حق است اقرب از حیل الوریث

تو فکری تیر فکر را بعید

ای کمان و تیر ہا بر تاخت

گنج نزدیک و تو دور انداخت

حقیقت تو تیری شاہرگ سے بھی قریب تر ہے اور تو اپنے

خیالی تیر اور دھڑا دھڑھینکتا ہے۔

اے تیر کمان والے شکاری (سانک)، خزانہ تیرے نزدیک

ہے اور تو دور دور خیال دوڑاتا ہے۔

(مثنوی مولانا روم، صفحہ ۵۸۵)

ماضی قریب کے ایک عالم و فاضل کا بیان ہے کہ میں نے بیستان

ایک واعظ سے پڑھی جو عرفان کا ذوق رکھتا تھا اور اسے مثنوی پر بھی عبور

حاصل تھا۔ اس وقت میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس قصے کا مطلب کیا ہے؟

میں نے واعظ سے پوچھا: مولوی معنوی، اس داستان میں کیا کہنا چاہتے

ہیں؟ وہ خود بھی اہل حال لوگوں میں سے تھا اور اس نے جواب میں اس

۲۳۳

ایک جملے سے زیادہ کچھ نہیں کہا :

۱۰ اور خدا کی نشانیاں خود تمہارے اندر بھی ہیں تو کیا تم

دیکھتے نہیں ہو ؟ (سورۃ ذاریات - آیت ۲۱)

یعنی مولوی معنوی کہنا چاہتے ہیں : اس خزانے کا نشان خود تمہارے

اندر ہے ، اس بنا پر اسے اپنے آپ سے طلب کرو۔ دل ایک عجیب شہر

ہے۔۔۔ دنیا ایک مٹکا اور دل تھر ہے۔۔۔ دنیا ایک گھر ہے اور

دل شہر ہے۔ عرفان میں ایسی چیزوں پر غیر معمولی تکیہ کیا گیا ہے۔ لیٹی کتب

عرفان میں یاہر کی دنیا (فطرت) کی بے حد تحقیر کی گئی ہے۔ اہل عرفان کے

ہاں فطرت کا تعارف ایک چھوٹی کتاب کے طور پر بھی نہیں کرایا جاتا۔ حالانکہ

امیر المومنینؑ سے منسوب کلام میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے : دنیا عالم

اکبر اور انسان عالم اصغر ہے۔

۱۱ تیری دوا تیرے اندر ہے اور تجھے خبر نہیں۔ مرض تیرے

ہی پاس سے ہوتا ہے اور تو سمجھتا نہیں۔

تو ایک کھلی کتاب ہے کہ جس سے چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو

جاتی ہیں۔

کیا تو سمجھتا ہے کہ تو ایک حقیر کیڑا ہے اور تیرے اندر یہ بڑی

وسیع دنیا سمٹ کر آگئی ہے۔ (کلام امیر المومنین علیؑ)

اب اگر ہم عرفان کی اس منطق کو قرآن کی منطق کے سامنے رکھیں تو

اگرچہ اس میں بہت سے مثبت پہلو موجود ہیں، لیکن از روئے قرآن یہ منکر کی

منطق ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن — فطرت سے اتنی بے اعتنائی

۲۳۴

نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے نزدیک آفاق و انفس کی آیات ایک دوسری کے پہلو میں ہیں

۹۔ ہم عنقریب ہی اپنی نشانیاں اطراف میں اور خود ان

کے اندر دکھا دیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ

وہی یقیناً حق ہے۔ (سورۃ خم سجدہ - آیت ۵۳)

اگرچہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کے لیے بلند ترین اور اعلیٰ ترین معرفت

خود اس میں ہے اور اس کے باطن ہی سے ہاتھ آتی ہے۔ تاہم ایسا بھی نہیں

ہے کہ اس کے مقابل عام فطرت کی کوئی وقعت ہی نہ ہو۔ کیا فطرت خدا کی

نشانی اور خدا کا آئینہ نہیں اور فقط دل ہی خدا کا آئینہ ہے؟ ہمیں

بلکہ جس طرح دل خدا کا آئینہ ہے، اسی طرح فطرت بھی خدا کا آئینہ ہے۔

یہاں ایک بہت ہی دقیق نکتہ ہے اور اسی کی بنیاد پر میں بالخصوص مکتب

عرفان کے بارے میں زیادہ بحث کر رہا ہوں۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ مباحث

میں کہا ہے کہ ہماری رحوں کے ساتھ مکتب عرفان کا نسبتاً زیادہ رابطہ رہا ہے

کیونکہ فلسفیوں کی باتیں خود ان کے لیے تھیں اور ان کی کتابیں عام لوگوں کو نہیں

پڑھائی گئیں۔ یعنی وہ عوام کے ہاتھوں تک نہیں پہنچیں لیکن مکتب عرفان میں

جو ذوق ہے، جوش ہے، حرارت ہے اور جو حسن و جمال ہے، اس کی بدولت

وہ ہمارے گھر میں نفوذ رکھتا ہے۔ چنانچہ مولوی معنوی ہمارے سب گھروں

میں نفوذ رکھتے ہیں، سعدی ہمارے سب گھروں میں نفوذ رکھتے ہیں اور حافظ

بھی ہمارے سب گھروں میں نفوذ رکھتے ہیں۔

لہذا اس مکتب کی خوبیوں نے انسان کی بہت خدمت کی ہے اور اگر

ان لوگوں میں سے چند ایک کے کلام میں کوئی انحراف یا لغزش واقع ہوئی تو

وہ بھی اپنی جگہ بڑا اثر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے مکتب فلسفہ کے مقابلے میں مکتب عرفان پر زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے۔

## انسان کا فطرت سے رابطہ

یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ کیا فطرت سے انسان کا رابطہ ایک بیگانے کا بیگانے سے رابطہ ہے؟ کیا یہ رابطہ سو فیصد بیگانے موجود سے رابطہ ہے؟ حتیٰ کہ اس سے بھی بڑھ کر کیا یہ رابطہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قیدی کا قید خانے سے، ایک پرندے کا پتھر سے اور یوسفؑ کا چاہ کھان سے رہا ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ فطرت ہمارے لیے ایک قید خانہ ہے، ایک کنوئیں ہے یا ایک پتھر ہے تو پھر اس سے ہمارا رابطہ — ضد سے ضد کا رابطہ ہوگا۔

اس صورت میں فطرت کے حصار میں ہماری کوشش کیا ہونی چاہیے؟ ہاں پتھر کے میں بند پرندے کی کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے نجات دلائے۔ اس کو کسی چیز سے غرض نہیں اور اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ اس سے بچرے سے چھٹکارا پائے۔ ایک قیدی کا قید خانے میں سوائے اس کے کوئی کام نہیں کہ اگر ہو سکے تو دیوار توڑ کر بھاگ نکلے۔ یوسفؑ کو کنوئیں میں اس کے علاوہ کسی چیز کا انتظار نہیں تھا کہ کہیں سے کچھ مسافر آئیں اور پانی کے لیے

ڈول کنوئیں میں ٹکائیں تو آپ اس کے ذریعے اوپر آجائیں۔ کیا قرآن اور اسلام — عالم فطرت کے ساتھ انسان کے رابطے کو قیدی اور قید خانے، یوسفؑ اور کنوئیں — اور پرندے اور پتھر کے ساتھ رابطہ سمجھتا ہے؟ پھر کیا وجہ ہے

کہ عرفان میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔

۲۳۶

سنائی کہتے ہیں :  
 قفس بشکن چو طاووسان یکی بر پر بر این بالا  
 موروں کی طرح پنجرہ توڑ کر ایک دم آسمان پر اڑ جا !  
 بقول دیگر :

ای یوسفؑ مصر در آئی از چاہ  
 لے ملک مصر کے سلطان یوسفؑ اس کنوئیں سے نکل جا !  
 لیکن اسلام کی نظریں عالم فطرت سے انسان کا کسان اور کھیتی جیسا  
 رابطہ ہے۔ ایک سوداگر کا بازار تجارت سے رابطہ ہے اور ایک عابد کا معبد سے  
 رابطہ ہے۔ ایک کسان لے بیج کھیتی ہدف نہیں بلکہ وسیلہ ہے۔ یعنی اس کا گھر  
 تو شہر میں ہے لیکن وہ اس کھیتی سے اپنی خوشی اور خوش بختی کے وسائل حاصل  
 کرتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ وہ اس زمین کو آباد کرے۔ کھیت پر جائے،  
 ہل چلائے، بیج بوئے اور اگر گندم کے ساتھ گھاس پھونس اگائے تو اسے  
 اکھاڑ پھینکے، پھر فصل کاٹے، اسے گا ہے اور غلہ گھر لے آئے۔ یہ ہوتے  
 ہیں اس کے کرنے کے کام !

تاہم اگر ایک کسان اپنی کھیتی کو اپنا گھر سمجھ لے تو یہ اس کی غلطی ہے لیکن  
 پھر بھی کھیتی کے ایک کھیتی ہونے کی بابت اسے غلطی نہیں کھانی چاہیے۔ ایک  
 سوداگر کے لیے بازار کام کی جگہ ہے۔ یعنی وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنا سرمایہ  
 لگانا اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں اضافے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان  
 کے لیے بھی یہ دنیا ایک ایسی ہی چیز ہے۔

جیسا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ﷺ یہ عالم آخرت کی کھیتی ہے۔



۲۳۷

حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

اللہ یہ دنیا دوستانِ خدا کی تجارت گاہ ہے۔

(بخ البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۱۳۱ صفحہ ۸۴۶)

ایک شخص امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور دنیا کی مذمت کرتی شروع کر دی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ امام علیؑ دنیا کی مذمت کرتے ہیں، لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ دنیا کی کس چیز کی مذمت کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دنیا کی — مثلاً عالم فطرت کی مذمت کرتے ہیں، سو حق پرستی اور حقیقت پرستی کی ضد اور تمام انسانی قدروں کی نفی کے مترادف ہے۔ اس نے کہا: دنیا پر ہی جگہ ہے۔ اس پر امام علیؑ برہم ہو گئے اور فرمایا:

”اے دنیا کی برائی کرنے والے اور اس کی غلط سلط باتوں کے

دھوکے میں آنے والے! تم اس پر گرویدہ بھی ہوتے ہو اور پھر

اس کی مذمت بھی کرتے ہو۔ کیا تم دنیا کو مجرم بھڑانے کا حق

رکھتے ہو یا وہ تمہیں مجرم بھڑائے تو حق یہ جان ب ہے؟

(بخ البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۱۳۱ صفحہ ۸۴۵)

میں نے اس بارے میں ایک مثل بیان کی ہے اور وہ کچھ اس طرح ہے:

ایک بڑھیا مصنوعی بناؤ سنگھار کے ساتھ آتی ہے اور ایک جوان

کو دھوکا دیتی ہے۔ اس کے دانت بھی مصنوعی ہیں اور سر کے بال بھی مصنوعی

ہیں۔ لیکن وہ بیچارہ خیال کرتا ہے کہ یہ ایک نوجوان عورت ہے۔ پھر اچانک

اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مجھ سے غلطی ہوتی ہے۔ اس کے بعد

وہ بڑھیا — بڑھیا ہی کے روپ میں آکر کہتی ہے:

میری عمر زیادہ ہے۔ میرے منہ میں ایک دانت بھی نہیں، میرے سر کے بال بھی مصنوعی ہیں اور بس میں ایسی ہوں جیسی نظر آتی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ نکاح کرنے کو تیار ہو؟ اگرچہ وہ کہا کرے کہ میرے دانت نہیں ہیں اور میری زلفیں بھی نہیں ہیں لیکن پھر بھی وہ جو ان کہے کہ یہ سب قابلِ تعریف باتیں ہیں تو درحقیقت اس عورت نے اسے دھوکا نہیں دیا بلکہ خود اس جوان نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔

انام علیٰ فرماتے ہیں :

جب دنیا نے کوئی چیز مخفی نہیں رکھی تو پھر اس نے تجھے دھوکا کب دیا ہے؟ کیا دنیا نے تجھے اس دن کا دھوکا دیا جس دن تو نے اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں دفن کیا؟ دنیا کہتی ہے میں جو رہوں سو رہوں اور مجھ میں ثبات نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے تو مجھے ایسی ہی سمجھ جیسی کہ میں ہوں۔ تو مجھے اس طرح کیوں باور کرنا چاہتا ہے۔ جیسے تو خیال کرتا ہے۔ حالانکہ میں ایسی نہیں ہوں، پس دنیا فریب نہیں دیتی۔

جیسا کہ سلسلہ بیان میں فرمایا، اسے انسان ادھر آکر صاب کویں۔ کیا تو نے دنیا پر سختی کی ہے یا دنیا نے میرے ساتھ سختی کی ہے؟ تو خود اس دنیا کو دھوکا دے رہا ہے یا دنیا تجھے دھوکا دے رہی ہے؟ اس نے تجھے کب دھوکا دیا ہے اور کب گمراہ کیا ہے؟ وہ تو ہی ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چل پڑا ہے۔ پھر یہ بھی فرماتے ہیں : دنیا اولیاء اللہ کی تجارت کا بازار ہے اور خدا کے دوستوں کی مسجد ہے۔ اگر مسجد نہ ہو تو کیا عابد عبادت کر سکتا ہے؟ اگر بازار نہ ہو تو کیا سوداگر تجارت کر کے نفع کما سکتے ہیں؟

۲۳۹

دنیا انسان کے لیے ایک قید خانہ ہے، کنواں ہے یا پنجرہ ہے اور انسان کا وظیفہ اس پنجرے اور اس کنویں سے باہر نکلنا ہے۔ یہ روح اور نفس کی معرفت اس اصول پر مبنی ہے جسے اسلام قبول نہیں کرتا۔ بلکہ یہ وہی تصور ہے جو ظہور اسلام سے پہلے یونان اور ہندوستان میں موجود تھا۔ وہ اصول یہ ہے کہ انسان کی روح ایک اور دنیا میں پیدا کی گئی اور پھر اسے اس دنیا میں اس طرح لایا گیا جیسے پرندے کو پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اگر بات یوں ہی ہو تو اس کے لیے پنجرے کو ٹوڑنا ایک جائز اور درست فعل ہے۔ لیکن قرآن مجید سورہ مؤمنوں میں ایک بڑی عجیب تعبیر بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ صدر المتعالیین علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں :

میں نے روح کے جسمانیۃ المحدث ہونے اور روحانیۃ البقاء ہونے کا نظریہ اس آیت سے دریافت کیا ہے۔ اس آیت میں انسان کے بارے میں بحث کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

۱۳ ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔

(سورہ مؤمنوں - آیت ۱۲)

وہ مرحلہ وار پہلے نطفہ بنا، نطفے سے علقہ (جما ہوا خون) علقہ سے مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) بنا، بعد میں ہڈیاں بنیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا گیا، حتیٰ کہ فرمایا گیا :

۱۴ پھر روح کے ساتھ ہم نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔

(سورہ مؤمنوں - آیت ۱۴)

یعنی ہم نے اسی مادے اور طبیعت کو ایک دوسری چیز — روح

۲۴۰

میں تبدیل کر دیا، گویا کہ روح اسی طبیعت سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر روح مجرد ہے لیکن یہ اس مادے ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ کسی اور جگہ مقیم نہیں تھی کہ وہاں کامل ہوئی اور پھر یہاں ہجرے میں ڈال دی گئی ہو۔ یہاں وہ اپنی ماں کے دامن میں ہے، اس لیے کہ مادہ روح انسان کی ماں ہے۔ چنانچہ جب انسان عالم فطرت میں زندگی بسر کرتا ہے تو وہ اپنی ماں کے دامن میں رہتا ہے۔ لہذا اسے یہیں سے بتدریج ترقی کرنی چاہیے نہ یہ کہ اس نے پہلے ہی یہ ترقی کر لی۔ اور اے قبیح خانے اور کنوئیں میں ڈال دیا گیا ہو اور پھر کنوئیں سے باہر نکلے۔ یہ اسلام کا تصور نہیں۔ بلکہ اسلام کہتا ہے :

ﷺ پھر ہم نے اسے بہت حالت کی طرف پھیر دیا، مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے ۔۔۔

(سورہ تین - آیت ۶)

اے انسان! تجھے ہمیشہ اپنی ماں (یعنی فطرت) کے دامن میں نہیں رہنا چاہیے۔ اگر تو اپنی فطرت سے بلند نہیں ہوگا اور اوپر نہیں آئے گا تو پھر تو ایک طبیعتی موجود ہو کر رہ جائے گا۔ ہاں تو پھر ہم نے اسے بہت حالت کی طرف پھیر دیا، کامصداق بن جائے گا اور مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے، کے مقام پر نہیں ہوگا۔ بہت حالت میں رہے گا۔ پس اگر انسان بہت حالت ہی میں رہے جو فطرت کی پستی ہے اور اوپر نہ جائے تو دنیا اس کے لیے جہنم بن جاتی ہے :

ﷺ جس شخص کے نیکی کے پلے بھاری ہوں گے وہ من بھاتے عیش میں ہوگا اور جس کے نیکی کے پلے ہلکے ہوں گے

۲۴۱

تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے اور تم کو کیا معلوم کہ ہاویہ کیا ہے،  
وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔ (سورہ قارعہ۔ آیت ۱۱)

اگر انسان فطرت کی پستی میں رہے تو اس کی ماں وہی جہنم ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا مولود ہے جسے خدائے تعالیٰ نے اس ماں کے دامن میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ یہ اس کے دامن سے نکلے اور بلند سے بلند تر ہو جائے یعنی وہ ماں کی گود سے نکل کر مدرسے میں جائے اور ترقی کے مختلف مدارج طے کرے۔ اگر یہ ماں کے دامن میں رہ جائے تو ہمیشہ کے لیے ہمیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو ۲۵ سال کی عمر میں ماں کے دودھ کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔

پس اسلام کی انسان شناسی اور جہان شناسی میں انسان ایک پیسے سے بننا یا پرنہ نہیں جو عالم قدس کی فضاؤں میں پرواز کرتا رہا اور پھر اس کو دنیا کے پیجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

طائر عالم قدس چہ دھم شرح فراق  
میں عالم بالا کا ایک پرنہ ہوں اور اس دنیا میں رہتے ہوئے  
اس جدائی کو کس طرح بیان کروں۔

یعنی عالم قدس کا طائر ہونے کے باعث اس کا وظیفہ یہ ہو کہ دنیا کے پیجرے کو توڑ کر عالم قدس میں چلا جائے۔ مگر اسلام اس بات کو قبول نہیں کرتا۔ ہاں آپ نے سنا تو ہو گا کہ عالم ارواح کو عالم اجسام پر برتری حاصل ہے۔ یعنی روح ایک پرتو ہے جس کی پیدائش اسی عالم میں ہوئی۔ لیکن ایک اور پرتو بھی ہے جو عالم بالا سے اس عالم پر چمکا۔ نہ کہ سالم روح ایک اور جگہ پر

۲۴۲

تھی اور پھر اس کو دنیا میں لا کر گویا بنجرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہ یکسر ایک ہندی تصور ہے۔۔۔ یہ نظریہ تنازع ہے جو درحقیقت ایک ہندی اور افلاطونی تصور ہے۔

یونانیوں میں افلاطون کا بھی یہ اعتقاد تھا کہ انسان کی روح اس عالم سے پہلے ایک ایسے عالم میں پروان چڑھی جو ایک مثالی عالم ہے۔ پھر کسی مصلحت کے تحت اسے یہاں لا کر قید کر دیا گیا، لہذا اسے یہاں سے خلاصی پا کر اسی پہلے عالم میں لوٹ جانا چاہیے۔ لیکن اسلام اس دنیا اور فطرت کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تمام عرفاء نے ایسی ہی غلطی کھائی ہے۔۔۔ نہیں، کیونکہ بزرگ عرفاء نے بعض اوقات اپنے کلمات میں اس نکتے کی جانب توجہ دی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو معاشقہ کی جانب میلان کو ترک کیا اور نہ فطرت کی جانب سے توجہ ہٹائی ہے۔

اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ قرآن نے آفاق و انفس کی آیات اور نشانیوں کا ذکر ایک دوسرے کے ساتھ کیا ہے۔ ان بزرگ عرفاء نے بھی اس نکتے پر پوری پوری توجہ دی ہے کہ فطرت خدا کا آئینہ ہے، خدا کا جمال ہے اور خدا کے جمال کا آئینہ بھی ہے۔

کیا وہ شبستری ہی نہیں جو اپنی ایک بلند پایہ اور شاہکار نظم میں کہتے ہیں:

بنام آنکہ جان را فکرت آموخت  
چراغ جان بنور دل برافروخت  
ز فضائش ہر دو عالم گشت روشن  
ز فیضش خاک آدم گشت گلشن

۲۴۳

اس خدا کے نام سے (شروع) کرتا ہوں جس نے روح کو فکر و خیال کی قوت عطا فرمائی اور اسے دل کی روشنی سے چمکایا۔

اس خدا کے فضل سے دونوں جہاں ظاہر و عیاں ہوئے اور اس کے کرم سے اولاد آدمؑ میں رنگارنگ پھول کھلے۔

حتیٰ کہ قرآنی آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں:

بہ نذر آنکہ جانش در تجلی است

ہم عالم کتاب حق تعالیٰ است

عرض اعراب و جوہر چوں حروف است

مراتب بھی اعراب و وقف است

وہ شخص کہ جس کی روح میں نور ہے، ساری دنیا اس کے لیے خدا کی کتاب ہے۔

اس کے نزدیک دنیا کا باطن حروف، اس کا ظاہر اعراب اور اشیاء کے مراتب حرکت و وقف کی مانند ہیں۔

اسی ذیل میں جامی فرماتے ہیں:

جہاں صراحت حسن شاہد ما است

کشاہد وجہ فی کل مراتب

یہ دنیا ہمارے معشوق حقیقی کے حسن کا آئینہ ہے۔ جیسا کہ ہر

آئینہ میں اس کا رخ ذیبا نظر آ رہا ہے۔

اگر ہم قرآن کو ایک طرف اور عرفان کو دوسری طرف رکھ کر دیکھیں

کہ قرآن اور عرفان نے عالم پر کتنی توجہ دی ہے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عرفان



کے مقابلے میں قرآن نے اس طرف زیادہ توجہ دی ہے اور پھر اس نے نفس اور باطن نفس کی جانب توجہ اور رجوع کے مسئلے کا کسی طرح سے انکار بھی نہیں کیا۔ پس قرآن کا بتایا ہوا کامل انسان عقل اور دل کے ساتھ ساتھ فطرت کی جانب بھی میلان رکھتا ہے۔ ایک اور مسئلہ ترک خودی کا ہے، عرفان دل کو سمجھاتا ہے لیکن اس چیز کو حقیقتاً شمار کرتا ہے جو نفس کے نام سے قرآن میں آئی ہے۔ عرفان کی تبدیلات کا ایک حصہ خودی کا ترک کرنا ہے جو اپنے آپ کی نفی کی طرف اور خود بینی کی نفی کی طرف جاتا ہے۔ یہ بات اپنی ذات کی حد تک درست ہے اور اسلام بھی اس کی تائید کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں دو قسم کی خودیاں اور دو نفس ہیں۔ چنانچہ اسلام جہاں ایک قسم کی خودی کی نفی کرتا ہے اور اسے دباتا ہے وہاں دوسرے قسم کی خودی کو انسان میں زندہ کرتا ہے جو بڑی فتن چیز ہے۔ ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے انسان کا ایک دوست اور ایک دشمن ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے ہوں۔ اگر ہم اس دشمن کو تیرا مارنا چاہیں تو ضروری ہے کہ ہم احتیاط کریں اور حد کو پہچانیں کیونکہ وہ اسی غلطی خطرناک ہو سکتی ہے۔ یہ دو قسم کی خودیاں انسان کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوستہ ہیں کہ جذبہ خودی جو پستی کا موجب ہے اسے کوئی ماجر شکاری ہی ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے اور دوسری قسم کی خودی جو تمام انسانی قدروں کی حامل ہے اس کو نقصان سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اسلام کا معجزہ یہ ہے کہ اس نے ہر دو قسم کی خودی کا تعین اتنی دقت سے کیا کہ ان کی پہچان میں کوئی مغالطہ نہیں ہونے پاتا لیکن عرفان میں بعض اوقات یہ تشخیص ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دشمن خودی کو ضرب

۲۴۵

لگانے کی بجائے دوست ”خودی“ کو ضرب لگاتا ہے یعنی انسان خود قربان ہو جانا ہے۔۔۔ وہ چیز قربان ہو جاتی ہے جسے وہ دل اور انسان کہتے ہیں۔ اس طرح بجائے اس کے کہ نفس مارا جائے، یہ بہت ہی دقیق نکتہ ہے اور انشا اللہ ہم آئندہ نشست میں ان مطالب کے بارے میں اپنا بیان جاری رکھیں گے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ  
وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

## نویں نشست

### کامل انسان اور مختلف نظریات ۳

اللہ جس نے دنیا میں سراٹھایا اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تھی، اس کا ٹھکانا تو یقیناً دوزخ ہے۔ مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور اپنے جی کو خواہشوں سے روکتا رہا، تو اس کا ٹھکانا یقیناً بہشت ہے۔

(سورۃ نازعات - آیات ۳۷ تا ۴۱)

مکتب عرفان میں کامل انسان کے بارے میں ایک اہم مسئلہ انسان کا اپنے نفس کے ساتھ رابطہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک اسلامی مسئلہ بھی ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ خود خواہی، خود پرستی اور ہوائے نفس کا مقابلہ کرنے کی بات اہل تصوف کی زبان پر بھی ہے اور اسلام کی تعلیمات عالیہ میں بھی موجود ہے بلکہ یہاں اور وہاں کی یہ تعبیر بھی کسی حد تک نادرست ہے کیونکہ مسلم عرفاء نے ان مسائل میں اسلام ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے اور ان کی سبھی

۲۴۷

تعبیرات اسلامی ہیں۔ ہم یہاں اس معاملے کے بارے میں ایک وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

”خودی“ جسے عربی میں ”نفس“ کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ نفس کو انسان کے لیے ایک اندرونی دشمن قرار دیا جاتا ہے۔

سعدی کہتے ہیں:

تو یا دشمن نفس ہم خانہ ای  
جیہ در بند پیکار بیگانہ امی  
تو اپنے نفس کے ساتھ رہتا ہے جو تیرا دشمن ہے، پھر  
دوسروں سے جھگڑے کرنے میں کیوں لگا ہوا ہے۔  
اللہ یعنی تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ خطرناک خود  
تمہارا نفس ہے۔ (الحديث) جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان  
رہتا ہے۔

سعدی گلستان میں کہتے ہیں:

ایک عارف سے پوچھا گیا: رسول اکرمؐ نے یہ حدیث کس لیے ارشاد فرمائی:  
یعنی خود تمہارا نفس تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا اور خطرناک دشمن ہے۔  
اس نے جواب دیا: حضور اکرمؐ نے یہ اس لیے فرمایا کہ اگر تم اپنے کسی  
دشمن سے نیکی کرو اور جو مانگے اسے دیدو تو وہ تمہارا دوست بن جاتا ہے، سوائے  
نفس کے کہ تم اس کی جتنی مدارات کرو وہ اتنا ہی زیادہ تمہارا دشمن بن جاتا ہے۔  
پس عرفا نے نفس پر ایک دشمن کے طور پر نگاہ ڈالی ہے۔ یہ  
نفس وہی چیز ہے جسے ہم ”خودی“ ”نفس پرستی“ یا ”نور پرستی“ کہتے ہیں۔

۲۴۸

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ”خود خواہی“ کہ جسے برا اور ناپسندیدہ کہا جاتا ہے، وہ کیا چیز ہے ؟

خود خواہی کا ایک درجہ اور ایک قسم یہ ہے کہ انسان اپنے محور پر گھومتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف اپنے لیے کام کرتا ہے اور اس کے سارے کام اور کوششیں اپنے لیے ہوتی ہیں اور وہ خود اپنا محور ہوتا ہے۔ صبح سے جب وہ اٹھتا ہے اور کام کاج کرتا ہے تو رات تک اس کی تمام کوششیں اس کی اپنی زندگی کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پیٹ کی خاطر سیر ہو کر کھاتا ہے اور اپنے بدن کی خاطر کپڑے پہنتا ہے اور مکان بنانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس میں رہ سکے، اگر انسان اپنے لیے اس حد تک سرگرم عمل ہو تو کیا یہ اخلاق کے خلاف اور ایک اخلاقی گناہ ہے یا نہیں۔ یہ اخلاق کی ضد بھی نہیں ہے اور کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔

قرآن انسان کے لیے تین مقامات کا قائل ہے۔ ایک ”حیوان سے بالاتر“۔ دوسرا ”حیوان کے ساتھ ہم درجہ“ اور تیسرا ”حیوان سے کمتر“ یعنی حیوانیت کا مقام ہے۔ حیوانیت کی کیفیت میں وہ حیوان کے ساتھ ہم درجہ ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ اپنے اندر کچھ صفات پیدا کر لیتا ہے تو حیوان سے بلند اور فرشتے سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ منفی صفات پیدا کر لیتا ہے تو صفر سے نیچے گر کر حیوان سے بھی پست تر ہو جاتا ہے۔ انسان کی اس بلندی اور پستی کے نتیجے میں اس کا کردار بھی تین قسم کا ہوتا ہے۔

حامل اخلاق یعنی حیوان کی حد سے بالاتر  
ضد اخلاق یعنی حیوان کے درجے سے پست تر

نہ حامل اخلاق اور نہ ضد اخلاق۔

اگر آپ کو دنیا میں ایک ایسا انسان مل جائے کہ جو کبوتر یا بھیر کی خصلت رکھتا ہو۔ یعنی وہ انسان کہ جس کو فقط اپنی فکر رہتی ہو تو وہ حیوان کی حد میں ہے۔ اس میں اخلاق نہیں ہے۔ لیکن اس کا طریقہ ضد اخلاق بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہ انسان بس اپنی زندگی کی فکر میں ہوتا ہے اور اپنے پیٹ کو سیر کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ کئی قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں درحقیقت اس کا وہ انسانی مقام آتا ہے جب وہ اپنی حیوانیت کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ اسکی حیوانیت کا نتیجہ خود کشی کی شکل میں نکلتا ہے۔ اگر ایک کبوتر دانہ ڈنکا جمع کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ سیر ہو جائے اور یہ ایک عادی فعل ہے۔ ایک گھوڑا اس لیے چرتا ہے کہ وہ سیر ہو جائے اور یہ بھی ایک عادی فعل ہے۔ اگر ایک انسان بھی اس حد میں رہنا چاہے تو یہ اس کا ایک عادی فعل ہے، یعنی وہ بھی ایک حیوان ہے۔

لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے جب انسان اپنے نفسانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زندگی کے لیے سرگرم عمل ہے۔ بلکہ وہ اس لیے کماتا ہے کہ جمع کرے اور پھر وہ خواہ جتنا بھی جمع کرے — کچھ اور بھی جمع کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ جمع کرنے میں اس کی کوئی حد نہیں ہوتی — اور انسان کی بجائے وہ حرص و ہوا کا پستلا بن جاتا ہے۔ پھر جب وہ چاہتا ہے کہ اس میں سے کسی کو کچھ دے یا احسان کرے تو وہ بخل کا شکار ہو جاتا ہے — حرص کی طرح بخل بھی ایک بیماری

ہے۔ بخل کی بیماری بڑھتی ہے تو وہ امساک یعنی مال کو روکے رکھنے کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں سورہ حشر کی نویں آیت میں شیخ (حرص و بخل) کا ذکر آیا ہے اور رسول اکرمؐ کی تعبیر کے مطابق ایسا شخص شیخ مطاع میں مبتلا ہوتا ہے۔  
(تحت العقول صفحہ ۴۱)

یعنی اس کی ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے جو اس پر حاکم ہوتی ہے وہ خود یا اس کی فکر یا اس کی عقل یا ارادہ کوئی بھی اس کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ وہی نفسیاتی کیفیت اس پر حاکم ہوتی ہے جس نے اس کی روح پر دولت کا نقش جمار کھا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت کے علاوہ اس کے عمل میں کسی قاعدے قانون اور عقل و منطق کا بھی کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اس کی عقل اور فکر اپنا کام کرے تو وہ سمجھ جائے کہ یہ خرچ کرنے کا مقام ہے۔ یعنی جان لے کہ اس کی بھلائی، اس کی مصلوٰت، اس کی منفعت، اس کی خوشی اور اس کی خوش بختی خرچ کرنے میں ہے، لیکن بخل اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی یہ حالت اخلاق کے منافی ہے۔ اس کی حرص اسے حیوان سے پست تر بنا دیتی ہے۔ اسی موقع پر ہم کہتے ہیں کہ اس شخص کی حالت اخلاق کے منافی ہے اور وہ ایک بیمار ہے۔ بات فقط اتنی نہیں ہے کہ انسان کا نفس حرص اور بخل وغیرہ سے بچا رہو ہو جاتا ہے۔ بلکہ کبھی یہ اپنی اصلیت میں بہت سی پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جو بدنی بیماریوں سے زیادہ پرخطر اور زیادہ مشکل ہو جاتی ہیں۔ یعنی ایسی باتیں جو بنیادی طور پر عقل اور منطق سے سازگار نہیں اور فقط اس بیماری سے مطابقت رکھتی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں آجکل ”نفسیاتی مرض“۔



کہا جاتا ہے۔ جیسے حسد کی کیفیت اور یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو عقل و منطق کی ضد ہے۔ یعنی انسان اپنے اندر ایک ایسی حالت پیدا کر لیتا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے۔ تب وہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی خوش بختی کی فکر میں ہو۔ ہمیشہ دوسرے کی بد بختی کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اس کی آرزو یہ نہیں ہوتی کہ وہ خود خوش بخت ہو اور اگر ہوتی ہے تو پھر اس سے دس گنا یہ آرزو بھی ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا بد بخت ہو جائے۔ اب بتائیں کہ یہ چیز کس منطق سے مطابقت رکھتی ہے؟ جبکہ یہ سوچ کسی حیوان میں بھی نہیں ہوتی کہ وہ کسی دوسرے حیوان کی بد بختی کی آرزو رکھتا ہو۔ ایک حیوان کو فقط اپنے پیٹ کی فکر ہوتی ہے اور اس لیے وہ انسان کہ جس میں کسی دوسرے انسان کی بد بختی کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان میں تکبر کی کیفیت اور ایسے ہی دوسرے نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ امراض اسکے نفس کے باطن میں یوں چھپے ہوتے ہیں کہ وہ خود بھی ان سے بے خبر ہوتا ہے۔

یہ وہ مشکلات ہیں جو خود انسان کا نفس ہی اس کے لیے پیدا کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہی نفس انسان کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ گویا کہ خود انسان ہی اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ انسان خود اپنے اندر سے دھوکا کھاتا ہے۔

قرآن اس کی تعبیر یہ کرتا ہے:

۱۱۹ یعقوبؑ نے کہا بلکہ یہ بات تم نے اپنے دل سے گڑھلی،  
غیر صبر و شکر! مجھے تو خدا سے امید ہے کہ میرے سب بیٹوں  
کو میرے پاس پہنچائے گا۔ (سورہ یوسف۔ آیت ۸۳)

تسویل (غلط کو ٹھیک کہنا) ایک بے حد دقیق نفسیاتی تعبیر ہے جو قرآن میں آئی ہے۔ یعنی ہر شخص کسی نہ کسی وقت اپنے اندر سے دھوکا کھاتا ہے جب انسان کا نفس کسی چیز کو چاہتا ہے تو اسے انسان کے سامنے اس طرح جلوہ گر کرتا ہے، اس کی آرائش کرتا ہے، اسے زینت دیتا ہے اور اس پر ایسے جھوٹے نقش و نگار بناتا ہے کہ انسان خیال کرتا ہے۔ بس ایک چیز ہے جو اسے حاصل کرتی چاہیے۔ ہاں یہ انسان کا یاطن ہی ہے جس نے یہ کام کیا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے۔

یہ بڑی عجیب تعبیر ہے۔۔۔۔۔ اُجکل جب کہ علم نفسیات نے ترقی کر لی ہے۔ ان علم کے ماہرین نے ان نکات تک بڑی باریکی سے رسائی حاصل کی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ بعض اوقات انسان ہو جاتا ہے، جبکہ اس کی کوئی اعصابی یا جسمانی وجہ موجود نہیں ہوتی اور وہ کسی باطنی اور نفسیاتی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً بعض اوقات ایسا انسان سخت مصائب سے دوچار ہو جاتا ہے اور پھر انسان کی روح اپنے آپ کو ان دکھوں کے کرب سے بچانے کے لیے عقل کو چھٹی دے دیتی ہے۔ چنانچہ یہ علم نفسیات کا ایک اصول ہے۔

جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

نہ ہستیہاں عالم ہر کہ را دیدم غمی دارد  
ولا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمی دارد  
میں نے دنیا کے عاقل لوگوں میں سے ہر ایک کو پریشان پایا ہے۔  
اے دل! دیوانہ ہو جا کہ دیوانگی کی بھی اپنی ایک دنیا ہے۔

یہ حال نفس کا مکرو فریب انسان کا دوسرے کے ساتھ ملکر کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کے نفس کا خود اس کے ساتھ ملکر ہے جو بجائے خود ایک ہیبت ہی اہم مسئلہ ہے۔

عرفان میں ان نکات کی جانب اچھی طرح سے توجہ دی گئی ہے چنانچہ یہ آخری دو مسئلے کہ جو انسان کو صد اخلاق کی کیفیت میں داخل کرتے اسے نفسیاتی بیمار بناتے اور حیوان سے بھی پست تر کر دیتے ہیں، ان کو بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔۔۔ حتیٰ کہ ایسے نکات اٹھائے گئے ہیں جو واقعی حیرت انگیز ہیں۔ یعنی آج کا انسان تعجب کرتا ہے کہ ان لوگوں نے چھ سات سو یا ہزار سال پہلے کیونکر وہ دقیق نکتے بیان کیے ہیں۔ بسکہ ہم دیکھتے ہیں کہ علم نفسیات اس بیسویں صدی میں ان کی گہرائی تک پہنچ رہا ہے۔ تاہم یہ بات ہم فخر اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان مسائل میں عرفا کا ماتخذ قرآن ہے اور انہوں نے قرآن ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ المختصر یہ عرفا بار استعداد لوگ ہیں اور انہیں قرآن کا ایک لفظ یا ایک اشارہ بھی ہاتھ لگتا ہے تو وہ اس میں مضمر نکتے کا بڑی عمدگی سے بیچھا کہہ سکتے ہیں اور اسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مثلاً یہاں ہم تسوئل کے بارے میں مولوی معنوی سے ایک نکتہ نقل کرتے ہیں۔

آجکل یہ بات مسلم ہے کہ بعض اوقات انسان کے باطنی شعور میں بعض چیزیں یا یوں کہیے کہ بعض شرارتیں بیٹھ جاتی ہیں۔ چونکہ وہ ظاہر نہیں ہوتیں۔ اس لیے انسان کو خود بھی ان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر اگر خاص حالات میں کچھ محرکات پیدا ہو جائیں تو اچانک وہ دیکھتا ہے کہ یہ چیزیں اس کی روح کی گہرائی سے ابھر رہی ہیں۔ اس صورت حال پر انسان خود تعجب کرتا ہے

۲۵۴

اور اسے یقین نہیں آتا کہ اس کی روح میں ایسی چیزیں بھی موجود تھیں بعض اوقات انسان اپنے آپ پر نگاہ ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے تو اسے یقین آجاتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی کدورت نہیں ہے۔ وہ کسی کے ساتھ کوئی کینہ نہیں رکھتا، کسی سے حسد نہیں کرتا، تکبر نہیں کرتا اور وہ خود بین نہیں ہے لیکن کسی وقت ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اچانک دیکھتا ہے کہ کئی ایک تکبر غرور، حسد اور کینے اس کی روح کے اندر سے باہر آرہے ہیں جن کی بنیاد کا بھی پتہ نہیں چلتا، پھر جیسا کہ کہا گیا ہے:

نفس اژدر، ہاست او کی مردہ است

از غم بی آلتی اشہرہ است

نفس ایک اژدہا ہے وہ کہاں مرا ہے بلکہ وہ تو موقع نہ ملے

سے پریشان ہو کر گرا ہوا ہے۔ (مثنوی مولانا روم صفحہ ۲۸۹)

مولوی معنوی کہتے ہیں:

انسان کا نفس سانپ کی مثال رکھتا ہے جو مردلوں میں ٹھہر جاتا ہے

اور اگر انسان ان پر ہاتھ پھیرتا رہے تو بھی وہ حرکت نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ بچے

بھی ایک کھلونے کی طرح اس سے کھیلنے رہتے ہیں لیکن وہ ان کو کچھ ضرر نہیں

پہنچاتا۔ تب انسان یہ سمجھتا ہے کہ سانپ بالکل رام ہو گیا ہے۔ لیکن جو نبی

اس پر موسم گرما کی دھوپ پڑتی ہے، اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ

مولوی معنوی نے یہ بات ایک مفصل داستان میں بیان کی ہے۔

مولوی معنوی نے ایک اور مقام پر یہ بات اس انداز میں کہی ہے کہ

تحلیل نفس کے ماہرین حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ انسان کی پوشیدہ اور

۲۵۵

سوئی ہوئی خواہشات کے بارے میں کہتے ہیں:

میل ہا ہچوں سگانِ خفتہ اند  
اندر ایشاں خیر و شر بہ نہفتہ اند  
چوں کہ قدرت نیست خفتہ ایں زدہ  
ہچو ہیزم پارہ پا و تن زدہ  
نفسانی خواہشیں سوئے ہوئے کتوں کی طرح ہیں کہ ان کی اچھائی  
برائی چھپی رہتی ہے۔

چونکہ ان کو پورا کرنے کی قوت نہیں ہوتی، اس لیے وہ جیلانے  
کی ٹوٹی پھوٹی لکڑیوں کی طرح اوپر نیچے پڑی رہتی ہیں۔

(مشنوی مولانا روم صفحہ ۲۸۹)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات پانچ دس گتے ایک جگہ سو رہے  
ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سر پتھوں پر رکھے آنکھیں بند کیے یوں آرام سے سو رہے ہوتے  
ہیں کہ انسان سمجھتا ہے، یہ جھپٹا یا بھڑکا بچہ ہے جو یوں گہری نیند سو رہا ہے:

تاکہ مرداری درآید در میان

تفخِ صورتِ کوبد برسگان

چوں درآن کو چہ خرمی مردار شد

صد سگِ خفتہ بدان بیدار شد

جب سوئے ہوئے کتوں کے کہیں قریب مردار آجائے تو ان

کی حرص چیخ کر جاگ اٹھتی ہے۔

چنانچہ کسی گلی میں کسی گدھے کا مردار پھینکا جاتا ہے تو اس کے

یہ سیکڑوں کتے جاگ کر آجاتے ہیں۔ (مثنوی حوالہ سابق)

یعنی اگر اسی اثنا میں ایک جانور کا مردار سامنے آجائے تو آپ دیکھیں گے کہ کتے کتنا غل مچاتے ہیں اور اچھلنے کودتے ہیں۔ ان کی آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہیں۔ ان کے حلق سے خور خور کی آواز نکلتی ہے اور ان کے بدن کے تمام بال کھڑے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ مولوی معنوی بیان کرتے ہیں:

حرص ہای رفتہ اندر کتم غیب  
تاختن آورد و سر برزد ز جیب  
موبہوی ہر سگی دندان شدہ  
وزیر اسی جیب دم جنیان شدہ

جو خواہشیں کہیں دبی پڑی ہوتی ہیں، وقت آنے پر ان میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ تیزی سے ابھرتی ہیں۔  
تب ہر کتے کا ایک ایک بال نوکیلا دانت بن جاتا ہے اور وہ دم ہلا کر مردار کی طرف بڑھتا ہے۔ (مثنوی حوالہ سابق)

پھر کہتے ہیں:

صد چنین اندریں تن خفتہ اند  
چوں شکاری نیست شان بہفتہ اند

اسی طرح انسان کے بدن کے اندر سینکڑوں خواہشیں دبی پڑی ہیں اور چونکہ شکار نظر میں نہیں ہے اس لیے وہ کتوں کی مانند سوئی ہوئی ہیں۔ (مثنوی حوالہ سابق)

یہ کتنی بڑی حقیقت ہے! یہاں تک تمام مطالب درست اور بڑے



۲۵۷

دقیق ہیں۔ نیز قرآن اور حدیث کے شواہد بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ اس نفس کے خلاف جنگ اور جہاد کرنا چاہیے۔ قرآن مجید بھی فرماتا ہے کہ نفس امارہ کے خلاف جنگ کرتی چاہیے۔

جس نے دنیا میں سراٹھایا اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تھی اس کا ٹھکانا تو یقیناً دوزخ ہے۔ مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور اپنے جی کو خواہشوں سے روکتا رہا، تو اس کا ٹھکانا یقیناً بہشت ہے۔

(سورۃ نازعات۔ آیت ۳۱ تا ۴۱)

ایک اور آیت یہ ہے :

۱۲۰۔ بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا کہ جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ (سورۃ جاثیہ۔ آیت ۲۳)

ایک اور مقام پر قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی بیان کرتا ہے :

۱۲۱۔ اور یوں تو میں بھی اپنے نفس کو بے لوث نہیں کہتا ہوں، کیونکہ نفس برابر بُرائی کے لیے اکساتا ہے۔

(سورۃ یوسف۔ آیت ۵۴)

حضرت یوسفؑ اپنے آپ سے مطمئن ہیں جب یہ کہتے ہیں : ”نفس برابر بُرائی کے لیے اکساتا ہے“ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کے نفس کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ ممکن ہے کسی وقت مجھ سے کوئی بات سرزد ہو جائے کیونکہ کوئی چیز ایسی بھی ہو سکتی ہے جس کو انسان سمجھ نہ پائے۔ لہذا میں کبھی بھی اپنے نفس پر اعتماد نہیں کرتا تاکہ وہ کہیں شرارت نہ کرتے ملے۔



”جہاد نفس“ اسلام کا خاص موضوع ہے۔ جب کچھ صحابہ ایک غزوے سے واپس آئے اور رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان پر نگاہ ڈالی اور فرمایا:

”اے آفرین ہے ان لوگوں پر جو چھوٹی جنگ سے واپس آئے ہیں اور ایک بڑی جنگ ابھی ان کے ذمہ ہے۔“  
(وسائل الشیخہ جلد ۱ باب ۱)

صحابہ نے عرض کیا:

یا رسول اللہ! بڑی جنگ کیا ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: وہ اپنے نفس کے خلاف جنگ ہے۔

لیکن جہاد نفس یعنی خود بخود ہی سے جنگ اور خود کو کچھاڑنے کے مرحلے میں ہم عرفان و تصوف کے بزرگوں کے اقوال میں بعض اوقات ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جس کی اسلام تائید نہیں کرتا۔ ایسا ہی ایک مرحلہ سخت ترین ریاضتیں ہیں اور اسلام جب یہاں پہنچتا ہے تو قدم روک لیتا ہے۔ تب اسلام کہتا ہے: تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے۔ رسول اکرمؐ کے کچھ صحابہ بھی ایسی ہی سخت ریاضتیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم آنحضرتؐ نے ان کے اس ارادے کی شدت سے مخالفت فرمائی۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسی سخت ریاضتیں کرتے ہیں جن کی اسلام تائید نہیں کرتا۔

ریاضت اور نفس کے ساتھ جہاد کے مسئلے کی دو قسمیں ہیں:

① ریاضت کی شکل یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے بدن پر سختی کرتے ہیں۔ بہت ہی کم غذا کھاتے ہیں اور بہت کم سوتے ہیں، یہ ریاضت اہل ہند

میں عام ہے۔

(۲) مجاہدہ بالنفس، بنفس کی خواہش کے خلاف چلنا ہے۔ ان کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے لیکن ہم ایسی چیزیں بھی دیکھتے ہیں جو اسلام کی منطق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ یعنی اسلام کا مطلوبہ کامل انسان ایسا نہیں ہوتا۔

ان میں سے ایک وہ روش ہے جو بعض اہل تصوف کا معمول رہی ہے۔ یہ روش سبھی کی تو نہیں، لیکن اس نے کم و بیش سب پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ اسے ”ملا متی روش“ کا نام دیا گیا ہے اور یہ ریاکاری کی ضد ہے۔ ریاکار آدمی کا ماطن ریا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو نیک ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ ملا متی روش کا انسان نیک ہوتا ہے۔ لیکن اس غرض سے کہ لوگ اس کے معتقد نہ ہو جائیں، خود کو ریا ظاہر کرتا ہے۔ یعنی وہ شراب نہیں پیتا لیکن ظاہر کرتا ہے کہ وہ شرابی ہے۔ زنا نہیں کرتا لیکن اس کے طور طریقے ایسے ہوتے ہیں جن سے لوگ یہ سمجھیں کہ وہ فاسق و فاجر ہے۔

وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ وہ جواباً کہتا ہے: میں یہ کام اس لیے کرتا ہوں تاکہ نفس کو ماروں اور نفس حقیقتاً مرنے لگے۔ ہاں نفس کے ساتھ جنگ کرنا واقعی ایک شدید اور مشکل کام ہے نفس چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کی ابرو ہو، وہ ہر لحیزہ پر ہو اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہوں۔ لیکن وہ شخص جان بوجھ کر ایسے کام کرتا ہے کہ لوگوں کا اس پر اعتماد قائم نہ ہونے پائے۔ وہ شخص چور نہ نہیں لیکن دکھاوے کا چور بن جاتا ہے اور لوگوں کا مال ایک جگہ لے جا کر چھپا دیتا ہے تاکہ لوگ ایسے اور اسے ڈنڈے ماریں۔ لیکن اگر انہیں پتہ نہیں چلتا

۲۶۰

تو وہ ان کا مال دوبارہ اس کی اصلی جگہ پر رکھ دیتا ہے۔ وہ شراب کی بوتل اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا ہے حالانکہ شراب خوار نہیں۔

کیا یہ چیز اسلام کی منطق سے موافقت رکھتی ہے؟ نہیں۔ بلکہ اسلام یہ کہتا ہے: بندہ مومن کا ظاہر اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ یہ حق نہیں رکھتا کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے لوگوں کے درمیان اس کے شرف و احترام اور عزت و آبرو پر حرف آئے۔

اسلام یہ بھی کہتا ہے: جب تم نیک نہیں ہو تو ریاکاری نہ کرو اور نیکی کا دکھاوانہ کرو لیکن بُرائی کا بھی جھوٹا دکھاوانہ کرو۔ یہ دونوں جھوٹ ہیں اور جھوٹ ایک بُرائی ہے۔

عرفانی ادبیات میں بلند اور مقدس مطالب کو فسق و فجور کے الفاظ میں نیز معشوق، شراب اور بانسری کی زبان سے بیان کیا گیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ عرفا و صوفیا اس چیز کا دکھاوا کرنا چاہتے تھے جو ان کے اندر موجود نہ تھی۔

حافظ کے ہاں یہ بات کچھ زیادہ دیکھنے میں آتی ہے، حالانکہ بعض اوقات وہ خود کہتے ہیں کہ میں ریاکار نہیں اور ملاستی بھی نہیں ہوں۔

ولا دلالت خیرت کنم بہ راہِ نجات  
مکن بہ فسق مباحات و زہد ہم مفروش  
اے دل! میں تجھے نجات کا راستہ بتاتا ہوں کہ برائی پر شیخی  
نہ کر اور اپنی نیکی کا ڈھنڈورا بھی نہ پیٹتا رہ۔

بہر حال ملاستی و روش نفس کے خلاف ایک قسم کا صوفیانہ جہاد ہے جسے

۲۶۱

اسلام قبول نہیں کرتا۔ اگرچہ تمام صوفیوں کی یہ روش نہیں رہی اور خواجہ عبداللہ انصاری جیسے صوفیوں پر فقط شریعت کے آداب کا غلبہ رہا ہے۔ لیکن ایک گروہ کی یہی روش رہی ہے اور خراسان کے صوفیوں میں زیادہ ملامتی ہی گزرے ہیں۔

مکتب تصوف میں بعض اوقات نفس کے ساتھ جہاد کے سلسلے میں اپنے آپ کو بہت اور ذلیل کر دیا جاتا ہے تاکہ نفس کو رام کر کے برائی پر ابھارنے سے باز رکھا جائے۔ اس طرح نفس یہاں تک لے بہت ہو جاتا ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب انسان کو اپنی حیثیت کا دفاع کرنا چاہیے وہ ایسا نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ تیز جسے ہم ”عزت مومن“ کا نام دیتے ہیں، تصوف کے بعض مکاتب میں اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے سلسلے ہیں کہ جن میں سالک کے لیے اپنے استاد اور شیخ کی خدمت بجالانا ضروری ہے اور وہ استاد اسے بعض اوقات ایسے کام کرنے کا حکم دیتا ہے جو بہت ہی ذلیل اور پست ہوتے ہیں۔

مثلاً اس پر لازم ہے کہ ایک عرصے تک جانوروں کا گوشت جمع کرنا ہے یا خاک و دب و غیرہ کا کام کرے۔ اس کو باور کرایا جاتا ہے کہ کام تمہارے نفس کو قابو میں لانے کے لیے ضروری ہے۔ بعض حالات میں یہ لوگ نفس کشی کی خاطر ایسے ذلیل کام کرنے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

ابراہیم اوشم کہ جو تصوف کے مشائخ میں سے ہے۔ وہ ایک شہزادہ تھا۔ پھر قہر شاہی سے بھاگ نکلا اور خلوت، سہوک اور نفس کشی کی حالت میں زندگی

گزارنے لگا۔ ابن ابی الحدید نقل کرتا ہے ابراہیم ادھم نے کہا: میں اپنی ساری زندگی میں اتنا خوش کبھی نہیں ہوا جتنا ان تین مواقع پر ہوا:

① ایک موقع پر میں بحالت بیماری ایک مسجد میں پڑا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ اتنے میں مسجد کا خادم آیا اور اس نے سب کو اٹھا دیا۔ میں چونکہ اٹھ نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے میرے پاؤں پکڑے اور ایک لاش کی طرح باہر پھینک دیا۔ اس موقع پر میں بہت خوش ہوا کیونکہ میں نے دیکھا کہ میرا نفس جو وہاں بڑی کا احساس کر رہا تھا وہاں اس کو خوب رکیدا اور ذلیل کیا گیا۔

② دوسرا موقع وہ ہے جب کہ ہم لوگ ایک کشتی پر سوار تھے کشتی میں ایک مسخرا بھی تھا جو لوگوں کا دل بہلانے کے لیے نقلیں کر رہا تھا۔ لوگ کشتی میں بیٹھے تھے اور اس مسخرے نے انہیں ہنسی مذاق میں لگا رکھا تھا۔ پھر اس نے اچانک کہا: جی ہاں۔۔۔ فلاں جگہ ایک کافر تھا۔ میں وہاں گیا اور جانتے ہی اس کی ڈاڑھی پکڑ لی اور اسے گھسیٹا۔ یہ کہہ کر اس نے مجلس پر نگاہ ڈالی۔۔۔ وہ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جو تختہ مشق کا کام دے اور وہ اسے عملی مظاہرہ کا وسیلہ بنائے۔ تب اس کو کشتی میں مجھ سے زیادہ گھٹیا آدمی کوئی نظر نہ آیا۔۔۔ اس نے اکر میری ڈاڑھی پکڑ لی اور مجھے گھسیٹا۔ اس پر کشتی میں موجود سب لوگ ہنسنے لگے اور میں بھی بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس طرح میرے نفس کی خوب پٹائی ہو گئی۔

③ تیسرا موقع وہ ہے، جب کہ میں گرمیوں کے موسم میں ایک جگہ بیٹھا

تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری دوستیں میں اتنی زیادہ جوئیں تھیں کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس میں جوئیں زیادہ ہیں یا بیشم زیادہ ہے۔ یہ بھی ایک ایسا موقع تھا کہ جب میں بہت خوش ہوا کہ میرے نفس کو اپنی ذلت نظر آگئی۔ بلاشبہ یہ نفس کے خلاف جنگ اور جہاد ہے لیکن یہ ایسا جہاد بال نفس ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ کیوں؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنے آپ کو یوں ذلیل کرے۔ وہ مستحکم لوگوں کو ہنساتا چاہتا تھا۔ دراصل اس کا یہ فعل غلط تھا اور وہ ابراہیم اوہم کی توہین کرتا چاہتا تھا۔ پھر غلطی پر غلطی یہ ہوئی کہ ابراہیم اوہم نے اس کے آگے تسلیم خم کر دیا۔ اسلام کہتا ہے کہ مومن کا نفس معزز اور محترم ہے، اسلام کی منطق کے مطابق ابراہیم اوہم پر واجب تھا کہ وہ وہاں اس مستحکم کے مقابلہ کرتا، اس کو روکتا، اپنا دفاع کرتا اور اپنی عزت و حرمت کا تحفظ کرتا۔

ایک اور صوفی کہتا ہے: ایک شخص نے ماہ رمضان المبارک میں مجھ کو اپنے ہاں روزہ افطار کرنے کی دعوت دی لیکن جب میں اس کے گھر گیا تو اس نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔ دوسری شام کو اس نے پھر دعوت دی۔ میں دوبارہ اس کے گھر گیا تو اس نے پہلے کی طرح میرا سستہ روک دیا۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم عجیب آدمی ہو۔ یہ بھی دیکھتے ہو کہ میں تمہیں اندر نہیں آنے دیتا۔ اس کے باوجود بار بار چلے آتے ہو۔ ہاں کتے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ تاہم اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کو اس قدر ذلیل و خوار کرے۔



۲۶۴

کیونکہ اسلام میں ہم ایک طرف تو اس جگہ پہنچتے ہیں جہاں نفس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نفس کے خلاف جنگ کرنی چاہیے اور اسے مار ڈالنا چاہیے۔ لیکن جب ہم ایک مقام پر جاتے ہیں تو وہاں اسلام میں اسی اندازے کے مطابق بلکہ اس سے بھی زیادہ ”عزت نفس“ ”قوت نفس“ اور ”کرامت نفس“ کی بات ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ مومن کا نفس معزز اور محترم ہے۔ یہاں تک کہ تمام اسلامی اخلاق کی بنیاد انسان کے کرامت نفس اور شرافت نفس کی طرف توجہ دیتے رہے اور اسلام کہتا ہے کہ اپنے نفس کی کرامت اور شرافت کو ہرگز داغدار نہ کرو۔ اسلام ایک طرف تو کہتا ہے کہ نفس کے خلاف جہاد کرو اور دوسری طرف کہتا ہے کہ اپنے نفس کی شرافت کو بے نہ رکاو، اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ نفس وجود رکھتے ہیں جن میں سے ایک کے خلاف جنگ کی جائے اور دوسرے کو قابل احترام سمجھا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دو نفس — ”و شخص“ کے معنوں میں موجود نہیں رکھتے۔ بلکہ نفس ایک ہی ہے اور اس ایک ہی نفس کے بلند اور پست درجے ہیں۔ یہ نفس اپنے بلند درجے میں صاحبِ شرف ہے اور پست درجے میں مکینہ ہے اور جب یہ اپنی گدڑی سے یا ہریاؤں نکالنے لگے تو اسے روک دینا چاہیے۔ یہ ایک ایسی بات ہے، عرفاء کی زبان میں اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس لیے ان کے بیانات میں جہاں نفس سے جہاد کا ذکر آیا ہے، وہاں اس جہاد میں نفس امارہ کے ساتھ نفس شریفہ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ بلکہ نفس شریفہ کے ساتھ بھی جہاد کرنے کو کہا گیا ہے۔



لہذا ضروری ہے کہ ہم اس بات کو سمجھیں کہ انسان کی واقعی ”خودی“ کیا چیز ہے۔ فلسفی اس بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کی ”خودی“ اس کی روح ہے۔

آج کل کے ماہرین نفسیات کم از کم اس حد تک پہنچے ہیں کہ انسان کی ”خودی“ کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کے وجود کا خود اسے بھی علم نہیں یعنی وہ اس کے ظاہری شعور میں وجود نہیں رکھتا۔ یعنی آپ اپنی اس ”خودی“ و ذات کا جتنا احساس کرتے ہیں وہ آپ کی ذات کا ایک چھوٹا سا جزو ہے اور اپنی ذات کے ایک بیشتر حصے کو آپ جانتے ہی نہیں ہیں۔

اجکل کے تحلیل نفسی کے کچھ ماہرین بھی زیادہ گہرائی میں گئے ہیں اور انہوں نے فلسفیوں کی مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فلسفیوں نے انسان کی روح کو اس کی ”خودی“ قرار دے کر غلطی کھائی ہے اور وہ انسان کی روح کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں خودی اس سے کہیں زیادہ دقیق اور عمیق ہے۔ اس مقام پر عرفا نے فلسفیوں کے مقابلے میں اپنا کمال فکر و نظر دکھایا ہے،

ثبوتہ ہی نے کہا:

من تو برتر از جان و تن آمد

کہ جان و تن راجدای من آمد

تیری خودی (دیں) تو تیرے بدن اور روح سے بلند تر ہے۔

کیونکہ روح و بدن تیری خودی کے حصے ہیں۔

عرفا کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی حقیقی من (خودی) یعنی دہیں کو اس وقت دریافت کر لیتا ہے جب وہ خدا کو دریافت کر لیتا ہے اور ”خودی“ کا شہود خود

۲۶۶

خدا کے شہود سے کسی وقت جدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :  
 ۱۲۳ اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھلا بیٹھے تو خدا  
 نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔ یہی لوگ تو  
 بلکہ وار ہیں۔ (سورہ حشر۔ آیت ۱۹)

وہ اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ جہاں تک فلسفیوں نے اسے سمجھا ہے  
 انسان کی ”خود“ اس سے کہیں زیادہ عینق ہے۔ چنانچہ محی الدین عسری جو  
 اسلامی عرفان کا بوا آدم ہے وہ پو علی سینا جیسے فلسفیوں کی بڑی تحقیر کرتا ہے  
 وہ تمام عرفاء جو ساتویں صدی کے بعد آئے اور نظری عرفان رکھتے تھے اسی  
 کے مکتب کے شاگرد تھے۔ تاہم عرفان نے فکری نقطہ نگاہ سے بہت وسعت پائی  
 اور فارسی، عربی دونوں زبانوں میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

مولوی معنوی نے یہ بات ایک تمام پر پڑے عجیب طریقے سے بیان کی ہے :

ای تو در پیکار خود را باخت  
 دیگران را تو ز خود شناخت  
 تو بہ ہر صفت کہ آئی بستی  
 کہ منم ایں واللہ اں تو نیستی  
 یک زمان تنہا بمانی تو ز خلق  
 در غم و اندیشہ مانی تا بہ خلق  
 ایں تو کی باشی کہ تو آن اوحدی  
 کہ خوش و زیب و سرست خودی  
 اے انسان! تو نے اس جنگ میں اپنے آپ کو گوارا دیا اور خود کو

۲۶۷

دوسروں میں سے پہچانا نہیں ہے۔

تو جس صورت میں آیا یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ میں ہوں، مگر بخدا کہ وہ تو نہیں ہے۔

اگر تو ایک مدت تک لوگوں سے الگ رہ کر گئے گئے تک فکر و غم میں ڈوب گیا۔

یوں سمجھے بیٹہ چلے گا کہ تو وہ شخص نہیں ہے جو اپنے حال میں خوش اور بے فکر تھا۔ (مشنوی مولانا روم، صفحہ ۳۶۰)

قرآن مجید فرماتا ہے:

لَا تَلْمِزْ لِمَن يَدْعُو لَكَ بِرَبِّكَ لَكَ دَرَصٌ مِّنْهُ لَئِنْ لَّمْ يَلْمِزْ لَكَ بِرَبِّكَ لَكَ دَرَصٌ مِّنْهُ لَئِنْ لَّمْ يَلْمِزْ لَكَ بِرَبِّكَ لَكَ دَرَصٌ مِّنْهُ

لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کا گھٹا کیا۔

(سورۃ زمر - آیت ۱۵)

سب سے بڑا جوا اور سب سے بڑی ہاریہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہار جائے، خدا کی طرف توجہ کہ جو عبادت کی رُخ اور حقیقت ہے۔ اس کا مال اپنی اہلیت اور اپنے نفس کو دوبارہ پالینا ہے۔

پس اس بنا پر عرفا نے نفس کا مسئلہ اس حد تک تو حل کر لیا ہے تاہم ان کے ہاں نفس کے خلاف جہاد کے معاملے میں ہم نفس کی اس کرامت، عزت اور شرافت کا ذکر بہت ہی کم دیکھتے ہیں۔ جس کی بدولت انسان بلند مقامات پر پہنچتا ہے چنانچہ عرفا میں اس مسئلے پر بہت کم بحث ہوئی ہے اور اس بارے میں انہوں نے اسلامی احکام سے بہت کم فیضان حاصل کیا ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسلام میں نفس کے متعلق یہ

۲۶۸

مسائل بھی ہیں:

نفس کو برائی سے روکنا۔ نفس برابر برائی پر کساتا ہے۔ جس نے  
 نفس کو پاک رکھا وہ کامیاب اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد ہوا۔ مرنے  
 سے پہلے مر جاؤ، وغیرہم۔ نیز اس ضمن میں کچھ اور چیزوں کو بھی مد نظر رکھا اور بالآخر  
 عزت نفس کو مرکز توجہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:  
 ۵۱؎ عزت تو خاص خدا، اس کے رسولؐ اور مومنوں کے لیے  
 ہے۔ (سورہ منافقون۔ آیت ۸)

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

۵۲؎ اپنی حاجتیں پوری کر لے میں عزت نفس کا خیال رکھو ہاں  
 تو سارے کام ایک اندازے سے ہوتے ہیں۔

یعنی اگر تم حاجت رکھتے ہو تو دوسرے سے ذلت کے ساتھ حاجت طلب  
 نہ کرو بلکہ عزت نفس کے ساتھ مانگو۔ یعنی اپنی عزت کو داغدار نہ کرو۔ اب ممکن  
 ہے آپ یہ کہیں کہ میں اپنے نفس کی خود پسندی کو شکست دینے کے لیے بھکاری  
 کی مشکی میں کچھ مانگ چاہتا ہوں، لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور  
 کہتا ہے کہ اگر تم کوئی حاجت رکھتے ہو تو تمہارا سوال عزت نفس کے ساتھ ہونا  
 چاہیے۔

امام علی علیہ السلام میدان جنگ میں فرماتے ہیں:

۵۳؎ تمہارا ان سے دب جانا جیتے جی موت ہے اور غالب  
 ہ کر مرنا بھی جینے کے برابر ہے۔

(ہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۱۵ صفحہ ۱۹۴)

۲۶۹

مرا عار آید از این زندگی  
 کہ سالار باشم کنم بندگان  
 تن مرده و گریہ دوستان!  
 بہ از زندہ و نخذہ دشمنان

مجھے ایسی زندگی سے عار آتی ہے کہ کسی کا غلام ہو کر سالار بنوں۔  
 میری ہیبت پر دوستوں کا رونا، میری زندگی میں مجھ پر دشمنوں  
 کے ہنسنے سے استر ہے۔

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں :  
 عزت کی موت زلت کی زندگی سے بہتر ہے۔  
 (حیۃ الامام حسین علیہ السلام صفحہ ۱۸۳)

امام حسین علیہ السلام یہ نہیں فرماتے کہ نفس کے ساتھ جہاد کا تقاضا یہ  
 ہے کہ ہم بزیں اور ابن زیاد کے حکم کے سامنے تسلیم خم کر دیں اور اس صورت میں  
 ہم اپنے نفس کے خلاف بہتر جہاد کریں گے۔ آپ نے یہ اس لیے نہیں فرمایا کہ  
 اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

آپ نے مزید فرمایا:  
 آگاہ ہو جاؤ کہ کہنے باپ کے کہنے بیٹے این زیاد نے مجھے دو  
 باتوں کے بیچ لاکھڑا کیا ہے، یعنی جنگ یا غلامی! لیکن کہاں میں  
 اور کہاں غلامی؟ خدا اس پر راضی نہیں ہوتا کہ ہم غلامی کی ذلت  
 میں پڑیں۔ ہمارے لیے، خدا کے رسولؐ کے لیے اور مومنوں کے لیے  
 عزت ہی عزت ہے۔ ہاں ہم وہ ہیں کہ جب تک تعلق پاک و پاکیزہ مسئلے

۲۷۰

سے ہے۔ (مقتل حسینؑ مرقم صفحہ ۲۸۷)  
 یعنی کہاں ہم کہاں ذلت پر راضی ہونا! خدا کی رضا یہ نہیں کہ ہم ذلت اٹھانے  
 پر آمادہ ہو جائیں۔ پھر میرے کوئی ذاتی احساسات بھی نہیں کیونکہ خود میرا مکتب ہی مجھے  
 اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ یعنی میرا خدا مجھے ذلت اٹھانے کی اجازت نہیں  
 دیتا۔ میرا پیغمبر مجھے ذلت قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور میری تربیت مجھے ذلت  
 میں پڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں علیؑ و فاطمہؑ کے دامن میں پُران چڑھا  
 ہوں۔

۳۱۔ میں ہرگز ذلت کا ہاتھ نہیں نہیں دوں گا، غلاموں کی طرح  
 نہیں بھاگوں گا، اطاعت قبول نہیں کروں گا اور ذلت پر راضی  
 نہیں ہوں گا۔

ایسی تعبیرات قرآن، حدیث اور ائمہ علیہم السلام کے کلمات میں اور بالخصوص  
 امام حسینؑ کے کلمات میں بہت زیادہ ہیں۔  
 میں نے مسجد جاوید میں ایک بات کہی تھی جس کی وضاحت کرنے کے لیے  
 میں اسے یہاں دہرائے لگا ہوں :

۳۲۔ میں نے ایک نشست میں کہا تھا کہ یہ جملہ ”ذند کی تھیہ اور اس کے لیے  
 جہاد ہے“ جو کچھ عرصے سے امام حسینؑ کے نام سے معروف ہے، یہ کسی مآخذ  
 میں نقل نہیں ہوا اور اس بات پر اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ اس کے معنی بھی  
 درست نہیں ہیں اور یہ امام حسینؑ علیہ السلام کی منطق کے ساتھ موافقت بھی نہیں  
 رکھتا۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ انسان کی زندگی ایک عقیدہ اور اس کی راہ میں  
 جہاد سے عبارت ہے۔ اسلام میں عقیدے کی نہیں حق کی گفت گو ہے اور زندگی

یہ ہے کہ انسان حق کو دریافت کرے اور اس کے راستے میں جہاد کرے۔ یہ مسئلہ کہ عقیدے کی راہ میں جہاد کرنا چاہیے۔ دراصل فرنگیوں کی سوچ ہے جو بعد میں مسلمانوں میں بھی مشہور ہو گئی ہے۔ چونکہ میں نے دیکھا ہے کہ کچھ نوجوانوں کو میرا یہ کہنا برا لگا کہ یہ جملہ امام حسینؑ کا نہیں، لہذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی وضاحت کروں۔ ہم پرانی نسل (ساری نہیں) کے مقابلے میں نوجوان نسل کے لیے احترام کے قائل ہیں۔ کیونکہ ہم نوجوان نسل کو حقیقت کا نوکر سمجھتے ہیں نہ کہ متعصب جس نے ایک عقیدہ اپنالیا، خواہ وہ بغیر دلیل کے ہی کیوں نہ ہو۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ نوجوان نسل کے دماغ میں جو چیز بیٹھ جائے وہ نہیں نکل سکتی تو پھر ماننا پڑے گا کہ یہ نسل بھی پرانی نسل جیسی ہے یعنی ایک حمد اسے اچھا لگتا تھا اور دوسرا آپ کو اچھا لگتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ بھی بغیر دلیل کے اپنے عقیدے سے چمٹے ہوئے تھے اور آپ بھی بغیر دلیل کے چمٹے ہوئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ اپنے ایک دوست کی زبان سے سن رہے ہیں کہ یہ جملہ نہ منطقی طور پر اسلام سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ہی کسی کتاب میں اس کا مدرک اور سند درج ہے۔ اب فرض کیجیے کہ مخالفوں اور دشمنوں میں سے ایک شخص آئے اور آپ سے پوچھے: جناب! یہ الفاظ امام حسینؑ نے کہاں کہے ہیں اور اس کا مدرک کیا ہے؟ امام حسینؑ نے یہ الفاظ کہاں کہاں کہاں مدرک بھی ضرور ہو گا۔ لیکن جب وہ مدرک و ماخذ آپ کو نہیں ملے گا تو پھر آپ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے: جناب! یہ جملہ ”إِنَّ الْحَيَاةَ..... کہاں سے آیا ہے؟ آپ مجھے بتائیں تاکہ میں مخالف کو جواب دے سکوں اور اسے اس کا مدرک دکھا سکوں۔ اس وقت میں آپ سے کہوں گا: جناب! اس کا



کوئی مدرک نہیں ہے۔ تب آپ کہیں گے: جناب! آپ نے مجھے اب تک کیوں نہیں بتایا؟ کیا آپ یہ کہیں گے یا نہیں؟ اس وقت آپ میرے ہی جیسے ایک شخص پر اعتراض کرتے ہوئے کہیں گے: جناب! آپ نے ہمیں اب تک کیوں نہ بتایا؟ آپ نے خاموشی اختیار کی اور آج ہمیں دشمن کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا ہے۔ اگر آپ اس جملے کے جنگی پہلو EPIC پر فریفتہ ہیں تو امام حسینؑ نے کئی ایک ایسے جملے کہے ہیں جو اس جملے سے سو گنا بڑھ کر جنگی ہیں۔ ”زندگی عقیدہ اور اس کے لیے جہاد ہے“ کیا یہ بالآخر ہے باہر جملہ کہ ”عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے“

”ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے اور جہنم میں جانے سے ذلت اٹھانا بہتر ہے“

کیا عقیدہ و جہاد کا جملہ بہتر ہے یا روز عاشورا پکا یہ جملہ زیادہ وسیع ہے: ”دیکھو! بد نہاد باپ کے بد نہاد بیٹے (ابن زیاد) نے مجھے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ میں یا تلوار سونت لوں یا ذلت قبول کروں۔ مگر کہاں میں اور کہاں ذلت! خدا اور رسولؐ کو ہم اہلبیت کی ذلت بہتر منظور نہیں“ کیا إِنَّ الْحَيَاةَ..... بہتر ہے یا وہ جملہ جو آپؐ نے خطبے میں فرمایا:

”اے جو ہمارے لیے جان قربان کرنے اور خدا سے ملنے کے لیے

تیار ہو، وہ ہمارے ساتھ چلے، میں الشاہد اللہ کل صبح روانہ

ہو رہا ہوں“

نیز دسیوں ایسے اور جملے بھی ہیں — ہمارے لیے رجزیات کی کوئی کمی

نہیں ہے۔ اگر ہم رجزیات کے معاملے میں نادار ہوتے یعنی ہمارے پاس زندہ جنگی نعرے نہ ہوتے کیا ہم العیاذ باللہ کہہ کر ایک جملہ امام حسینؑ سے منسوب کر دیتے؟ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس اس قسم کے اتنے نعرے ہیں کہ دنیا چاہے تو ہم سے لے سکتی ہے۔ پھر ہم دوسروں کے نعروں کے پیچھے کیوں جائیں؟ اور وہ بھی ایسے نعروں کے پیچھے کہ جو درست بھی نہ ہوں۔ فوجان نسل کے لیے مناسب نہیں کہ وہ تعصب سے کام لے۔ پس میں کہتا ہوں کہ یہ جملہ امام حسینؑ کا نہیں اور مجھے ننانوے فی صد یقین ہے کہ نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کا مدرک ڈھونڈ لے تو میں قول دیتا ہوں کہ اسی منہ پر سے اعلان کروں گا کہ میری بات غلط تھی لہذا ہمیں وہ بات کہنی چاہیے جس کی سند ہو نہ وہ کہ جس کی کوئی سند ہی نہ ہو۔ اس ذیل میں بہت زیادہ مطالب ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ وقت کا دامن ان کے بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پس اس بنا پر نفس کے خلاف جنگ کرنے کے ساتھ ہی نفس کی عزت، شرافت اور کرامت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ہماری یہ گفتگو بجائے خود عرفان و تصوف کے مسلک پر ایک اور تنقید تھی۔ ہم نے اسے اسلام کی کسوٹی پر پرکھا اور دیکھا کہ نفس کے خلاف جہاد کے سب سے بڑے گناہ گئے کہ اس میں نفس کی عزت اور کرامت بھی پامال ہو گئی ہے۔ جب ہم ان کے اس نظریے کو اسلام کے معیار پر جانچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہاں سے اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ  
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

## دسویں نشست

### مختلف مکاتب فکر کے نظریات کی تفصیل (۷)

گٹلہ اور ایسے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جہاد کیا۔ پھر ان کو خدا کی راہ میں جو مصیبت پڑی اُس پر نہ تو انہوں نے ہمت ہاری — نہ بودا پین کیا — نہ دشمن کے آگے گڑ گڑائے اور خدا تو ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورہ آل عمران - آیت ۱۴۶)

کامل انسان، برتر انسان، مثالی انسان، بلند مرتبہ اور سرفراز انسان..... کے بارے میں جو مختلف مکاتب ہیں ان میں سے ایک — مکتب قدرت ہے۔ اس مکتب کی نظر میں — کامل انسان — مقتدر اور صاحبِ قدرت انسان کے مساوی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس مکتب کے نزدیک — کمال — طاقت کے مساوی اور — نقص — عجز و ناتوانی کے مساوی ہے۔ یعنی انسانوں میں جو زیادہ طاقتور ہے وہ زیادہ کامل ہے اور جو زیادہ

کمزور ہے وہ زیادہ ناقص ہے۔ نیز حق اور عدالت کی بنیادی طور پر کوئی حقیقت نہیں اور قوت و طاقت کے بغیر ان کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

ہم عموماً اسی طرح سوچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے قطع نظر کہ یہ قوت فتح مند ہو یا وہ قوت — ان میں سے ایک حق و عدالت اور دوسری باطل اور ظلم ہے۔ اب ممکن ہے کہ ایک موقع پر حق — باطل کو شکست دے اور اس پر فتح پائے یا معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی باطل — حق پر فتح پائے۔ البتہ قرآن کی منطق کے مطابق ”آخری فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے“ اور باطل کی فتح وقتی ہوتی ہے، قرآن کے نقطہ نظر کے مطابق یہ باتنا بے حد قابل توجہ ہے لیکن اگر وہ طاقتیں ایک دوسرے کے مقابلہ آجائیں اور ایک طاقت دوسری کو شکست دیدے تو یہ کہنا قرآن کے نظریے کے مطابق نہیں کہ فتح پانے والی طاقت — حق ہے اور جو شکست کھا جائے وہ باطل ہے۔

جو کام ایک طاقتور اور مقتدر شخص کرے اس دلیل سے کہ وہ شخص طاقتور ہے — اس کا وہ کام عین عدالت ہے۔ یہ بھی ایک ممکنہ فکر ہے اور اس کی جڑیں سقراط سے قبل کے دور تک پہنچتی ہیں۔ سقراط — حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تقریباً چار سو سال پہلے گزرا اور اس وقت سے اب تک تقریباً ۲۴ سو سے ۲۵ سو سال گزر چکے ہیں۔ سقراط سے پہلے فلسفیوں کا ایک گروہ تھا جسے سوفسطائی کہا جاتا ہے اور وہ اجتماعی مسائل میں ایسا ہی نظریہ رکھتے تھے لیکن ان کا یہ نظریہ سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفیوں کے ظہور سے جو یونان میں ہی مشنوخ ہو گیا اور پھر مسیحیت آگئی جو کلی طور پر اس طرز فکر کے

۲۷۶

برعکس ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ مسیحیت طاقت کی تبلیغ نہیں کرتی بلکہ وہ کمزوری کا پرچار کرتی ہے۔ یعنی وہ کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے دایں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو اور اس کے مقابل اپنا دفاع نہ کرو۔ یہ ایک طرح سے کمزوری کی تبلیغ ہے۔ اولاً مسیحیت کے فروغ اور ثانیاً اسلام کے ظہور کے باعث دنیا میں اس قسم کے خیالات یعنی سوفسطائیوں کے نظریے کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی۔

اگرچہ قدرت اور قوت کے بارے میں اسلام کی اپنی ایک خاص منطق ہے جس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے۔ لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ اس معاملے کو اس طرح پیش نہیں کرتا کہ قوت — حق و عدالت کے مساوی اور حق و عدالت — قوت کے مساوی ہیں جیسا کہ خود اہل یورپ بھی کہتے ہیں کہ ”طاقت حق ہے“ — MIGHT IS RIGHT یعنی حق ہی طاقت ہے۔ یوں ایک مرتبہ پھر سرزمین مغرب میں بھی خیال زندہ ہو گیا کہ حق — طاقت کے مساوی ہے۔ پہلے پہل یہ خیال سیاست کے فلسفے میں ظاہر ہوا یعنی سیاست ایک لمحہ وہ رہا اور آگے نہیں بڑھا۔

اُٹلی میں ایک عالم اور فلاسفر گورلے جس کا نام میکیا ولی تھا۔ اس نے اپنے سیاسی فلسفے کی بنیاد اقتدارِ اعلیٰ پر رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سیاست میں جو واحد چیز ملحوظ خاطر رکھی جانی چاہیے وہ اقتدارِ اعلیٰ ہے۔ پس سیاست میں اس کے علاوہ کسی دوسرے اصول کے ذریعے سیاسی مقاصد حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

جھوٹ، قریب، لکڑا جھوٹی قسمیں، خیانت کرنا، حق سے روگردانی

وغیرہ جیسے مسائل کو سیاست میں زیر بحث نہیں لانا چاہیے۔ اس کے علاوہ کچھ اور فلسفی بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے اس نظریے کو فقط سیاست میں پیش نہیں کیا بلکہ اسے ایک عام اخلاقی اصول کے طور پر پیش کیا اور سیاستدانوں کو کھلی چھٹی دیدی۔ یہاں تک کہ بنیادی طور پر وہ اس بات کے معتقد ہو گئے کہ اخلاق عالیہ اور مقام انسانیت کا ضامن بس میکیا ولی کا نظریہ سیادت ہی ہے۔

نطشہ۔۔۔ جرمنی کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے جو دنیا کے معروف فلسفیوں میں سے ہے اور اپنی زندگی کے آخری دور میں دہوانہ ہو گیا تھا۔ میراثیاں ہے نہ اس کی طبیعت میں جنون کے آثار شریع ہی سے ظاہر تھے۔ یہ شخص بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے طاقت کو اخلاق کی بنیاد قرار دیا اور ”طاقت“ کو ایک عام اخلاقی اصول کے طور پر پیش کیا۔

یہاں ایک تہمید ضروری ہے اور وہ یہ کہ تقریباً چار صدیاں پہلے یعنی سو اسی صدی عیسوی میں سائنس اور منطق میں ایک انقلاب رونما ہوا ہے۔ دنیا کے عظیم فلسفیوں میں سے ڈیکارٹ فرانسیسی اور ہیکن برطانوی دو ایسے اشخاص ہیں جنہیں جدید علم و دانش کا پیشرو کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کا اور بالخصوص ہیکن کا۔۔۔ علم کے بارے میں ایک نظریہ ہے جس نے علم کے منطق تمام گزشتہ نظریات کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ نظریہ جہاں علوم کی ترقی اور انسان کے فطرت پر غیر معمولی تسلط کا موجب قرار پایا ہے وہاں انسانوں کے فاسد اور گمراہ ہونے کا سبب بھی بنا ہے یعنی اسی نظریے نے انسان کو انسان کے ہاتھوں آباد کیا اور اسی نے انسان کو خود انسان کے ہاتھوں برباد اور



فاسد کر دیا ہے۔ وہ نظریہ کیا ہے؟

بیکن سے پہلے علم کے بارے میں بنی نوع انسان کے سربراہ آوردہ اشخاص فلاسفہ اور بالخصوص بائبان مذاہب نے علم کو قدرت اور طاقت کے حصول کی خاطر نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی خاطر استعمال کیا تھا یعنی وہ بزرگ اور خصوصاً بائبان مذاہب انسان کو علم حاصل کرنے کا شوق دلاتے ہوئے اپنے کلمات میں جس چیز پر زور دیتے وہ یہ تھی: اے انسان! عالم بن اور یہ جان لے کہ علم تجھے حقیقت تک پہنچائے گا۔ علم انسان کے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور اسی بنا پر اس کو تقدس حاصل تھا اور اسے ایک مقدس حقیقت سمجھا جاتا تھا۔ علم انسان کی دنیاوی منفعتوں سے بلند اور مادی امور سے بلند تر تھا۔ چنانچہ علم کو ہمیشہ مال و دولت کے مقابلے پر رکھا جاتا تھا کہ آیا علم بہتر ہے یا مال؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری فارسی اور عربی دونوں زبانوں کی ادبیات میں یہ موازنہ کیا گیا اور علم کو دولت پر ترجیح دی گئی ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

علم دادند بہ اوریس و بہ قارون نرد سپہم

آن یکی زیر زمین و آن دیگری فوق فلک

حضرت اوریسؑ کو علم دیا گیا اور وہ اس کی برکت سے آسمان

پر پہنچ چکے ہیں، ادھر قارون کو سونا چاندی ملا اور وہ اس

کی نحوست کے ساتھ زمین میں دھنس گیا تھا۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے بھی علم اور مال کے درمیان موازنہ کیا

اور علم کو مال پر ترجیح دی ہے۔ یعنی آپ علم کو ہمیشہ ایک مقدس چیز سمجھتے تھے

اور اسے مادی امور اور مادی فوائد سے بلند تر گردانتے تھے۔



۲۷۹

۳۵ اے کمبل! علم کی شناسائی ایک دین ہے کہ جس کی اقتدار کی جاتی ہے۔ اس سے انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے اپنی اطاعت منواتا ہے اور مرنے کے بعد نیک نامی حاصل کرتا ہے یاد رکھو کہ علم حاکم ہوتا ہے اور مال محکوم!

(منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ کلام ۱۴۷ صفحہ ۸۵۰)

۳۶ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا مجھے اپنا غلام بنا لیا۔ آپ قرآن مجید کو بھی دیکھیں کہ اس نے علم اور اس کی تقدیس کو کس شان سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت آدمؑ کی خلقت، آپؑ کو اسما کی تعلیم، ان کا علم کہ جس سے فرشتے بھی بے خبر تھے — اور فرشتوں کا انہیں سجدہ کرنا بھی ملاحظہ کریں:

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب کے سب جھک گئے۔ مگر شیطان نے انکار کیا، غرور میں آگیا اور کافر ہو گیا۔ (سورۃ بقرہ - آیت ۳۴)

یعنی اے ملائکہ، اے فرشتو! آدمؑ کو سجدہ کرو کیونکہ آدمؑ وہ چیز جانتا ہے جو تم نہیں جانتے ہو۔

لیکن پھر وقت آگیا کہ جب یکن اٹھا اور اس نے کہا: علم انسان کے لیے تفریح کا ذریعہ ہے — یہ کہنا کہ علم کے پیچھے اس لیے جاؤں کہ ہم حقیقت کو دریافت کرنا چاہتے ہیں اور حقیقت کا دریافت کرنا بجائے خود ایک مقدس چیز ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ انسان کو چاہیے کہ علم کو زندگی کی خدمت پر لگا دے اور اچھا علم وہی ہے جو انسان کے کاروبار زندگی میں مددگار ثابت ہو۔

وہ انسان کو طاقت دے اور انسان کو فطرت پر مسلط کر دے۔

یہی وجہ ہوئی کہ علم نے اپنا آسمانی اور روحانی پہلو — زمینی اور مادی پہلو کے سپرد کر دیا یعنی علم اور تحقیق کا راستہ بدل گیا اور ان کا رخ زیادہ سے زیادہ فطرت کے اسرار و رموز دریافت کرنے کی جانب مڑ گیا۔ کس لیے؟ اس لیے کہ انسان فطرت پر مسلط ہو جائے۔ چلیے وہ فطرت پر مسلط ہو گیا — تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ بہتر طور پر زندگی بسر کرے گا، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی کے لیے زیادہ سہولتیں فراہم کرے گا۔

ہاں تو اس نظر لیے نے ایک لحاظ سے بنی نوع انسان کی بہت ہی عظیم خدمت انجام دی، کیونکہ علم اس کائنات کے اسرار و رموز دریافت کرنے کے راستے پر لگ گیا — تاکہ انسان فطرت پر تسلط حاصل کرے اور اس سے بہرہ مند ہو۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو علم نے یہ جو کچھ کیا — بہت اچھا کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی علم نے اپنی تقدیس اور اپنا اعلیٰ مقام کھو دیا ہے۔ اس وقت بھی علوم دینیہ کے جو طلباء پرانے تعلیمی مراکز میں قدیم معیارات کے مطابق تعلیم پا رہے ہیں ان کے نزدیک علم کی وہی قدر و قیمت ہے جو مثلاً کتاب آداب المتعلمین اور کتاب منبہ المریدین بیان کی گئی ہے۔ ان کتابوں میں روایات، احادیث اور ایسی چیزیں موجود ہیں جن کے مطابق علم ایک مقدس اور پاکیزہ چیز ہے۔ ان روایات و احادیث میں حکم دیا گیا ہے کہ جب ہم کسی علمی مرکز میں سبق لینے جائیں تو ہمیں وضو کر کے اور پاک ہو کر جانا اور تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ وہاں کے استاد اور معلم طلباء کے نزدیک ایک خاص احترام اور جلال کے حامل ہیں۔ انہیں ایک خاص تقدس حاصل ہے اور وہ طلباء واقعی

دل کی گمراہیوں سے استاد کا ادب کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دولت کی خاطر علم حاصل کرنا چاہے تو اسے اپنے دل میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اس لیے علم حاصل کرتا ہوں تاکہ آئندہ اس سے مال و دولت کمائوں یا اگر معلم طلباء کو تعلیم دینا چاہے اور اس کا مقصد تعلیم کے بدلے میں دولت حاصل کرنا ہو تو وہ اسے علم کے مقام کی گراؤ سمجھتا ہے۔ لیکن جدید نظام تعلیم جو بیکین وغیرہ کی بتائی ہوئی ڈگر پر چل رہا ہے اس میں تعلیم و تعلم کا عمل ایسا تقدس مکمل طور پر کھو چکا ہے۔ ایک طالب علم جب علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے نزدیک یہ آئندہ زندگی میں دولت کمانے کی تیاری کا عمل ہوتا ہے۔ اس روش کے مطابق اگر ایک شخص سکول یا یونیورسٹی میں جاتا ہے تاکہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بن جائے اور بہتر زندگی کا سامان فراہم کرے یا ایک شخص بازار میں جاتا ہے تاکہ ایک تاجر کا شاگرد بن کر دولت کمانے کے قابل ہو جائے تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بھی روپے پیسے کے پیچھے جاتا ہے اور یہ بھی روپے پیسے کے پیچھے جاتا ہے۔ روپے پیسے کے بارے میں بھی کچھ اس انداز سے سوچتا ہے کہ یہ صاحب ہر جینے اتنی ساری فیس لے لیتے ہیں اور فیس کی ادائیگی کے بارے میں اسے یہ الفاظ کہنے بھی چاہئیں۔ جیسا کہ علی طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں اور کوئی عجب نہیں کہ ایک شاگرد پیٹھ پیچھے اپنے استاد کو چند گالیاں دینے میں کوئی شرم محسوس نہ کرے اور اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

لیکن آیا اور اس نے کہا: علم طاقت کے لیے ہے۔ علم اس لیے ہے کہ طاقت کی خدمت کرے۔ دانائی صرف توانائی کے لیے ہے کسی

اور چیز کے لیے نہیں۔ ابتدا میں تو اس نظریے کے بڑے اثرات ظاہر نہیں ہوئے لیکن تدریج جب انسان علم سے فقط طاقت چاہنے لگا تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر چیز قدرت اور طاقت کی خدمت میں لگ گئی۔ اس وقت دنیا کا پیہر اسی محور پر گھوم رہا ہے کہ علم مکمل طور پر طاقتوں کی خدمت میں لگا ہے۔ دنیا میں علم کبھی بھی اتنا قیدی نہیں بنا اور طاقتوروں کی خدمت میں نہیں جُتّا رہا جتنا آج ہے یعنی دنیا کے صاحبانِ علم طاقتوروں کے قیدی ہیں۔ مثلاً اُن سٹائن کو لیجیے، اس کا علم کس کی خدمت میں ہے۔ وہ روز ویٹ کی خدمت میں ہے۔ یعنی اُن سٹائن۔ روز ویٹ کا خادم بن گیا ہے اور یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ خادم بنے یا نہ بنے۔ علم امپیریلزم کے کیمپ میں ہوا سوشلزم کے کیمپ میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس وقت وہ ہر جگہ طاقت کی خدمت میں مصروف ہے۔ یہ علم نہیں بلکہ طاقت ہے جو اس دنیا پر حکم چلا رہی ہے، اس لیے آج کل ہمارا یہ کہنا کہ ہماری دنیا علم کی دنیا ہے۔ یہیں اس بات میں تھوڑی سی تصحیح کر لینی چاہیے۔

ہماری دنیا علم کی نہیں بلکہ طاقت کی دنیا ہے، یعنی علم ہے لیکن آزاد نہیں۔ یہ علم 'طاقت' اور جبر کی خدمت میں مصروف ہے۔ لہذا دنیا میں جو اختراع یا انکشاف ہوتا ہے اسے طاقت کی خدمت پر لگا دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے انسانوں کو قتل کرنے کے لیے خطرناک اسلحہ تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی علم پہلے وہاں جاتا ہے اور پھر کچھ بیچ جائے تو انسان کے دوسرے کاموں کی خدمت میں صرف کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انکشاف بھی ہوتا ہے سوائے اس کے جو اس کے کام کا نہ ہو وہ طاقت کی خدمت میں ہی جاتا ہے۔

۲۸۳

اگر وہ طاقت کے کام کا ہو تو پہلے اسے وہیں لے جایا جاتا ہے اور جب تک ضروری ہو اسے خفیہ رکھا جاتا ہے، کیونکہ طاقت کو اس کی حاجت ہوتی ہے۔ جب وہ یہاں ضرورت سے زائد ہو جاتا ہے تو پھر اسے زندگی کے دوسرے شعبوں کی خدمت میں بھیج دیا جاتا ہے۔

خو راستہ یہ کہیں نے اختیار کیا ہے وہ لازمی طور پر اس راستے سے جا ملتا ہے جو نطشے اور میکیا ولی نے — بالخصوص جو کچھ نطشے نے بنایا تھا۔ ایک اور نظر یہ بھی دنیا میں پیدا ہوا اور وہ نطشے کے لیے ایک اور سہارا بن گیا — وہ ڈارون ازم کے اصولوں میں سے ایک اصول تھا۔

خود ڈارون ذاتی طور پر ایک متدین عیسائی تھا اور وہ ایک ایسا آدمی نہیں تھا جو خدا کا مخالف ہو۔ وہ ایک مذہبی آدمی اور مخلص عیسائی تھا۔ اس کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جانکنی کے عالم میں اس نے عیسائیوں کی مقدس کتاب اپنی چھاتی پر رکھی ہوئی تھی اور اسے بھینچ رکھا تھا۔ وہ خود بھی اپنے مہر کی کلمات میں خدا کے وجود کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے مسیح علیہ السلام سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود دنیا میں ڈارون کے اصولوں سے از حد غلط فائدہ اٹھایا گیا اور شاید وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو سکے مگر ہو گیا۔

مادہ پرستوں نے ڈارون کے اصول ارتقا کو خدا کی ہستی سے انکار کا ذریعہ قرار دیا اور یہ بجائے خود ایک داستان ہے۔ فلسفے سے ایک اور غلط فائدہ اخلاق یعنی ایک مثالی، برتر اور کامل انسان کی تعبیر کے بارے میں اٹھایا گیا، کیونکہ اسکا ایک اصول ”مادہ بقائے اپنی جنگ کی خاطر جنگ ہے“

۲۸۴

ڈارون نے جن چار اصولوں کی بنیاد رکھی ان میں سے ایک ”جرب انتہا“ ہے۔ یعنی ہر حیوان اپنی ذات سے محبت کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا ”تنازع بقا“ کا اصول ہے یعنی اس نے کہا کہ اس دنیا میں زندگی کی بنیاد تنازع بقا پر ہے۔ جاندار ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہیں اور جو زیادہ طاقتور ہے وہ باقی رہتا ہے۔

انہیں فطرت کی چیلنی میں بھٹکا جاتا ہے۔ یہ جنگ فطرت کی چیلنی ہے اور اس میں مسلسل چھانا جاتا ہے۔ اس جنگ میں جو حیوانات ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں اور فطرت ان کو چھٹتی ہے۔ ان میں سے جو بہتر ہو اسے بقا کے لیے چن لیتی ہے۔ یعنی اس کو جس نے جنگ میں اپنی بہتر حفاظت کی ہو اور حریف کو ختم کر دیا ہو۔

اب ڈارون کے اس اصول پر اعتراضات کیے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ موجودات باقی رہتے ہیں لیکن اس کی وجہ بقا کے لیے قوی یا بہتر ہونا نہیں ہے۔ اس کے باوجود نطشے نے اس اصول سے نتیجہ اخذ کیا اور کہا ہے کہ تمام موجودات حتیٰ کہ انسان میں بھی تنازع بقا زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ چنانچہ وہ انسان جو زیادہ طاقتور ہو باقی رہتا ہے اور اُسے باقی رہنا بھی چاہیے۔ پھر اس نے یہ بھی کہا ہے کہ فطرت برتر انسان کی جانب مقرر کرتی ہے اور یہ وہی چیز ہے جس سے ہم ”کامل انسان“ مراد لیتے ہیں۔ تاہم وہ کہتا ہے: برتر انسان ————— سیرمین SUPERMAN اور کامل انسان کو کسی آئندہ وقت پر وجود میں آنا چاہیے۔



۲۸۵

ہم اس سے سوال کرتے ہیں: کامل انسان سے کیا مراد ہے؟  
وہ کہتا ہے: زیادہ طاقتور انسان اور ایسا انسان جس میں ضعیف پرور  
اخلاق ہرگز موجود نہ ہوں۔

اس کی نظر میں ضعیف پرور اخلاق کو کتنے ہیں؟ یہ وہی ہیں جنہیں ہم آجکل  
محبت کرتا، مہربانی کرتا، احسان کرنا اور خدمت خلق کرنا کہتے ہیں۔

وہ مزید کہتا ہے کہ یہ اخلاق نہیں ہیں، کیونکہ انہوں نے ابوالبشر کو  
بندی سے زمین کی پستی میں پہنچایا۔ یہی ہیں جو انسان کے ارتقار میں مانع  
ہیں اور یہی ہیں جو بڑے انسان، طاقتور انسان اور زیادہ کامل انسان کے ظاہر  
ہونے میں مانع ہیں۔ کامل انسان وہی ہے جس میں کمزوری کی علامتیں اور کمزوری  
جنہیں ہم کمال شمار کرتے ہیں۔ موجود نہ ہوں۔ لہذا وہ سقراط کا بھی  
دشمن ہے اور مسیح کا بھی دشمن ہے۔

وہ کہتا ہے: سقراط نے اپنے اصول اخلاق میں عظمت، پاکیزگی، عدالت  
اور مہربانی وغیرہ کی تعلیم دی تو اس نے بہت بُرا کیا۔ بلکہ اس کے نظریے کے  
مطابق سقراط سے بھی یہ ترحضرت عیسیٰؑ جنہوں نے محبت اور مہربانی کے ضمن  
میں یہ سب کچھ کہا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری کے لفاظ ہیں اور انسان ان سے  
جس قدر دوری رکھتا ہو، اتنا ہی کمال کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ کیونکہ کمال  
کے معنی توانائی اور نقص کے معنی ناتوانی کے ہیں اور یہ چیزیں نقص سے پیدا ہوتی  
ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اصل بات صحیح راستے سے کہاں تک ہٹ گئی ہے۔

زیادہ وضاحت کی خاطر ہم ان کے کچھ اقوال بیان کرتے ہیں جو تاریخ  
فلسفہ کی اکثر کتابوں میں نقل ہوئے ہیں۔ میں نے فروغی کو دوسروں سے بہتر



پایا ہے۔ لہذا میں آپ کی خاطر وہ اقوال پیش کرتا ہوں جو فردغی نے نقل کیے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ”سیر حکمت در اروپا“ میں کہتا ہے :

”دنیا کے تمام اہل دانش نے خود پستی کو بُرا اور دوسرے پر شفقت کو اچھا سمجھا اور نفس کی کمزوری اور عیب گردانا ہے۔ چونکہ مسئلہ بحث طلب ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس بارے میں گفتگو کرنی چاہیے کہ آیا شفقت اور مہربانی نفس کی کمزوری ہے یا نہیں؟ اس نے شوپنہاؤر کے اس عقیدے کی تصدیق کی ہے کہ دنیا میں بنیادی چیز زندگی کی خواہش ہے۔ لیکن اس کے اس خیال کی مخالفت کی ہے کہ زندگی کی خواہش بری چیز ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جوہر زندگی کا طالب ہے اور بسا ہوتا بھی چاہیے زندگی کی طلب بالکل درست ہے اور زندگی کی خواہش درحقیقت طاقت کی خواہش ہے۔

ڈارون کی آراء میں سے نطشے نے بقا کی کوشش کو قبول کر لیا ہے اور اسے تنازع کے معنوں میں لیا ہے۔ گویا جس چیز کو دوسروں نے ڈارون کی فاسد رائے کا نتیجہ سمجھا، اس نے اسے درست قرار دیا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش کی حالت میں ہوں، طاقت حاصل کریں اور دوسروں پر غلبہ پائیں۔

عالم آخرت کے بیشتر خواتین نے اکثریت کے حالات کی رعایت کو واجب شمار کیا اور کہا ہے کہ دنیا کے امور کا دار و مدار عوام کی اچھی حالت پر ہے۔ اس کے برعکس نطشے نے اکثریت کو ذلیل سمجھا ہے اور فقط اقلیت یعنی خواص کو خوشحالی کا حقدار شمار کیا ہے۔ نطشے کی سوچ کی بنیاد یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ طاقتور ہو اور اس کی زندگی از حد خوش اور پرسرت ہو۔ نیز

اس کا نفس زیادہ شکستہ اور زیادہ طاقتور ہو، نیز اس کا نفس میلانات اور مطالبات سے بھرا ہوا ہو۔

اس بارے میں بحث بیکار ہے کہ دنیا کی زندگی اچھی ہے یا بُری ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ کوئی شخص بھی اس کا پتہ نہیں چلا سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں بہتر ہوتا کہ ہم دنیا میں آتے ہی نہ ہوتے، مجھے علم

نہیں شاید ایسا ہی ہو لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہ اچھا ہوا یا برا ہوا بہ طور میں

اس دنیا میں آگیا ہوں اور اس کی اچھائی برائی کو نہیں جانتا۔ پھر بھی مجھے

اس دنیا سے لطف اندوز ہونا چاہیے اور جتنا زیادہ لطف اندوز ہوں اتنا

ہی بہتر ہے۔ یہ سوچنے کا وہی انداز ہے جو معاویہ کا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ہم دنیا

کی نعمتوں کے مزے لوٹتے رہے اور لوٹتے رہیں گے۔ جو چیز اس مقصد کے حصول

میں مددگار ہو وہ اچھی ہے۔ خواہ وہ سنگدلی، بے رحمی، مکر و فریب اور

جنگ و جلال ہی کیوں نہ ہو۔ پھر جو چیز اس مقصد میں مزاحم ہو اور اس کے خلاف

ہو وہ بری ہے۔ خواہ وہ سچائی، مہربانی، فیصلت اور تقویٰ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ بات غلط ہے اور عالم انسانیت کی ترقی کے منافی ہے کہ لوگ، قبیلے

اور قومیں کیساں حقوق رکھتے ہیں۔ اس کی بجائے لوگوں کے دو گروہ ہونے

چاہئیں۔ ایک وہ جو زبردست اور آقا ہوں۔ دوسرا وہ جو ماتحت اور

غلام ہوں، شرافت اور بڑائی زبردست لوگوں کا حق ہے کہ وہی اس دنیا

کے وجود میں آنے کا مقصد ہیں اور کمزور لوگ محض ان کی اغراض پوری کرنے

کا ذریعہ ہیں۔ دنیا کی ترقی اور زندگی کی ہمارا بھی بڑے اور زبردست لوگوں کی

بدولت وجود میں آتی ہے جو محدود تعداد میں ہیں اور اکثریت کو چاہیے کہ ان

کے کاروبار کی ترقی کا وسیلہ بنے۔ انسانی معاشرہ اسی شریف طبقے کے کاروبار کی ترقی کے لیے تشکیل دیا گیا ہے اور جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے معاشرہ اس لیے نہیں ہے کہ — زیر دستوں کی حفاظت اور پرورش کریں، بلکہ زبردست اور طاقتور لوگ جو کہ آقا ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ پرورش ہونی چاہیے۔ تاکہ ان میں سے برتر آدمی وجود میں آئیں اور انسان ترقی و عروج کے مدارج میں قدم رکھے ”حکومت اور معاشرہ اس لیے ہیں کہ طاقتور لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ کمزور لوگ چوپایوں کا حکم رکھتے ہیں جنہیں طاقتور لوگوں کا بوجھ اٹھانا چاہیے“ (سیر حکمت، ۱۹۹۰ء، ج ۱، صفحہ ۱۹۸)

ادھر سعدی شیرازی کہتے ہیں:

گو سفند از برای چوپاں نیست

بلکہ چوپاں برای خدمت اوست

بھیڑیں، چرواہے کے لیے نہیں، بلکہ چرواہا بھیڑوں کی

دیکھ بھال کرنے کے لیے ہے۔

لیکن مکتب قدرت کہتا ہے کہ، حقیقت بھڑ اس گڈرپے کے لیے ہے

یعنی زبردست اور طاقتور لوگ جو سردار اور آقا ہیں، انہی کو چھوٹا پھلنا چاہیے

تاکہ ان میں سے برتر اشخاص وجود میں آئیں اور انسان اوج و عروج کے مدارج

طے کرے۔ خود مغرب کے اہل دانش میں بھی نسل انسانی کی اصلاح اور

بہبود کے بارے میں ایک بحث پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایکس کارل

نے اپنی کتاب ”انسان موجودنا شناختہ“ کے آخر میں اسی اصول کو اختیار

کیا اور کہا ہے کہ نسلوں کی اصلاح ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کا نظریہ تو یہ ہے کہ

دنیا کے کمزور انسانوں کو سرے سے تولید نسل کا حق ہی نہیں دینا چاہیے۔  
 لوگ اب تک جن اخلاقی اصولوں کی پیروی کر رہے ہیں وہ عام لوگوں  
 اور اشرافیہ طبقے یعنی زبردستوں کے مفاد کی خاطر ترتیب دیے گئے ہیں اور زبردستوں  
 اور شریف طبقے کے فائدے کے لیے نہیں ہیں۔ لہذا ان اصولوں کو ختم کر دینا  
 چاہیے اور ایسے اصول اختیار کرنے چاہئیں جو شریفوں اور طاقتور لوگوں کے  
 مفاد میں ہوں۔ نیکی، سچائی اور احسان کوئی حقیقی امور نہیں ہیں۔ ماں جو چیز  
 حقیقت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص طاقت کا طلبہ گار ہے۔

مذاہب نے مبنی نوع انسان کو دھوکا دیا اور ان کو عدالت کے قیام اور  
 زبردستوں کی حمایت کرنے کی دعوت دی ہے۔ مذاہب سے پہلے کے دور  
 اچھے تھے کہ جب دنیا میں جنگل کا قانون جاری تھا اور جو زیادہ طاقتور ہوتا  
 تھا وہ کمزور کو کھاتا تھا اور کمزور نسل معدوم ہوتی چلی جاتی تھی۔ ابتدائی  
 زمانے میں دنیا طاقتور لوگوں کی مرضی کے محور پر گھومتی تھی اور کمزور ان کے  
 ماتحت اور غلام تھے۔ تاہم طاقتور تھوڑے اور کمزور بہت زیادہ تعداد میں تھے،  
 اس لیے انہوں نے جیلے، تدبیر اور دھوکے سے کام لے کر ان طاقتور لوگوں  
 کو اپنی ترقی کا وسیلہ بنایا۔ چنانچہ انہوں نے مہربانی و شفقت، فروتنی و خیر خواہی  
 اور عدالت و کرامت کے اصول کو نیکی راستی اور احسان کی شکل میں ان کے  
 ذہنوں میں جلوہ گر کیا اور قبول کرایا۔ تاکہ اس طریقے سے وہ طاقتور لوگوں کی  
 طاقت کو معتدل بنا سکیں اور ان کی غلامی سے نجات پائیں۔ انہوں نے اپنے  
 اس مقصد کو مذاہب کے وسیلے سے حاصل کیا اور خدا کے نام اور حق کو ان  
 مذاہب کا قلعہ پناہ گاہ قرار دیا۔

۲۹۰

تاہم مذہب قدرت کے حامیوں کا یہ نظریہ کارل مارکس کے نظریے کے بالکل برعکس ہے جو کہتا ہے کہ مذہب کو طاقتور لوگوں نے کمزور لوگوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر اختراع کیا ہے جبکہ نطشے کہتا ہے کہ مذہب کو کمزوروں نے طاقتوروں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر اختراع کیا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں ہی مذہب کے مخالفت میں لیکن ایک کا دعویٰ ہے کہ مذہب کمزوروں نے اختراع کیا، کیونکہ یہ اپنے آپ کو طاقتوروں کا طرفدار سمجھتا ہے مگر وہ دوسرا جو اپنے آپ کو کمزوروں کے طرفدار کے طور پر پیش کرتا ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ مذہب کو طاقتوروں نے اختراع کیا ہے تاکہ کمزوروں کی شرش پر قابو پا سکیں اور پھر وہ سقراط بدھ اور مسیح پر اعتراض کرتا ہے۔

وہ کہتا ہے: مسیحی اخلاق غلامی کا اخلاق ہے اور اس نے آفاقی کے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ انسانی برادری، برابری اور صلح طلبی — نیز عورتوں اور مزدوروں کے حقوق کی رعایت اور ایسی ہی دوسری باتیں جو آج کل کہی جا رہی ہیں ان کا ماتخذ مذہب ہے جو دھوکے قریب اور کمزوری اور انحطاط کا موجب ہے۔ ان اصولوں کو ترک کر دینا چاہیے اور آفاقی کی زندگی کے اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ خدا اور آخرت کی زندگی کا ذکر ہمیں کرنا چاہیے اور مہربانی اور رقت قلب کو دل سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔

مہربانی کی بنیاد یہی ہے اور فروتنی و فرباندراری — فرومایگی سے پیدا ہوتی ہے، نیز علم و حوصلہ اور غفو و چشم پوشی — بے ہمتی اور سستی کا نتیجہ ہیں۔ اس کی بجائے انسان کو مردانگی اختیار کرنی چاہیے تاکہ وہ ”پرتر مرد“ کے رتبے پر پہنچے۔ برتر مرد وہ ہے جو اچھائی اور برائی سے

برتر ہو اور قوت و قدرت حاصل کرنے کا عزم دارادہ رکھتا ہو۔

اہل یورپ کے درمیان ایسے بہت سے مکاتب پیدا ہوئے۔ مگر خوش قسمتی سے ہمارے درمیان ایسے مکاتب اور ایسی دہائیں پیدا نہیں ہوئیں۔ چنانچہ یورپی روح یہی ہے۔۔۔ وہ حقوق انسانی کا جو اعلامیہ دیتے ہیں وہ بھی محض دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے ہے۔ یورپی تربیت اور حقیقی یورپی اخلاق، میکیاولی کا اخلاق اور نطشے کا اخلاق ہے۔ آج کافر کی استعمار دنیا میں جو کام انجام دے رہا ہے وہ اسی بنیاد پر ہے اور فرنگی استعمار کی روح خواہ وہ امریکی ہو یا یورپی۔ یہی ہے اور اس کا اخلاق بھی یہی ہے۔

جب وہ ہمارے سامنے آتے ہیں تو حقوق انسانی کا دم بھرتے ہیں اور ہم ایسے بد بخت ہیں کہ ان کی باتیں دہراتے اور جگالی کرتے رہتے ہیں، خدا کی قسم! یہ غلطی ہے اور بہت بڑی غلطی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ امریکہ نے ویت نام میں کیا کیا؟ کیا اس نے نطشے کے فلسفے پر عمل کرنے کے علاوہ کچھ اور کیا ہے؟ ہرگز نہیں! بڑھیک، ٹھیک، یہی فلسفہ ہے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رسل نے یہ کہا اور سارتر نے یہ کہا، حالانکہ وہ بھی اس کے ہم فکر ہیں اور تمام فرنگیوں کی سوچ کی بنیاد اسی پر ہے۔ بہت کم افراد ایسے ہوں گے جنہیں مستثنیٰ قرار دیا جاسکے اور جو اس انداز پر نہ سوچتے ہوں ان کا خون بھی شاید سر زمین مشرق سے ہو گا یا ان کی ماں لازماً یہاں سے گزری ہوگی (حاضرین کا ہنسنے اور نہ ان سب کا تنخم اور ضمیر ایسا ہی ہے۔

نطشے کہتا ہے: ”نفس کشی کیوں کی جائے؟“ اس کی بجائے نفس کو



۲۹۲

پالنا چاہیے۔ دوسروں کی خدمت کیا چیز ہے؟ اس کی بجائے انسان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو چاہے اور اپنے آپ کو پوچھے۔ نیز کمزور اور ناتواں لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دینا چاہیے۔ برتر مرد وہ ہے جو طاقتور ہو اور طاقت کے ساتھ زندگی بسر کرے، اپنی خواہشات کو پورا کرے اور خوش رہے، اپنے آپ کو آقا اور مالک سمجھے، اس کی آقا کی راہ میں جو بھی رکاوٹ درپیش ہو، اسے ہٹائے، خطرے سے ہر سال نہ ہو اور جنگ سے نہ ڈرے۔

پھر وہ خورتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

”عورت کی مرد سے بڑی اور اس کے حقوق کی رعایت کا لازم ہونا بھی ایک غلط بات ہے۔ اصل چیز مرد ہے اور مرد کو چاہیے کہ سمجھو تو عورت کا کام جنگجوؤں کو تفریح مہیا کرنا اور بچے پیدا کرنا ہے۔“

پس ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کامل انسان یعنی مثالی اور اعلیٰ انسان کو متعارف کرانے کا یہ بھی ایک معیار ہے جو مکتب قدرت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے مقابلے پر ایک اور مکتب ہے جو کمزوری کا پرچار کرتا ہے اور وہ نیکی اور خوبی کو کمزوری میں مضمر سمجھتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ ہوتے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ یہ اعتراض خصوصاً مسیحیت پر وارد ہوتا ہے کہ اس نے کمزوری پر مبنی اخلاق کا بہت زیادہ پرچار کیا ہے۔ یہی بات کہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اپنا بائیں گال بھی پیش کر دو۔ کمزوری کی تبلیغ ہے۔

اس معاملے میں اسلام کی منطق کیا ہے؟ کیا اسلام نے ان دونوں



۲۹۳

میں طاقت کا پرچار کیا ہے یا کمزوری کا یا نہ طاقت کا اور نہ کمزوری کا؟ ہاں اس نے ایک اور لحاظ سے طاقت کا پرچار کیا ہے لیکن ایسی طاقت کا جو لٹشے کی طاقت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی طاقت ہے جس سے انسانیت کی اعلیٰ صفات ابھرتی ہیں۔ ایک ایسی طاقت کا جس سے مہربانی ابھرتی ہے، رحم ابھرتا ہے، شفقت ابھرتی ہے اور احسان ابھرتا ہے۔

اسلام میں طاقت اور توانائی کی دعوت دی گئی ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید اور روایات میں طاقت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور کچھ لوگ جنہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی دین نے اپنے پیروؤں کو طاقت اور توانائی کی جانب اتنی دعوت نہیں دی جتنی اسلام نے دی ہے۔

ساریج تمدن کی کیا رضویں جلد جو تمدن اسلام سے مخصوص ہے اس میں ویل ڈورینٹ نے ایک جملہ کہا ہے: ”کسی دین نے لوگوں کو طاقت اور قوت کی جانب اس قدر دعوت نہیں دی جتنی اسلام نے دی ہے“ اس سلسلے میں بہت سے مطالب ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک مقام پر حضرت یحییٰ سے خطاب کیا گیا ہے:

”اے یحییٰ! کتاب تو ریت کو قوت کے ساتھ  
تھام لو۔ (سورہ مریم - آیت ۱۲)

آپ ایک اور جگہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کس جرأت کے ساتھ فرماتا

ہے:

اور ایسے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہترے  
اللہ والوں نے جہاد کیا۔ پھر ان کو خدا کی راہ میں جو مصیبت بھینٹ

۲۹۴

پڑی اس پر نہ تو انہوں نے ہمت باری — نہ بودا پین دکھایا  
 — نہ دشمن کے آگے گڑگڑائے اور خدا تو ثابت قدم رہنے  
 والوں سے اُلفت رکھتا ہے۔ (سورہ آل عمران - آیت ۱۴۶)  
 یعنی خدا فرماتا ہے کہ مومنین یا ہمت ہوتے ہیں اور وہ کمزوری و بزدلی  
 کو اپنے پاس بھٹکنے بھی نہیں دیتے۔

۳۸؎ خدا تو ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی  
 راہ میں یوں پسا باندھ کے لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی  
 ہوئی دیوار ہیں۔ (سورہ صفت - آیت ۴)  
 یعنی مومنین بڑے ثابت قدم ہوتے ہیں اور کوئی طاقت انہیں ان  
 کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتی۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:  
 محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ  
 کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دلی ہیں۔  
 (سورہ فتح - آیت ۲۹)

قرآن میں ایسی ہی اور بھی آیات ہیں جن میں شجاعت کو اسلام کی ایک  
 قابل ستائش حقیقت کہا گیا ہے۔ عزت یعنی اوجھا مقام رکھنا اور طاقت کا  
 اس حد تک ہونا کہ انسان کو کوئی بھی دوسرا شخص ذلیل و خوار نہ کر سکے —  
 اسلام میں ایک حمد و روح چیز ہے۔

قرآن مجید دشمن سے مقابلے کے بارے میں فرماتا ہے:  
 ۱۳۹؎ (مسلمانو!) ان کفار کے مقابل جہاں تک ہو سکے زور بازو

۲۹۵

اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے سامان مہیا کرو۔ اس سے تم  
خدا کے اور اپنے دشمن پر دھاک بٹھا لو گے۔

(سورۃ انفال - آیت ۶۰)

دشمن کے مقابلے میں جتنی قوت ہو سکے بہم پہنچاؤ تاکہ وہ تمہاری  
طرف میل آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

قرآن یہ بھی فرماتا ہے :

”اے جو لوگ تم سے لڑیں، تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو

اور زیادتی نہ کرو۔ خدا زیادتی کرنے والوں کو ہرگز دوست

نہیں رکھتا۔ (سورۃ بقرہ - آیت ۱۹)

یعنی دشمن سے لڑتے ہوئے بھی حق اور عدالت کو فراموش نہ کرو مثلاً

جب دشمن سے لڑو تو جنگ اس وقت تک جاری رکھو جب تک دشمن اسے جاری

رکھے۔ اگر دشمن اطاعت قبول کرے اور ہتھیار ڈال دے تو تم بھی ہتھیار استعمال

نہ کرو کیونکہ یہ بھی زیادتی اور تجاوز ہے۔ بڑھوں کو موت قتل کرو نہ بچوں کو موت

قتل کرو عورتوں کو موت قتل کرو اور ان سے معترضی نہ ہو۔ جو لوگ میدان

جنگ سے چلے جائیں انہیں جانے دو اور جو شخص تم سے جنگ کرے فقط اس

کے ساتھ پوری قوت سے جنگ کرو۔

یہ ان احکام کا ایک سلسلہ ہے جو قرآن مجید میں ہیں۔ کیونکہ اس

طرح کی اور آیات بھی ہیں۔ اب ہم نمونے کے طور پر چند حدیثوں کی جانب

اشارہ کرتے ہیں، تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اسلام نے کس طرح بزدلی، خوف اور

کمزوری کی مذمت اور قوت و طاقت کی تعریف کی ہے۔ لیکن جس قوت اور

۲۹۶

طاقت کی اسلام تعریف کرتا ہے وہ نطشے کے فلسفے سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی  
\_\_\_\_\_ کل رات میں اس کی مزید توضیح کروں گا۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

۱؎ مومن کے لیے دو چیزیں مناسب نہیں ہیں — یعنی

کنجوسی اور بزدلی۔ (جامع السعادات جلد ۲ صفحہ ۱۱۱)

ان کی مختصر تشریح یہ ہے:

۱۔ بخل اور وہ یہ ہے کہ دینیہ پیسہ اپنی جان سے عزیز تر رکھے۔  
۲۔ خوف اور بزدلی، مومن بزدل نہیں — وہ بہادر اور طاقتور ہوتا

ہے۔

رسول اکرمؐ اپنی ایک دعائیں فرماتے ہیں:

۲؎ اے پروردگار! میں دو چیزوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں

اور وہ ہیں کنجوسی اور بزدلی۔ (جامع السعادات جلد ۲ صفحہ ۱۱۱)

امام علی علیہ السلام مومن کے بارے میں فرماتے ہیں:

۳؎ مومن کا نفس پیچھے سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

(کنز العمال ج ۳۳ ص ۹۱۵)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

۴؎ خدا نے ہر چیز میں اختیار مومن کو دیا ہے، سوائے ایک

چیز کے جس کا اختیار اسے نہیں دیا گیا اور وہ ہے خوار و ذلیل ہونا

\_\_\_\_\_ کیونکہ مومن ہمیشہ معزز ہوتا ہے اور وہ کبھی ذلت قبولی

نہیں کرتا۔ مومن پہاڑ سے بھی زیادہ بلند پایہ، زیادہ اونچا اور

۲۹۷

زیادہ معزز ہوتا ہے، کیونکہ پہاڑ کو ایک کدال سے کھودا جاسکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن کے دین میں سے کوئی چیز توڑی جائے۔ (سفینۃ البحار۔ مادۃ قوض)

یعنی یہ ناممکن ہے کہ مومن کے دین اور اس کی روح کا ایک بھی ٹکڑا کسی کدال سے کاٹا جائے، انگ کیا جائے اور اسے ریزہ ریزہ کیا جائے۔ امام یاقر علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا نے تعالیٰ نے مومن کو تین حصص دی ہیں:

- ① دنیا اور آخرت میں عزت
- ② دنیا اور آخرت میں نجات
- ③ ظالموں کے سینے میں ہیبت

(المواظعۃ العددیہ صفحہ ۱۰۳)

یعنی مومن کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ظالم اپنے دل میں اس کی ہیبت اور خوف محسوس کرتا ہے۔ نیز ہمیں غیرت کے بارے میں بھی کچھ روایات ملتی ہیں، کیونکہ غیرت بجائے خود ایک طاقت ہے اور بے غیرتی ایک قسم کی کمزوری ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: ابراہیمؑ پیغمبرِ غیور تھے اور میں ان سے زیادہ غیور ہوں۔ جو شخص مومنوں اور مسلمانوں کے بارے میں باغیرت نہ ہو خدا اس کی ناک کاٹ دیتا ہے۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ سعد غیور ہے۔ میں اس سے زیادہ غیور ہوں اور میرا خدا بھی غیور ہے۔ اس موضوع پر بھی ہمارے پاس اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں۔

۲۹۸

اقبالِ پاکستانی نے ایک جملہ کہا اور یہ جملہ بڑا عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسولینی کے جواب میں کہا گیا ہے۔

مسولینی کہتا ہے: جس کے پاس لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے، اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے پاس روٹی ہو تو پھر اپنے پاس لوہا دطاقت اور اسلحہ رکھ۔ اقبال نے کہا: جو بذاتِ خود لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

یعنی مسولینی اسلحہ پر بھروسہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس کے پاس مادی قوت ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

لیکن اقبالِ روح پر تکیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص خود لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

امیر المومنینؑ نے فرمایا:

مومن کا نفس پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ان جملوں کا مقصد اور مفہوم ایک ہی ہے

بہر حال اسلام قوت اور طاقت کی دعوت دیتا ہے اور ہم بیچ البلاغہ میں دیکھتے ہیں کہ امیر المومنینؑ نے طاقت اور قوت کی کس قدر دعوت دی ہے اور کزوری کو اس کے لیے قطعاً مناسب نہیں سمجھا، آپ فرماتے ہیں:

۵۴۷ خدا کی قسم! جن افراد قوم پر ان کے گھروں کے حدود کے

اندر ہی حملہ ہو جاتا ہے وہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

(منہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲ صفحہ ۱۵۳)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

۵۴۸ ذلیل آدمی ذلت آمیز زیادتیوں کی روک تھام نہیں



کر سکتا اور حق تو بغیر کوشش کے نہیں ملا کرتا۔

(بیچ البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۹۔ صفحہ ۱۵۹)

خلاصہ یہ ہے کہ مکرور آدمی ظلم کو کبھی نہیں روک سکتا اور سعی و کوشش کے بغیر حق ہرگز حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اپن مغرب ایک جملہ کہتے ہیں: ”حق لینے کی چیز“ یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ آیا حق لینے کی چیز ہے یا دینے کی چیز ہے؟ یعنی کیا حق ایک ایسی چیز ہے جو انسان اپنی خوشی سے حقداروں کو دیدیتے ہیں یا ایک ایسی چیز ہے جو حقداروں کو خود لینی چاہیے؟ بعض مکتب کہتے ہیں کہ حق دینے کی چیز ہے یعنی جس شخص نے لیا ہو اسے چاہیے کہ وہ واپس کرے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایسا نہ کرے، بہر حال حق دینے کی چیز ہے لینے کی نہیں۔

مسیحیت اس بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حق تمہیں دیا جائے ہم سفارش کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ حق تمہیں دیا جائے۔ لیکن تمہیں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ انسانیت اور شافی کے خلاف ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ حق دینے کی چیز ہے، مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حق فقط لینے کی چیز ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ جس شخص نے حق مار لیا ہو وہ دوبارہ آئے اور اسے واپس کر دے؟

اسلام کے نقطہ نگاہ کے مطابق ”حق لینے کی چیز بھی ہے اور دینے کی چیز بھی ہے“ یعنی حق حاصل کرنے کے لیے دو محاذوں پر جنگ کرنی چاہیے کیونکہ اسلام کے مکتب کی بنیاد یہی ہے۔ جس شخص نے کسی کا حق چھینا ہو اسلام اسے اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے وہ حق ادا کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور پھر



۳۰۰

وہ ادا کر بھی دیتا ہے لیکن اسلام اسی پر اکتفا نہیں کرتا اور اس کے ساتھ ہی اپنے حق سے محروم کیے گئے شخص سے کہتا ہے کہ حق لینے کی چیز ہے اور تمہیں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہونا اور اسے واپس لینا چاہیے۔ ایک جملہ ہے جو امام علی علیہ السلام نے مالک انشتر کے نام اپنے مشہور خط میں نقل کیا:

”اے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی موقوف پر یہ فرماتے سنا: اس قوم میں پاکیزگی نہیں آسکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق نہیں دلایا جاتا۔ (تاج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ عہد نامہ ۵۳ صفحہ ۷۲)“

یعنی کوئی امت اور کوئی قوم پاکیزگی، ترقی اور بہبود کے مقام پر نہیں پہنچتی مگر یہ کہ اس سے پہلے اس نے یہ مرحلہ طے کیا ہو کہ کمزور طاقتور کے مقابلے پر اٹھ کھڑا ہو اور اپنا حق یوں طلب کرے کہ اس کی زبان سے لکنت پیدا نہ ہو۔

پس جو کمزور اپنا حق طلب نہیں کر سکتا وہ اسے جاننا ہی نہیں ہے جس معاشرے میں کمزور لوگ اتنے ضعیف النفس ہوں کہ اپنے حقوق کا مطالبہ بھی نہ کر سکیں۔ وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ گزشتہ زمانے میں ہمارے بزرگ و کیسے تھے؟ خود رسول اکرمؐ کیسے تھے؟

رسول اکرمؐ کی خصوصیات میں سے ایک روحانی قوت اور جسمانی طاقت تھی۔ آپ طاقتور تھے، شجاع تھے اور آپ قوت و شجاعت کی تعریف کرتے تھے۔ پس اسلام طاقت کو انسان کے لیے ایک قدر کے طور پر پہچانتا ہے۔

۳۰۱

اسلام میں طاقت اور توانائی انسانی قدروں میں سے ایک قدر ہے اور اس کے ساتھ کئی اور قدریں بھی ہیں۔ یہ سب قدریں مل کر اسلام کا مطلوبہ کامل انسان تشکیل دیتی ہیں۔

نطشے نے تمام انسانی قدروں میں سے صرف یہی ایک قدر دیکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ ایک باغ میں سے فقط ایک پودے کی آبیاری کریں تو وہی بڑھے گا اور دوسرے بہت سے پودے خشک ہو کر رہ جائیں گے۔

نطشے کے مکتب اور اسلام میں یہ فرق ہے کہ اس کے مکتب میں انسانیت کو فقط ایک قدر حاصل ہے اور وہ ہے طاقت یا تمام دوسری قدریں اس میں کم ہو جاتی ہیں اور اس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ لیکن اسلام میں طاقت انسان کی بہت سی بلند قدروں میں سے ایک قدر ہے اور حیب بہ قدر دوسری قدروں کے ساتھ ملتی ہے تو ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

## گیارہویں نشست

### مختلف مکاتب فکر کے نظریات کی تفصیل ⑤

۸؎ اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور نیکی کرنے اور قرا بتداروں کو کچھ دینے کا حکم کرتا ہے۔ وہ بدکاری، بڑی حرکتوں اور سرکشی کرنے سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (سورہ نحل - آیت ۹۰)

گزشتہ نشست میں کامل انسان کے بارے میں طاقت و قوت کے نقطہ نگاہ سے بحث کی گئی تھی۔ اس مکتب میں کمال فقط طاقت کے مساوی ہے اور نقص کمزوری کے مساوی ہے، حتیٰ کہ اچھے اور برے کو بھی اسی پیمانے اور اسی معیار سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ اچھے کے معنی طاقتور اور اچھائی کا مطلب توانائی ہے اور برے کے معنی کمزور اور بُرائی کا مطلب کمزوری ہے۔ عام طور پر فلسفی اپنی بحثوں کی توجہ کمال اور نقص کی بنیاد پر اور متکلمین حسن و قبح (نیکی اور بدی) کی بنیاد پر کرتے ہیں جبکہ مکتب قدرت میں ان دونوں ہی

سید سید

چھرا ہا لطیف آباد، پوسٹ نمبر 61-8

۳۰۳

کو طاقت اور کمزوری کے معیار پر جانچا گیا ہے فلسفی کہتے ہیں کہ کمال اور نقص ان کے نزدیک کمال کے معنی طاقت اور نقص کا مطلب کمزوری ہے۔ تنکلیں کہتے ہیں حسن و قبح یا نیکی و بدی — ان کے خیال میں نیکی کے معنی طاقت اور بدی کا مطلب کمزوری ہے۔ تاہم مکتب قدرت میں حق و باطل اور عدل و ظلم کو بھی قدرتی طور پر اسی پیمانے یعنی طاقت اور کمزوری کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے، یعنی حق ایسی چیز نہیں جو طاقت سے جدا ہو سکے اور باطل ایسی چیز نہیں جو کمزوری سے جدا ہو سکے۔

عدل و ظلم کی بھی یہی صورت ہے، یعنی عدل کے معنی طاقت اور ظلم کا مطلب کمزوری ہے۔ لہذا اگر دشمن آپس میں لڑیں اور ان میں سے ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور ہو اور غالب آجائے تو اس مکتب کے مطابق وہی زیادہ کمال ہے۔

بہتر ہے نیز صاحب حق اور صاحب عدل بھی ہے، اس کے برعکس جو مغلوب ہو جائے اور شکست کھا جائے۔ وہ ناقص ہے۔ مغلوب ہونا اور کمزور ہونا ایک نقص ہے اور اس کے معنی بُرا، ظالم اور باطل پر ہونے کے ہیں۔ بنا بریں اس مکتب میں دو غلطیاں وجود رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس مکتب میں طاقت کی قدر کے سوا تمام انسانی قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ طاقت خود ایک انسانی قدر ہے اور آجکل کی اصطلاح میں ایک خوبی ہے اور ہمارے اپنے فلسفیوں کی اصطلاح میں ایک کمال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طاقت — کمال کے مساوی ہے، لیکن کمال — طاقت کے مساوی نہیں ہے۔

لہذا ہمارے حکما اور فلسفی ذات واجب الوجود کے بارے میں ثابت کرنے کے بعد کہ وہ وجود محض ہے اور وجود محض کمال کے مساوی ہے۔ اس کے بعد وہ ہر اس چیز کو جو کمال کے مساوی ہو، ذات خدا کے لیے دلائل سے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ایک قدرت ہے۔ قدرت اپنی ذات کی حد تک کمال ہے اور وہ جو کچھ بھی ہے کمال ہے۔ جیسا کہ علم، ارادہ، اختیار اور زندگی کمال ہیں۔ لہذا انسان کے بارے میں بھی اس بات کی تردید نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے لیے بھی قوت اور قدرت ایک کمال ہے۔ کمزوری کی جانب میلان رکھنے والے مکاتب کہ جنہوں نے کمزوری کا پرچار کیا ہے، وہ قطعی طور پر غلطی پر ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ قدرت تنہا کمال نہیں ہے، جیسے کہ حق تعالیٰ کی ذات میں بھی قدرت واحد صفت کمالیہ نہیں ہے۔ بلکہ ذات حق کی بہت سی صفات کمالیہ اور بہت سے اسمائے حسنیٰ ہیں۔ ان صفات کمالیہ میں سے ایک قدرت ہے اور ان اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم قادر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کی صفت کمالیہ فقط قدرت ہی ہو۔

اس مکتب کی پہلی غلطی جو اگرچہ پہلی غلطی سے بڑی نہیں تو چھوٹی بھی نہیں ہے اور وہ خود قدرت کے بارے میں ہے۔ پھر نہ صرف یہ کہ اس مکتب میں قدرت کے علاوہ دوسرے کمالات اور قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ نظریہ قدرت کا مدعی ہونے کے باوجود اس مکتب نے قدرت کو بھی ٹھیک طور پر نہیں سمجھا۔ کیونکہ اس نے قدرت کو صرف ایک چیز میں دیکھا ہے۔ یعنی اس کے دو مختلف درجوں میں سے صرف ایک درجے کو پہچاننا کہ جو حیوانی قدرت ہے۔ حیوان کی قدرت اس زور سے عبارت ہے جو اس کے پٹھوں

۳۰۵

میں ہوتا ہے۔ حیوان کی تمام قدرت عضلاتی ہے جو اس کے عضلات (پٹھوں) میں پائی جاتی ہے اور اس کی تمام خواہشیں بھی نفسانی خواہشیں ہوتی ہیں۔ انسان کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں پٹھوں کی قدرت کے علاوہ بھی قوت کا ایک مبدار وجود رکھتا ہے۔ یعنی بالفرض اگر ہم مکتب قدرت کے حامل ہوں تو نتیجہ وہ نہیں ہوگا جو نطشے نے اخذ کیا کہ جس کی بنا پر انسان کے لیے قدرت کے تابع ہونا ضروری ہے۔ لہذا آپ قدرت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور جب آپ کو قدرت حاصل ہو جائے تو جو بھی کمزور ہو اس کے سر پر ضرب لگائیں۔ اپنے نفس کی پرورش کریں اور اس دنیا کی مادی نعمتوں سے بھرپور ہوں۔ لیکن نہیں۔۔۔۔۔ اس قدرت کا نتیجہ بھی یہ نہیں ہے!

اب میں اسلامی معیارات کے ساتھ ایک وضاحت کرتا ہوں اور رسول اکرمؐ کے بارے میں ایک داستان سے ابتدا کرتا ہوں:

حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ ایک دن رسول اکرمؐ مدینہ میں کسی جگہ سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ مسلمان نوجوان ایک پتھر کو وزن اٹھانے کی مشق کے طور پر اٹھا اٹھا کر اپنا زور آزمایہ کر رہے تھے۔ وہ ایک بڑا سا پتھر تھا اور اس کے ذریعے ان کے زور کا اندازہ کیا جا رہا تھا۔ جیسے آجکل وزن اٹھانے کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی کتنا ہٹا میں نے خوب وزن اٹھا یا۔۔۔ اور کوئی کتنا ہے کہ میں نے خوب اٹھایا ہے۔

رسول اکرمؐ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس مقابلے کا ثالث بن جاؤں؟

یہ سن کر سبھی خوش ہوئے اور انہوں نے یہ تجویز مان لی۔  
آنحضرتؐ نے فرمایا:

اچھا تو میں تمہارا ثالث ہوں، اب تمہیں پتھر اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے ایک معیار مقرر کرتا ہوں جس سے پتھر اٹھائے بغیر ہی پتہ چل جائے گا کہ کون زیادہ طاقتور ہے۔

پھر آپؐ نے فرمایا:

وہ شخص جسے نفس ایک گناہ کی ترغیب دے، اس کے اندر گناہ کی خواہش بھی ہو اور پھر بھی وہ اس خواہش کا مقابلہ کرے۔ نیز کسی کو کوئی چیز پسند ہو کہ جس میں گناہ اور مصیبت ہو، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نفس کے مقابلے پر ڈٹ جائے تو وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

یہاں رسول اکرمؐ نے نفسانی خواہش کے مقابلے میں قوت ارادی کو پیش کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ زور فقط یہ نہیں ہے کہ ایک پتھر زمین سے اٹھا لیا جائے اور قدرت فقط یہ نہیں ہے کہ ایک بہت وزنی چیز کو اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسی قدرت ہے جو پٹھوں کے اندر ہوتی ہے اور یہ حیوانات کے پٹھوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ قدرت انسان اور حیوان کے درمیان مشترک چیز ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ قدرت کمال نہیں ہے ہے تو وہ بھی ایک کمال لیکن انسان کے بازوؤں اور اس کے بدن کے پٹھوں میں جو قدرت پائی جاتی ہے، اس سے بالاتر ”قوت ارادی“ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشوں کا مقابلہ کر سکے۔



۳۰۷

اسی منطق کی بنا پر اسلامی اخلاق اور بالخصوص ہماری عرفانی ادبیات میں ہمیشہ ان مسائل کو ایک قدرت کا نام دیا گیا ہے۔

رسول اکرمؐ نے مزید فرمایا:

۴۹؎ تمام لوگوں میں زیادہ شجاع، دلاور اور دلیر وہ شخص ہے جو اپنی نفسانی خواہشات پر غلبہ پالے۔

(منہج الفصاحت۔ کلمہ ۲۹۹)

یہاں پھر شجاعت، قدرت اور غلبے کا مسئلہ ہے۔ جیسا کہ سعدی شیرازی نے کہا ہے:

گرت از دست یہ آید رہتی شیریں کن

مردمی آن نیست کہ مشتی بزنی بردہنی

یعنی مردانگی یہ نہیں ہے کہ انسان دوسرے کے منہ پر مکھنچ مارے

بلکہ حقیقی قوت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہش کے برخلاف

دوسرے کا منہ میٹھا کر دے۔

مولوی معنوی کہتے ہیں:

وقت خشم و وقت شہوت مرد کو

طالب مردی چنینم کو بکو

جو طیش کی حالت اور نفسانی خواہش کی بھرپورک کے وقت اپنے

آپ کو قابو میں رکھے ہم جگہ جگہ ایسے ہی مرد کی تلاش میں ہیں۔

(مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۴۹۵)

یہاں وہ مردانگی کو اس طرح جاچختے ہیں — یعنی جب انسان کا غصہ

بھڑک اٹھے اور آگ کی بھٹی میں تبدیل ہو جائے تو مرد وہ ہے جو قوی ارادے کا مالک ہو اور یہ آگ کی بھٹی جو غصے کی آگ ہے، اس کا مقابلہ کرے۔۔۔ اسے کہتے ہیں مرد۔۔۔ اسے کہتے ہیں قوت اور قدرت۔۔۔ نیز جب شہوت جوش میں آجائے اور انسان کو بے اختیار کر دے تو قدرت یہ ہے کہ انسان اس وقت اپنی شہوت کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے۔ علمائے اخلاق نے جو خلاقی توہمیں بتائی ہیں اور نطشے نے اسے کمزوری کہہ کر ان کی نفی کی اور انہیں رد کر دیا ہے۔ اگر ہم ان کی صحیح جانچ پڑتال کریں تو ظاہر ہو گا کہ وہ سب قدرت اور قوت کی علامتیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ مانتے ہیں کہ بعض اوقات کچھ چیزیں جو درحقیقت قدرت نہیں بلکہ کمزوری ہیں غلطی سے قدرت سمجھ لی جاتی ہیں۔ لہذا علمائے اخلاق نے ہمیشہ کہا ہے کہ جذبات کو عقل اور ایمان کے ساتھ تو ام ہونا چاہیے۔ یعنی صرف یہ کہ انسان کے جذبات یکلخت برا ٹیگتے ہو جائیں کافی نہیں ہے بلکہ انہیں عقل کی ترازو پر تولنا چاہیے کہ آیا یہ جذبہ بجا اور منطقی ہے یا نہیں؟ مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں:

ترحم پر پلنگ تیسرے انداں

ستمکاری بود بر گوسفنداں

پھاڑ کھانے والے چیتے اور بھیرے پر رحم کرنا بیچاری بھیروں پر ظلم ہے۔

یعنی اگر آپ کسی شخص کو اس بھیرے پر رحم کھاتے ہوئے دیکھیں جس نے سیکڑوں بھیروں کو پھاڑ کھایا ہو تو جان لیں کہ یہ رحم بھیروں کے بارے میں ظلم کے برابر ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مثال ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ ایک ظالم

۳۰۹

انسان پر رحم کھانا اور اصل محکوم، مظلوم اور محروم لوگوں پر ظلم ہے۔ ظالموں پر کمزور لوگ ہی رحم کھاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک آیت ہے :

ایسے مرد و عورت کے بارے میں جو زنا کرے۔ چنانچہ اگر ایک بیوی والا مرد زنا کرے تو اسلام میں اس کی سزا سنگسار کرنا، قتل کر دینا اور مار ڈالنا ہے۔ نیز اگر شادی شدہ عورت زنا کرے تو اس کی سزا بھی سنگسار کرنا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کہتا ہے :

ہاں اگر تم خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکمِ خدا کے نافذ کر لے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا ترس لحاظ نہ ہونے پائے اور دونوں کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو وہاں موجود ہونا چاہیے۔

(سورۃ نور۔ آیت ۲)

یعنی مومنین کا ایک گروہ وہاں موجود ہونا چاہیے اور وہ لوگ جاہلیں اور امنہیں قتل کرنے کے کام میں شرکت کریں۔ لیکن یہ ایک ایسا مقام ہے کہ وہ کمزور نفوس کے لوگ جو معاشرے کی بلند تر مصلحتوں کو نہیں سمجھتے، جب یہ دیکھتے ہیں کہ دو انسان مارے جاتے والے ہیں تو ان کے جذبات ابھرتے ہیں کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ان پر رحم کیا جائے۔

اتنی چیزوں کے خیال کی تردید کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے کہ یہ موقع الٰہی سزا کے اجرا اور قانونِ خداوندی پر عمل کرنے کا ہے جو بنی نوع انسان کی بلند اور ہمہ گیر مصلحتوں کی بنیاد پر بنایا گیا ہے اور اس میں رحمہ لیلی کی کوئی

گنجائش نہیں۔ کیونکہ یہ رحمہ فی معاشرے پر ظلم ہے۔ یہ بات آجکل بھی بہت زیادہ زیر بحث رہتی ہے اور اکثر لوگ کہتے ہیں کہ پھانسی کیوں دی جائے؟ موت کی سزائیں کیا معقولیت ہے؟ موت کی سزا سراسر غیر انسانی فعل ہے۔ ان کی بات کا مطلب یہ ہے کہ مجرم نے خواہ کسی بھی جرم کا ارتکاب کیا ہو اسے موت کی سزا نہیں دینی چاہیے۔ پھر اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے“ یہ ایک عجیب اور بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے اور ایسا نہیں ہوتے دینا چاہیے کہ ان سے جرم سرزد ہو لیکن یا تو معاشرے میں ضرورت کے مطابق تربیت نہیں ہو پاتی جیسا کہ اکثر معاشروں کا حال ہے اور نہ صرف یہ کہ اصلاح کے عوامل وجود نہیں رکھتے بلکہ فساد اور بگاڑ کے عوامل وجود رکھتے ہیں۔ بالفرض اگر اصلاح کے کافی عوامل وجود رکھتے ہیں تو بھی معاشروں میں ہمیشہ انحراف کے عوامل بھی ہوتے ہیں اور وہ اصلاحی عوامل کے باوجود جرائم کے ارتکاب کا موجب بنتے ہیں۔ ان کا کیا علاج کرنا چاہیے؟ جو نہی موت کی سزا منسوخ کی جائے گی، اس کے ساتھ ہی وہ مجرم جن کی تمام کوششوں کے باوجود اصلاح نہ ہو سکی ہو یا معاشرے میں تربیتی عوامل وجود نہ رکھتے ہوں یا بالفرض موجود ہیں لیکن کافی نہیں ہیں تو وہ پہلے کی طرح جرائم میں سرگرم ہو جائیں گے۔

کیا یہ درست ہے کہ ہم آج اس یہانے کہ مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے اسے چھوڑیں تاکہ وہ جرم کرے اور پھر اس کی اصلاح کریں؟ یہ تو ارتکاب جرم کے لیے مجرم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، کیونکہ وہ مجرم کہتا ہے: معاشرے نے آج تک میری اصلاح کے بارے میں نہیں سوچا، جب میں بچہ تھا تو

میرے باپ نے میری تربیت اور اصلاح نہیں کی اور جب میں بڑا ہو گیا تو بھی کسی نے میری اصلاح نہیں کی۔ بہتر ہو گا کہ میں حرم کروں اور مجھے گرفتار کر کے قید خانے میں بھیج دیا جائے اور وہاں میری تربیت اور اصلاح کی جائے تاکہ میں ایک اچھا آدمی بن جاؤں۔

نیز ایک اور مجرم کہتا ہے: چور کے ہاتھ کاٹنے کا کیا مطلب ہے؟ یہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کی بینائی کمزور ہے۔ آپ اخبارات میں جرائم کے صفحات پر نگاہ ڈالیں تو دیکھیں گے کہ چوری کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ کتنی کثیر مقدار میں مال لوٹا جاتا ہے اس میں کتنے ہی اور جرائم بھی ہوتے ہیں اور کتنے انسان مارے جاتے ہیں۔ اگر چور کو قرار واقعی سزا دی جائے اور چور کو پورا پورا یقین ہو کہ اگر وہ چوری کرے گا تو پولیس اور قانون کے چنگل میں پھنس جائے گا۔ پھر قانون اس کی چار انگلیاں کاٹ دیگا اور مجرم کا یہ داغ مرتے دم تک اس کے بدن پر رہے گا۔ بخدا اگر دو چوروں کو بلکہ ایک ہی چور کو ایک مرتبہ یہ سزا دی جائے تو چوری مکمل طور پر ختم ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے اس کا دواڑہ بند ہو جائے۔

آج سے پچاس یا ساٹھ سال پیشتر جو حاجی مکہ گئے تھے، وہ جانتے ہیں کہ عربستان میں چوری کی وجہ بڑی عجیب تھی۔ حاجیوں کے وہ قافلے جن میں دو ہزار سے کم افراد ہوتے، وہ ان راستوں پر سفر کرتے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ وہ مسلح ہوتے تھے اور اپنے ساتھ فوجیوں کو لے جاتے تھے۔ اس کے باوجود بھی کوئی سال نہیں گزرتا تھا جب یہ نہ سنا جاتا ہو کہ بدوؤں نے حاجیوں کے قافلوں پر شیخون مارا، اتنے آدمیوں کو مار ڈالا اور اتنا مال لوٹ کر لے گئے۔

سعودی حکومت نے خواہ ہزاروں برسے کام کیے ہوں لیکن کم از کم یہ اچھا کام کیا ہے کہ چور کو عرفات میں یا منی میں یا نہ جانے کہاں لایا گیا، ان دنوں میں وہاں تمام حاجی موجود تھے اور قرآن کے حکم: ”ان کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو وہاں موجود ہونا چاہیے“ کے مطابق ان سب کی موجودگی میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، اور چور کا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا۔ پھر دیکھنے میں آیا کہ وہ سب لوگ جو چور تھے ان کی اصلاح ہو گئی اور آخر کار چوری کا خاتمہ ہو گیا۔ بلاشبہ ان میں سے کچھ لوگ سخت ناداری کی وجہ سے چوری کرنے لگے تھے اور وہ ناداری اب بھی موجود ہے۔ کیونکہ فقط سعودی شہزاد ہی مالدار ہیں۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ حاجیوں کا سامان گر جاتا ہے اور کئی دن گزر جاتے ہیں لیکن کوئی شخص اسے ہاتھ لگانے کی حمت نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارشاد قرآنی: ”حکم خدا کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا ترس و لحاظ نہ ہونے پائے“ کے مطابق چوری کرنے والے کو صحیح مقام پر کا حقہ عطا دی جاتی ہے۔ یعنی یہاں رحم کھانا غیر منطقی ہے اور فساد کے مواقع بھی اور ہوتے ہیں۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ مکتب قدرت جو ہمیشہ قوت کا دم بھرتا اور برتر مرد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس نے جہاں دوسری انسانی قوتوں کو نہیں پہچانا خود قدرت کی حقیقت کو نہیں جانا کہ وہ کیا ہے۔ ہاں اصل طاقت اور قدرت یہ ہے کہ انسان دوسرے کی مدد کے لیے دوڑے اور حقیقی صاحب قوت و قدرت روح وہ ہے جو اپنے فرزندوں سے کہتی ہے:

۳۱۳

ظالم کے دشمن اور مظلوم کے مددگار بنو۔

(سنج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ وصیت ۷ صفحہ ۷۳۷)

امام علی علیہ السلام اپنے دو عزیز فرزندوں حسن اور حسین علیہما السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

پیارے فرزندو! تمہاری قدرت اور تمہاری قوت کو ہمیشہ مظلوم کی مدد میں کام آنا چاہیے اور ظالم کے ساتھ جنگ میں صرف ہونا چاہیے۔ یہ ہے قدرت۔ لیکن وہ دشمنیاں، حسد اور نفرتیں جو لٹشے پیش کرتا ہے اتفاقاً وہ سب کی سب کمزوری سے جنم لیتی ہیں۔ ہاں تو جس آدمی کا دل ہمیشہ یہ چاہتا ہو کہ لوگوں سے انتقام لے، جو آدمی لوگوں کی بُرائی چاہتا ہو، جو شخص سیڑزم میں مبتلا ہو اور ہمیشہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہو، جیسا کہ لٹشے نے کہا ہے، وہ ایسی باتیں قدرت کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ کمزوری کی بدولت کرتا ہے۔ کیونکہ انسان جتنا زیادہ صاحب قوت ہوتا ہے اس کا حسد اور کینہ کم ہوتا ہے۔

امام حسینؑ فرماتے ہیں: ”طاقت و قوت کینے کو ختم کر دیتی ہے۔“

یہ جملہ بڑا عجیب ہے، جس کی بنیاد بے حد دقیق نفسیاتی مشاہدے پر رکھی گئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں طاقت کینے کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ یعنی جب انسان اپنے اندر طاقت محسوس کرتا ہے تو اس میں دوسروں کے لیے کینہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس کمزور آدمی ہے، یہ کمزور آدمی ہی ہے جو ہمیشہ دوسروں کے لیے کینہ رکھتا ہے اور ان سے حسد کرتا ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام کا ایک جملہ غیبت کے بارے میں ہے



۳۱۴

اور وہ بھی بڑا بیش بہا ہے۔ آپ سے پوچھا گیا: جو لوگ غیبت کرتے ہیں، جن کا جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ دوسروں کی پیٹھ پیچھے بُرائی کریں اور دوسروں کی بدگوئی کر کے لذت محسوس کرتے ہیں، وہ کون لوگ ہیں؟  
امام علی علیہ السلام نے فرمایا: وہ وہی لوگ ہیں جو کمزور عاجزان ناتواں ہوتے ہیں۔

۱۵۲ کمزور آدمی کا بھی زور چلتا ہے کہ وہ پیٹھ پیچھے بُرائی کرے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین، حکمت ۴۶۱ صفحہ ۹۵۲)

غیبت ایک کمزور انسان کی کوشش کی انتہا ہے، ایک قوی اور صاحب قدرت انسان جو اپنی روح میں قدرت کا احساس کرتا ہے اسے غیبت کرتے ہوئے شرم آتی ہے اور وہ غیبت کو گھٹیا اور کمزور انسانوں کا کام سمجھتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ امام علی علیہ السلام غیبت کو کمزوری پر مبنی قرار دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایک مقتدر روح ہرگز غیبت نہیں کرتی، حتیٰ کہ آپ زنا کو بھی کمزوری کا نتیجہ قرار دیتے اور فرماتے ہیں:

۱۵۳ خیرت مذکبھی زنا نہیں کرتا۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین، حکمت ۳۰۵ صفحہ ۹۰۷)

یعنی ساری دنیا میں ایک آدمی بھی جو اپنے اندر ذرہ بھر غیرت رکھتا ہے، اس نے کسی عورت سے زنا نہیں کیا اور دوسروں کی عزت پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ ہاں وہ فقط بے غیرت آدمی ہیں جو یہ کام انجام دیتے ہیں۔

بے غیرت آدمی سے مراد وہ انسان ہے جو اپنے اندر کمزوری محسوس کرتا ہے۔ یعنی وہ آدمی کہ اگر دوسرے اس کے ناموس کے ساتھ وہی کام انجام

دیں تو اسے تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ فقط بے غیرت لوگ ہیں جو زنا کرتے ہیں اور غیور لوگ ہرگز زنا نہیں کرتے لیکن نطشے ان قدروں کو نہیں پہچانتا اور وہ یہ کہتا ہے کہ قدرت کے معنی بازو کی قوت اور اسلحہ کی طاقت کے ہیں۔ قدرت کے معنی اپنے پاس لوہا ہونا اور اس کے ساتھ دوسروں کے سر بھوڑنا ہیں۔ اس کا سپر مین SUPERMAN ایک بہت بڑا حیوان ہے، وہ ایک ایسا مرد ہے جس کے بازوؤں میں بہت زیادہ زور ہے لیکن اسے روحانی قدرت اور قوت کی قطعاً کوئی خبر نہیں ہے۔

یہیں اسلام کے مکتب میں قدرت ایک انسانی قدر، ایک انسانی کمال اور کامل انسان کے چہرے کے خطوط میں سے ایک خط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کمزور انسان کو پسند نہیں کرتا اور خدا کو سست اور کمزور انسان اچھے نہیں لگتے۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام قدرت کو انسان کی واحد قدر نہیں سمجھتا اور وہ دوسری قدروں کا بھی قائل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے نقطہ نگاہ سے قدرت کی تعبیر نطشے اور فسطائی اور میکینکائی کی تعبیر سے مختلف ہے۔ اسلام انسان میں قدرتوں کا قائل ہے اور ان کو تقویت پہنچاتا اور ابھارتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اس سے مختلف ہے جو نطشے نے کہا ہے، کیونکہ اس میں معاشرے کی بھلائی ہے۔ بعد میں وہ کہتا ہے:

یہ جو انسان کا دل سمجھتا ہے تو یہ کمزوری کی وجہ سے ہے۔۔۔ نہیں یہاں گفتگو فیاضی کی ہے، گفتگو سخاوت کی ہے اور گفتگو بھلائی کرنے کی ہے۔ نطشے صاحب! آپ معاملے کو اس طرف سے کیوں نہیں دیکھتے؟

آپ اس معاملے کو اس زاویے سے دیکھیے کہ ایک صاحب قدرت شخص کا فیض دوسروں کو پہنچتا ہے یا ایک کمزور شخص کا؟ کیا قدرت سے فیض پہنچایا جاسکتا ہے یا کمزوری سے؟ ہاں فیض قدرت ہی سے پہنچایا جاسکتا ہے۔

ایک اور مکتب بھی ہے اور وہ مکتب محبت ہے کہ جس کا پرچار ہندوستان میں زیادہ ہوا ہے اور کسی حد تک مسیحیوں نے بھی اسے رواج دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسیحی اپنے مذہب کو مکتب محبت کہتے ہیں، لیکن وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اب اس کو مکتب ضعف کا نام دینا چاہیے اور وہ مکتب اصل میں کمزوری کی ستائش کرنے والا ہے۔ لیکن اہل ہند کے مکتب کو جب طور پر مکتب محبت کہا جاسکتا ہے۔ مکتب محبت میں انسان کا کمال خدمت خلق اور لوگوں سے محبت کرنے کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ یہ نقطے کے مکتب کے بالکل برعکس ہے اور اس نے جن چیزوں کی نفی کی ہے اس کے مقابلے میں ان کا اثبات کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جس کا فیض خلق خدا تک پہنچے اور انسانیت کے معنی خلق خدا کو فیض پہنچانے کے ہیں۔ لیکن مغربی مکاتب جب انسانیت اور انسان کی جانب جھکاؤ کی بات کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد وہی لوگوں کی خدمت اور لوگوں سے محبت ہی ہوتی ہے۔

ہمارے محلات اور جرائد جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز انسانی ہے یا انسانی نہیں ہے تو انسانی ہونے سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ خلق خدا کے لیے نفع رساں ہے اور غیر انسانی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لیے مفید

۳۱۷

ہمیں ہے۔ پس اس بنا پر انسانیت اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ انسانوں کی اور تمام خلق خدا کی خدمت کی جائے۔ خود ہمارے شعرا نے اس سلسلے میں مبالغہ آمیز تعبیرات کی ہیں، مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں:

عبادت بجز خدمت خلق نیست

یہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

گدڑی اور بھے ہوئے مصلے پر بیٹھ کر تسبیح پھیرنا نہیں، بلکہ

خلق خدا کی خدمت کرنا عین عبادت ہے۔

بلاشبہ اس میں سعدی کا ایک اور مقصد بھی ہے اور وہ ان صوفیوں پر تنقید کرنا ہے جن کا کام پیچیں پڑھنا، سجادہ پر بیٹھنا اور درویشی کی گدڑی اور بھنا ہے اور لوگوں کو خیر و اصلاح کے کاموں سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ سعدی اگرچہ خود ایک درویش ہیں لیکن ان کا رویہ محض ان درویشوں کی طرف ہے کہ خدمت خلق کی بات جن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کئی مواقع پر یہی بات کچھ اور لوگوں نے اس سے مختلف تعبیرات کے ساتھ کہی ہے۔ لیکن یہ تعبیرات درست نہیں ہیں مثلاً:

می بخور منبر لبسوزاں، مردم آزاری مکن

شراب پیو، مسجد کا منبر جلاؤ — مگر لوگوں کو ستانے سے

باز رہو۔

ان کے نقطہ رنگاہ کے مطابق دنیا میں فقط ایک بدی وجود رکھتی ہے اور وہ مردم آزاری ہے اور ایک نیکی وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک ہے چنانچہ مکتب محبت کے نقطہ سے عالم بشریت میں

فقط ایک کمال وجود رکھتا ہے۔ ایک ہی قدر وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا ہے۔ نیز صرف ایک ہی نقص وجود رکھتا ہے۔ ایک بدی وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس مکتب پر بھی تنقیدی نظر ڈالیں اور اس کی بھی جانچ پڑتال کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے نقطہ نظر کے مطابق خدمت خلق اور لوگوں کے ساتھ احسان ایک الہی اور انسانی قدر ہے۔ لوگوں سے محبت کرنا ان کی خدمت کرنا اور ان سے ہمدردی رکھنا اسلام کے نزدیک ایک کمال ہے ایک قدر ہے اور ایک نیکی ہے لیکن اسلام سب کچھ چھوڑ کر فقط محبت اور احسان پر منحصر کرنے کے خلاف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور نیکی کرنے اور قربانوں کو کچھ دینے کا حکم کرتا ہے۔ وہ بدکاری، بری حرکتوں اور سرکشی کرنے سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (سورۃ نحل - آیت ۹۰)

خدا تمہیں عدل کا حکم دیتا ہے یعنی تمہارے سے لوگوں کے حقوق کی آغا کرو ان کے حقوق کی حدیں قدم نہ رکھو اور ان کے ساتھ احسان کرو۔ پھر نہ صرف یہ کہ لوگوں کے حقوق پر تجاوز نہ کرو بلکہ اپنے مشروع حقوق میں سے بھی انہیں کچھ دیدو۔

ایثار ایک قرآنی اصول ہے یعنی انسان جو چیز خود رکھتا ہو وہ اس کا اپنا مال ہو اور اسے اس کی اشد ضرورت بھی ہو، پھر بھی وہ اس چیز کے بارے میں دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھے۔ ایثار انسانیت کے باشکوہ ترین

مظاہر میں سے ہے اور قرآن مجید نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔  
 ان انصار کے بارے میں جنہوں نے ہماجرین کو اپنے آپ پر مقدم  
 رکھا، قرآن نے ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا ہے:  
 ۴؎ اور چاہے اپنے اوپر تنگی ہی ہو دوسروں کو اپنے نفس  
 پر ترجیح دیتے ہیں۔ (سورہ حشر۔ آیت ۹)

اسی طرح وہ آیات ہیں جو امام علی مرتضیٰؑ، بی بی فاطمہؑ زہراءؑ اور  
 حسنین علیہم السلام یعنی اہل بیت کی شان میں نازل ہوئیں، ان میں فرماتا ہے:  
 ۵؎ وہ اس (خدا) کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو  
 کھانا کھلاتے ہیں۔ (فتمے ہیں) ہم تو تم کو بس خالص خدا کے  
 لیے کھلاتے ہیں، ہم نہ تم سے بدلہ اور نہ شکوہ گزار رہی ہیں  
 چاہتے ہیں۔ (سورہ دہر۔ آیت ۸-۹)

حسنین علیہم السلام کی ایک بیماری سے صحت یابی کے بعد، جیسا کہ  
 انہوں نے نذر مافی تھی، علیؑ، زہراءؑ اور حسنینؑ روزہ رکھتے ہیں۔ پھر امام علیؑ  
 جولاہے ہیں اور بی بی زہراءؑ اس کی روٹی پکاتی ہیں۔ افطار کے وقت ایک  
 یتیم آتا ہے اور یہ سب اپنا کھانا اٹھا کر اسے دے دیتے ہیں۔ اگلی رات  
 اور پھر اگلی رات کو بھی یہی صورت پیش آتی ہے، حتیٰ کہ مذکورہ اہمیت نازل  
 ہوتی ہے۔ بہر حال مسئلہ ایثار کا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ایثار ایک  
 بلند ترین انسانی قدر اور مقام ہے۔ اسلام نے بھی ایثار کی تعریف کی  
 ہے اور یا نعصوم رحم اور مہربانی ایسی چیزیں ہیں جو اسلام کی طرف سے ہمیشہ  
 پیش کی جاتی رہی ہیں۔

پھر ایک دن آپ سنتے ہیں کہ فلاں دوست کی خاطر انہوں نے کئی ہزار روپے خرچ کر دیے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسے سخاوت، انسان دوستی اور عاطفہ اجتماعی قرار دیں لیکن یہ عاطفہ اجتماعی نہیں — یہ خود غرضی ہے، یہ شہرت طلبی ہے اور وہ شخص ایسا اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنا نام بلند کرنا چاہتا ہے۔ اس شخص نے پہلے کئی ایک انسانوں کے حقوق یا مال کیے اور پھر ایک شخص کے لیے کچھ رقم خرچ کر دی ہے — اسے انسان دوستی نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح ہم میں سے بعض افراد کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ لگا لاتے ہیں اور اسے ہمان نوازی کا نام دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مرد ہیں اور مردے گھر کا دروازہ ہمانوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔ یہ بذات خود اچھی بات ہے لیکن ہم اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے۔ وہ عورت جو ہمارے گھر میں ہے، شرعی طور پر ہم اسے حکم دینے کا حق نہیں رکھتے اور وہ مختار ہے کہ اگر اس کی مرضی نہ ہو تو ہمارے گھر کا کوئی کام نہ کرے لیکن ہم ہمانداری کا یہ تمام بوجھ اور مصیبت اس بیماری عورت پر ڈال دیتے ہیں۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم تو بڑے ہمان نواز ہیں۔ مگر وہ ہمان نوازی جس کے نتیجے میں ایک انسان پر ظلم ہوتا ہو ہمان نوازی نہیں ہے۔

اب ذرا علی ابن ابی طالبؑ کو دیکھیے کہ آپ گھر کے کام میں اپنی زوجہ حضرت زہراؑ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہ وہ کام ہیں جو ان پاک بی بی نے خود اپنی مرضی سے اپنے ذمے لیے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تاکہ آپ کی عزیز تر بیکہ حیات پر کام کاج کا سارا بوجھ نہ پڑے پس اگر کوئی انسان یہ چاہے کہ اس کے کام انسانی جذبے کی بنیاد پر ہوں تو پہلے



اسے عدالت کے مرحلے سے گزرنا چاہیے۔ یعنی وہ عادل ہو اور کسی کے حق پر سجاوہ نہ کرے۔ پھر اگر وہ اپنے مشروع حقوق میں سے ایثار کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ہم کئی ایک بزرگ علماء کو جانتے ہیں جو اس بات کے پابند تھے کہ کسی کے حق پر معمولی سے معمولی تجاوز بھی نہ کریں۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنے گھر میں بھی اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ کسی ایسے کام کے بارے میں جو خود ان سے متعلق ہو ایک بار بھی اپنی بیوی، بیٹی یا بیٹے کو حکم دیں۔ البتہ ان کا اصول اس کام کے متعلق تھا جو خود ان کے اپنے کرنے کا ہوتا تھا اور اس کام کے بارے میں نہیں جس سے دوسروں کی تربیت منقصود ہوتی تھی۔

مرحوم حاج میرزا محمد تقی شیرازی جو بزرگ مراجع میں سے تھے ان کے بارے میں مرحوم استاد حاج شیخ عبدالمکریم حائری نے نقل کیا ہے: وہ اپنے کام کے لیے کبھی کسی کو حکم نہیں دیتے تھے۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو ان کے گھروالوں نے ان کے لیے کھانا تیار کیا، بچے کھانا لے کر آئے اور ان کے نزدیک رکھ کر چلے گئے۔ چونکہ وہ خود بیمار اور صاحب فراش تھے اس لیے اٹھ نہ سکے اور اسی طرح دو تین گھنٹے گزر گئے۔ جب وہ لوگ ان کے پاس آئے تو دیکھا کہ کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہے اور انہوں نے نہیں کھایا۔ چونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی بچے کو آواز دیتے کہ آکر یہ کام میرے لیے کر دو اس لیے انہیں شبہ ہوا کہ آیا اس کام کے لیے ان کا کسی بچے کو بلانا جائز ہے یا نہیں؟ پس ایثار اس وقت ایثار ہے جب خود غنائی اور خود غرضی کے لیے نہ ہو۔

رسول اکرمؐ کے بعض اصحاب جو جنگ موتہ میں شریک تھے، ان کے بارے میں ایک داستان نقل کی گئی ہے جو واقعی بڑی حیرت انگیز ہے اور جو کچھ انہوں نے کر دکھایا اسے صحیح معنوں میں ایثار کہتے ہیں۔

جنگ موتہ میں کچھ اشخاص زخمی ہو کر گر گئے تھے۔ چونکہ زخمی کے بدن سے خون خارج ہو جاتا ہے، اس لیے اسے سخت پیاس لگتی ہے اور زخمی شخص کو پانی کی حاجت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کو زخمی ہونے اور بدن سے زیادہ خون بہ جائے سے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ تب ایک شخص نے پانی سے بھرا ہوا برتن اٹھایا اور ان زخمی مسلمانوں میں پانی تقسیم کرتے لگا۔ وہ ان کے قریب سے گزر رہا تھا تاکہ اگر کسی زخمی کو پانی کی ضرورت ہو تو اسے پلا دے۔ جب وہ ایک زخمی کے پاس پہنچا اور دیکھا کہ وہ پیاسا ہے تو اس نے اسے پانی پلانا چاہا۔ لیکن اس زخمی نے ایک اور زخمی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ پیاسا ہے۔ وہ فوراً اس زخمی کے پاس پہنچا، لیکن اس نے ایک تیسرے کے بارے میں کہا کہ وہ اس پانی کا مجھ سے زیادہ مستحق ہے۔ جب وہ پانی لے کر تیسرے شخص کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ دوسرے کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بھی مر چکا ہے۔ اسے کہتے ہیں ایثار اور قربانی۔ یعنی انتہائی ضرورت کے باوجود بھی دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم رکھنا!

وہ دو اعتراف جو ہم نے مکتب قدرت پر کیے تھے، یعنی وہی دو اعتراف مکتب محبت پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ پہلا اعتراف یہ ہے کہ مکتب محبت بھی ایک قدر کا حامل ہے۔ یعنی اس نے باقی قدریں بھلا کر فقط خدمت و محبت کی قدر کو اپنا

۳۲۷

لیا ہے۔ محبت انسان کے لیے کمال ہے اور فیاضی انسان کے لیے کمال ہے اور جیسے کہ فلسفیوں نے ثابت کیا ہے کہ فیاضی، جود اور بخشش صفات کمالیہ میں سے ایک صفت ہے جو ذات باری تعالیٰ کے لیے بھی ہے۔ لہذا ذات باری تعالیٰ خود فیاض علی الاطلاق ہے۔ کیونکہ فیاضی خود اس کی صفت کمال ہے۔ پس اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے یہ غلطی کی ہے کہ دوسری قدروں کو فراہم کر دیا اور کہا کہ خدمت خلق کے علاوہ کوئی دوسری چیز وجود نہیں رکھتی اور انسانیت اسی پر منحصر ہے۔

یہ ایک غلطی اور بہت بڑی غلطی ہے۔ جیسے کہ مکتب قدرت نے بھی ایسی ہی بڑی غلطی کی اور کہا تھا کہ زور اور قدرت ہی سبھی کچھ ہے، یوں انہوں نے انسان کی روحانی اور نفسیاتی قوتوں کو فراموش کر دیا تھا۔ چنانچہ خدمت خلق کے سلسلے میں بھی ایک ایسی ہی بڑی غلطی وجود رکھتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دوں۔

وہ لوگ لگاتے ہیں: خدمت خلق کا مطلب کیا ہے؟ آپ بتائیں کہ کس چیز میں خلق کی خدمت؟ ذرا وضاحت کریں کہ کس چیز میں ہم خلق خدا کی خدمت کریں۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ خلق خدا کے پیٹ کی خدمت یعنی خلق خدا بھوکے ہیں اور اس کے پیٹ کی خدمت کرنی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھوکے انسانوں کو سیر ہونا چاہیے۔ پھر خلق خدا کے تن کی خدمت کرنی چاہیے اور لوگ ننگے ہیں تو انہیں پوشاک مہیا ہونی چاہیے۔ انہیں گرمی اور سردی سے محفوظ ہونا چاہیے، اس لیے ان کے پاس رہنے کا ٹھکانا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انہیں آزادی فکر و عمل میسر نہیں ہے اور وہ انہیں آزادی ملتی

چاہیے وغیرہ، سب کچھ درست ہے اور خلق خدا کی خدمت ہے۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے: اس بات کا آخری نتیجہ کیا ہے؟ کیا بس یہی کہ ہم نے خلق خدا کی حاجتوں میں سے ایک حاجت پوری کر دی؟ اور ہمارا یہ عمل احسان اور بھلائی ہے لیکن اگر خلق خدا خود اس حالت میں ہو کہ خود اپنی خدمت نہ کرے، لوگ خود اپنے دشمن ہوں۔ یعنی وہ نادانی اور جہالت سے ایسے کام کریں کہ خود اپنے بدترین دشمن بن گئے ہوں۔ گویا کہ انہوں نے البسا راستہ اختیار کر رکھا ہو کہ نہ فقط یہ کہ وہ اپنی خوش بختی کے راستے پر نہ ہوں بلکہ اپنی اور عالم بشریت کی تباہی کے راستے پر چل رہے ہوں۔ اس صورت میں کیا ان سب باتوں کے باوجود ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہیں کہ خلق خدا کی خدمت کرنی چاہیے۔ ہمیں ان کے ہدف سے کیا غرض؟ ہمیں چاہیے کہ ان کے پیٹ کو سیر کر دیں۔ جب ان کا پیٹ بھر جائے تو وہ کس راستے پر چلتے ہیں، ان کا ہدف کیا ہوتا ہے اور اس وقت وہ کس راستے پر چل رہے ہیں، کیا ان چیزوں سے ہمیں کوئی مطلب نہیں؟ یا بات یہ نہیں ہے اور انسانوں کی خدمت اس شرط کے ساتھ ہونی چاہیے کہ وہ حقیقت میں ان کی انسانیت کی خدمت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی خدمت کے ذریعے انسانیت کی خدمت ہو، یعنی انسانی قدروں کی خدمت ہو اور خلق خدا کی خدمت ہو۔ یہ وہ طریقہ ہے کہ اس میں ایک انسانی قدر دوسری انسانی قدروں کے راستے پر چلتی ہے۔ اگر وہ دوسری انسانی قدروں کے راستے پر نہ چلے تو پھر خلق خدا کی خدمت کرنا ایک پیسہ بھر بھی قیمت نہیں رکھتا۔ یہاں مجھے یہ بات کرنی چاہیے جو کچھ لوگ پوچھتے ہیں کہ جب لوگ خلق خدا کے خیر خواہ ہوں اور اس کی خدمت

کریں تو کیا درحقیقت خدا کے تمام احکام، ایمان کی اصل اور تمام عبادتیں اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں؟ ہاں ہمیں چاہیے کہ ایمان رکھتے ہوں تاکہ ایمان کے زیر سایہ خلق خدا کی خدمت کریں۔ کیونکہ عبادت کے زیر سایہ خلق خدا کی بہتر خدمت کی جاسکتی ہے۔ تمام اسلامی احکامات اور بنی نوع انسان کے بزرگوں کے تمام اقوال میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس چیز کی تمہید ہے کہ خلق خدا کی خدمت کی جائے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ خود خلق خدا بالآخر کیا بننا چاہتی ہے۔ ہم جواب دیتے ہیں کہ خلق خدا کی خدمت کی جائے تو آخر خود خلق خدا کیا ہدف رکھتی ہے اور کیا چاہتی ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے ایمان اور عبادت خدمت خلق کی تمہید نہیں ہے، بلکہ خدمت خلق ایمان اور عبادت کی تمہید ہے۔ خدمت خلق عقلمند ہونے، عالم ہونے اور دوسری قدروں کو اپنانے کا نام ہے۔ یعنی ہمیں مخلوق کی خدمت کرنی چاہیے تاکہ اسے ایمان، خدایرستی اور دوسری قدر کی طرف مائل کر سکیں۔ خدمت خلق ایمان، حقیقہ اور بنیاد ہے نہ کہ ایمان اس کی تمہید ہے۔ خواہ ان میں سے کوئی بھی (در اصل کسی دوسرے کی تمہید نہ ہو۔

اسلام کی نظر میں خدمت خلق ایمان کی تمہید ہے اور ایمان خدمت خلق

کی تمہید نہیں ہے۔ اسلام کا مکتب یہی ہے اور وہ یہی بات کہتا ہے اور حقیقہ ہم اس پر غور کرتے ہیں تو اس کا یہی مفہوم نکلتا ہے۔ لیکن اگر مکتب خدمت و محبت کی بات مانی جائے تو ہمیں انسانوں کی انسانیت سے قطع کر کے انہیں دیکھنا ہو گا۔ گویا کہ ہمیں لومچیا اور شومبے کو ابک ہی سطح پر رکھ کر دیکھنا چاہیے، کیونکہ وہ دونوں انسان ہیں، دونوں پیٹ رکھتے ہیں، دونوں بھوکے ہیں اور ممکن ہے کہ تنگے بھی ہوں۔ مکتب محبت ان دونوں میں کوئی فرق

روا نہیں رکھنا کہ علم الحیات کے مطابق وہ دونوں ایک ہی طرح کے جذبات رکھتے ہیں۔ میں نے بعض چوٹی کے مجلات دیکھے ہیں جو اسلامی عرفان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عرفاء کوئی معمولی درجے کے لوگ نہیں بلکہ انہوں نے بڑی ہی بلند باتیں کہی ہیں۔ انہوں نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں کہ عرفان آخر کار خدمت خلق کی طرف توجہ کرتا ہے لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے! عرفان آخر میں یا وسط میں نہیں بلکہ ابتدا ہی میں خدمت خلق کی طرف توجہ کرتا ہے۔ یعنی خدمت خلق عرفان کی انتہا نہیں اور یہ اس کے ابتدائی کاموں میں سے ہے۔ ہم اس مطلب کو اپنی تعبیر کے مطابق یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ خدا کے نزدیک ہونا خدمت خلق کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ خدمت خلق خدا کے نزدیک ہونیکا وسیلہ ہے۔ پس مکتب محبت پر بھی دو اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ محبت کو انسانیت کی واحد قدر مانتے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ محبت کو انسانیت کی انتہا تصور کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام ان دونوں نظریوں کو قبول نہیں کرتا۔ انسان اور اسلام محبت اور خدمت خلق کو قبول کرتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے لیکن یہ انسانی قدر ہے کہ جسے شروع ہی سے اختیار کرنا چاہیے نہ کہ یہ انسانیت کی سیر کا انتہائی مقام ہو۔ گویا کہ انسانیت کی سیر خدمت خلق سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اصلی ہدف اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔

لَا تَحْزَنُ وَلَا تَفْوَتْ إِذْ يَأْتِيَنَّكَ الْغَلِيّ الْعَظِيمُ



## النصوص العربية

لَهُ وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ  
لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ  
لَهُ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي .

سَهُ وَنَزَّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ . وَلَا  
يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا .

سَهُ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا .

سَهُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ  
أَبْوَابًا .

لَهُ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا ينفقُونَهَا فِي سَبِيلِ  
اللَّهِ فَبُشِّرْهُمْ بَعْدَ آيٍ أَلِيمٍ . يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ  
فَتَكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وظُهُورُهُمْ . هَذَا مَا كُنْتُمْ  
لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ .

سَهُ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ .  
سَهُ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهِ لِلْجَبِينِ .

سَهُ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا .

لَهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ  
لَهُ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا .



۳۳۳

۱۲ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ. وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ. وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ.

۱۳ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا الدُّنْيَا دَارٌ مَجَازٍ وَالْآخِرَةُ دَارُ قَرَارٍ فَخُذُوا مِنْ سَمَرَكُمُ لِمَقَرَّكُمْ وَلَا تَهْتِكُوا أَسْوَارَكُمْ عِنْدَ مَنْ يَعْلَمُ أَسْرَارَكُمْ وَاخْرَجُوا مِنَ الدُّنْيَا قُلُوبَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُخْرَجَ مِنْهَا أَبْدَانُكُمْ فَمِنْهَا اخْتَبَرْتُمْ وَلِغَيْرِهَا خَلَقْتُمْ.

۱۴ لَنْ تَقْدَسَ أُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيفِ فِيهَا حَقُّهُ مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَّبِعٍ.

۱۵ هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلَى حَقِيقَةِ الْبَصِيرَةِ وَبَاشَرُوا رُوحَ الْيَقِينِ وَاسْتَلْزَمُوا مَا اسْتَعْوَرَهُ الْمُتَرَفُّونَ وَأَنَسُوا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُونَ وَصَحَبُوا الدُّنْيَا بِأَبْدَانٍ أَرْوَاحُهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْمَحَلِّ الْأَعْلَى.

۱۶ عَجَبًا لِابْنِ النَّابِغَةِ يَزْعُمُ لِأَهْلِ الشَّامِ أَنَّ فِي دُعَابِهِ وَآيِي أَمْرِهِ تِلْكَابَةَ أَعْمَافُسٍ وَأَمَارُسٍ لَقَدْ قَالَ بَاطِلًا وَنَطَقَ أَمْنًا.

۱۷ هُوَ الْبَكَاءُ فِي الْمَحَارِبِ لَيْلًا

هُوَ الضَّحَاكُ إِنْ جَدَّ الضَّرَابُ

۱۸ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيَدًا. إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا.

صلى الله عليه وسلم

بسم الله الرحمن الرحيم

١٩ جَمَعَتْ فِي صِفَاتِكَ الْأَضْدَادُ  
وَلِهَذَا عَزَّزْتَ لَكَ الْإِنْدَادُ

٢٠ خُلِقَ يَخْجِلُ النَّسِيمَ مِنَ اللَّطْفِ  
وَبَعَثَ يَذُوبُ مِنْهُ الْجَمَادُ

٢١ أَحْسَبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ

٢٢ مَلِكُنِي حَبِيبِي وَأَنَا جَالِسٌ فَسَنَحَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَالِهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَاذَا لَقِيتَ مِنْ أَمَّتِكَ مِنَ

الْأَوْدِ وَاللَّدَى؟ فَقَالَ أَدْعُ عَلَيْهِمْ فَقُلْتُ أَبْدَلْنِي اللَّهُ بِهِمْ

خَيْرًا مِنْهُمْ وَأَبْدَلَهُمْ لِي شَرًّا لَمْ أَرَهُ

٢٣ دَعُوهُنَّ فَإِنَّهُنَّ صَوَائِعُ تَتَّبِعُهُمَا تَوَاجِعُ

٢٤ وَمَا كُنْتُ إِلَّا كَقَارِبٍ وَرَدٍّ وَطَالِبٍ وَجَدٍ

٢٥ مَا زِلْتُ أَفْخَصُ عَنْ مَكُونِ الْأَمْرِ وَأَبَى اللَّهُ إِلَّا اخْفَاءً

٢٦ خَلُّوا سَبِيلَ الْمُؤْمِنِ الْمُجَاهِدِ فِي اللَّهِ لَا يُعْبَدُ غَيْرُ الْوَاحِدِ

وَيُوقِظُ النَّاسَ إِلَى الْمَسَاجِدِ

٢٧ تَهَدَّمَتْ وَاللَّهِ أَرْكَانُ الْهُدَى وَأَنْطَمَسَتْ أَعْلَامُ الشُّقَى وَ

انْفَصَمَتِ الْعُرْوَةُ الْوُثْقَى قَتَلَ ابْنُ عَمِّ الْمُصْطَفَى قَتَلَ

الْوَصِيَّ الْمُجْتَبَى قَتَلَ عَلَى الْمُرْتَضَى قَتَلَهُ أَشَقَى الْأَشْقِيَاءِ

٢٨ صَدِيقُ كُلِّ امْرِئٍ عَقْلُهُ وَعَدُوُّهُ جَهْلُهُ

٢٩ إِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ أَوْعِيَّةٌ فَخَيْرُهَا أَوْعَاهَا

٣٠ اللَّهُمَّ بَلَى لَا تَخْلُوا الْأَرْضَ مِنْ قَائِمِ اللَّهِ بِحُجَّةٍ إِمَّا ظَاهِرًا

مَشْهُورًا وَلِمَا خَافُوا مَعْمُورًا لِيَلَا تَبْطُلَ حُجَجُ اللَّهِ وَبَيِّنَاتُهُ

وَكَمْ ذَا وَآيِنٍ أُولَئِكَ هِ أُولَئِكَ . وَاللَّهُ الْاَقْلُونِ عَدَدًا وَ  
الْاَعْظَمُونَ عِنْدَ اللَّهِ قَدَرًا يَحْفَظُ اللَّهُ بِهِمْ حُجَجَهُ وَبَيِّنَاتِهِ  
حَتَّى يُودِعُوَهَا نُظْرَاءَهُمْ وَيَرْعُوَهَا فِي قُلُوبِ اَشْبَاهِهِمْ  
هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلَى حَقِيقَةِ الْبَصِيرَةِ .

۳۱ وَبَاشَرُوا رُوحَ الْيَقِينِ وَاسْتَلاَنُوا مَا اسْتَعَوْرَهُ الْمُتَرْفُونَ وَ  
وَأَسْأَلُوا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُونَ .

۳۲ وَصَحَبُوا الدُّنْيَا بِأَبْدَانِ اَرْوَاحِهَا مُعَلَّقَةً بِالْمَحَلِّ الْاَعْلَى .

۳۳ اَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ .

۳۴ فَلَعَلَّكَ يَا حَجَّ تَفْسِكَ عَلَى اَثَارِهِمْ اَنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا  
الْحَدِيثِ اَسْفًا .

۳۵ طه مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَنْشَى

۳۶ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ  
حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ .

۳۷ وَمَا طَنَنْتُ اَنَّكَ تُجِيبُ اِلَى طَعَامِ قَوْمٍ عَابِلُهُمْ مَجْمُوعٌ  
وَعَنِيَهُمْ مَدْعُوٌّ .

۳۸ وَلَوْ شِئْتُ لَاهْتَدَيْتُ الطَّرِيقَ اِلَى مُصْنَفِ هَذَا الْعَسَلِ وَ

لُبَابِ هَذَا الْقَمَحِ وَنَسَائِجِ هَذَا الْقَزِّ وَلَكِنْ هِيَ هَاتِ اَنْ  
يُعْلِبَنِي هَوَايَ وَيَقُوْدَنِي جَشَعِي .

۳۹ وَلَعَلَّ بِالْحِجَارِ اَوَالِيَمَامَةٍ مِّنْ لَاَ طَمَعَ لَهُ فِي الْقُرْصِ وَلَا  
عَهْدَ لَهُ بِالشَّبَعِ .

۴۰ اَوَابِيْتِ مِبْطَانًا وَحَوْلِي بُطُونٌ غَرَضِي وَالْبَادُ حَرِي .

۳۳۵

۴۱۰ أَقْنَعُ مِنْ نَفْسِي يَأْنِ يُقَالُ هَذَا أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ وَلَا أَشَارِكُهُمْ  
فِي مَكَارِهِ الدَّهْرِ.

۴۱۱ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى  
الْخَاشِعِينَ.

۴۱۲ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ.

۴۱۳ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ  
أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ.

۴۱۴ لَا يَعْرِفُ مَا هُنَالِكَ إِلَّا يَصَاهُغُنَا

۴۱۵ الَّذِينَ آمَنُوا وَظَلَمْنَا قُلُوبَهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَّا يَذْكُرُوا اللَّهَ  
تَطْمَعِينَ الْقُلُوبُ.

۴۱۶ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ  
بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجِدًا ابْتِغَاءَ وَضْعٍ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا  
سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَشْرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي  
التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ  
فَأَسْتَفْظَ فَاكْتُمُوا عَلَى سَوَإٍ يُعْجِبُ الزَّرْعَ لِيُغَيِّظَ بِهِمُ  
الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ  
مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا.

۴۱۷ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَتْهُمْ  
بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ.

۴۱۸ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَشْرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي  
التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ.

سَعِيدًا .

۸۵ لَا كُفْرًا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمَنْ تَحْتَ أَرْجُلِهِمْ .

۸۶ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ

قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ .

۸۷ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ إِلَّا ابْنِيسَ اسْتَكْبَرُوا

كَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ .

۸۸ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ

سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ .

۸۹ وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى وَأَضَلُّ

سَبِيلًا .

۹۰ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا قَالَ كَذَلِكَ

أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمُ تُنْسَى .

۹۱ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ .

۹۲ يَتَسَوَّمُونَ بِدُعَائِهِمْ رُوحَ الشَّجَاوِرِ .

۹۳ إِنَّ اللَّهَ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى جَعَلَ الذُّكْرَ جِلَاءً لِلطُّلُوبِ تَسْمَعُ

بِهِ بَعْدَ الْوَقْرِ وَتُبْصِرُ بِهِ بَعْدَ الْعُشُوقِ وَتَقَادِرُ بِهِ بَعْدَ

الْمُعَانَدَةِ وَمَا بَرَحَ اللَّهُ عَزَّتْ الْأُلُةُ فِي الْبُرْهَةِ بَعْدَ الْبُرْهَةِ

وَفِي أَرْزَاقِ الْفَتَلَاتِ صِبَادُ نَاجَاهُمْ فِي فِكْرِهِمْ وَكَلَمِهِمْ

فِي ذَاتِ عُقُولِهِمْ .

۹۴ ابْتَدَعَ بِقُدْرَتِهِ الْخَلْقَ ابْتِدَاعًا وَاخْتَرَعَهُمْ عَلَى مَشِيَّتِهِ

۳۳۹

اٰخِرًاۤ اَنْتُمْ سَلَكَ بِهٖمْ طَرِيقَۤیْ اِرَادَتِهٖ وَبَعَثَهُمْ سَبِيلَ مَحَبَّتِهٖ  
۸۸ صَيَّرُوْهُ الْاِنْسَانَ عَالِمًا عَقْلِيًّا مُّضَاهِيًا لِّلْعَالَمِ الْعِلْمِيِّ .

۸۹ يَا يٰهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلَىٰ رَبِّكَ كَدًا فَمَلَا قَبِيْهٖ .

۹۰ الْعِبُوْدِيَّةُ جَوْهَرَةٌ لِّهٖمَا الرُّبُوْبِيَّةُ .

۹۱ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا .

۹۲ مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فَجَرَّ اللّٰهُ يَنَابِيعَ الْحِكْمَةِ مِنْ  
قَلْبِهٖ عَلَى السَّائِيَةِ .

۹۳ قُلْ اِنْ صَلَوٰتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ .

۹۴ اَتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا .

۹۵ لَوْلَا اَنَّ الشَّيَاطِيْنَ يُحْمَلُوْنَ حَوْلَ قُلُوْبِ نَبِيِّ اٰدَمَ لَنَظَرُوْا

اِلَىٰ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ .

۹۶ لَوْلَا تَمْرِيْجُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ اَوْ تَرٰیْكُمْ فِی الْحَدِيْثِ لَسَمِعْتُمْ  
مَا اَسْمَعُ .

۹۷ لَوْلَا تَكْثِيْرٌ فِیْ كَلَامِكُمْ وَتَمْرِيْجُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ لَرَاَيْتُمْ مَا اَرٰی  
وَلَسَمِعْتُمْ مَا اَسْمَعُ .

۹۸ وَلَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّةَ الشَّيْطَانِ حِيْنَ نَزَلَ الْوَحْيُ عَلَيْهِ صَلَّى

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الرَّثَّةُ ؟ فَقَالَ :

هٰذَا الشَّيْطَانُ قَدْ اَبَسَ مِنْ عِبَادَتِهٖ اِنَّكَ تَسْمَعُ مَا اَسْمَعُ وَ

تَرٰی مَا اَرٰی اِلَّا اَنَّكَ لَسْتَ بِنَبِيٍّ وَلَكِنَّكَ لَوْزِيْرٌ وَاِنَّكَ لَعَلٰی

خَائِبٌ .

۹۹ لَصَافَحْتُمُ الْمَلَائِكَةَ وَلَمْ شَيْتُمْ عَلَى الْمَآءِ .







۳۴۱

۹ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ .

۱۰ الدُّنْيَا مَزْرَعَةٌ الْآخِرَةُ

۱۱ الدُّنْيَا مَتَجَرُّ أَوْلِيَاءِ اللَّهِ

۱۲ أَيُّهَا الدَّامِرُ لِلدُّنْيَا الْمُغْتَرُّ بِعُرْوِهَا الْمَخْذُوعُ بِأَبَاطِيلِهَا  
أَتَغْتَرُّ بِالدُّنْيَا ثُمَّ تَذُمُّهَا أَنْتَ الْمُتَجَرِّمُ عَلَيْهَا أَمْ هِيَ  
الْمُتَجَرِّمَةُ عَلَيْكَ ؟

۱۳ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ .

۱۴ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ .

۱۵ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا  
الصَّالِحَاتِ .

۱۶ فَأَمَّا مَنْ ثَمَلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ

خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَ تَارُ حَامِيَةٍ

۱۷ فَأَمَّا مَنْ عَلِيٌّ وَآثَرُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَى

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ

الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى .

۱۸ أَعْدَىٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ .

۱۹ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَىٰ اللَّهُ

أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ .

۲۰ أَلَمْ أَفْرَأَيْتَ مَنْ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ .

۲۱ أَلَمْ يَأْبُرِي نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ .

۳۴۲

۱۲۲ ۱۲۲ مَرْحَبًا بِقَوْمٍ قَضَوْا الْجِهَادَ الْأَصْغَرَ وَبَقِيَ عَلَيْهِمُ الْجِهَادُ الْأَكْبَرُ.

۱۲۳ ۱۲۳ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ.

۱۲۴ ۱۲۴ قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ.

۱۲۵ ۱۲۵ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ.

۱۲۶ ۱۲۶ أَطْلُبُوا الْخَوَاصِّ بِعِزَّةِ الْإِنْفُسِ فَإِنَّ الْأُمُورَ تَجْرِي بِالْمَقَادِيرِ

۱۲۷ ۱۲۷ أَلَمُوتُ فِي حَيَاتِكُمْ مَتَمُّوْرِيْنَ وَالحَيَاةُ فِي مَوْتِكُمْ قَاهِرَةٌ.

۱۲۸ ۱۲۸ أَلَمُوتُ فِي عِزِّ خَيْرٍ مِّنْ حَيَاةٍ فِي ذُلٍّ.

۱۲۹ ۱۲۹ أَلَا وَإِنَّ الدَّعَىٰ بْنَ الدَّعَىٰ قَدْ رَكَزَنِي بَيْنَ اثْنَتَيْنِ بَيْنَ السِّلَةِ

وَالذِّلَّةِ وَهَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ يَا بَنِي اللَّهِ ذَلِكَ لَنَا وَرَسُولُهُ

وَالْمُؤْمِنُونَ وَحُجُورٌ طَابَتْ وَطَهَّرَتْ.

۱۳۰ ۱۳۰ لَا وَاللَّهِ لَا أُعْطِيَكُمْ بَيْدِي أُعْطَاءَ الذَّلِيلِ وَلَا أَفْرُقُ فِرَارِ

الْعَبِيدِ.

۱۳۱ ۱۳۱ إِنَّ الْحَيَاةَ عَقِيدَةٌ وَجِهَادٌ.

۱۳۲ ۱۳۲ أَلَمُوتُ خَيْرٌ مِّنْ رُّكُوبِ الْعَارِ

وَالْعَارُ أَوْلَىٰ مِنْ دُخُولِ النَّارِ

۱۳۳ ۱۳۳ فَمَنْ كَانَ بَادِلًا فِينَا مُهْجَتَهُ مُوْطِنًا عَلَىٰ لِقَاءِ اللَّهِ لِنَفْسِهِ

فَلْيَرْحَلْ مَعَنَا فَإِنِّي رَاحِلٌ مُّصْبِحًا إِنْ شَاءَ اللَّهُ.

۱۳۴ ۱۳۴ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَرُوا لِمَا

أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ

يُحِبُّ الصَّابِرِينَ .

۱۳۵ يَا كَمِيلُ (ابْنُ زِيَادٍ)! مَعْرِفَةُ الْعِلْمِ دَيْنٌ يُدَانُ بِهِ بِهِ يَكْسِبُ  
الْإِنْسَانُ الطَّاعَةَ فِي حَيَاتِهِ وَجَمِيعَ الْأُحْدُوثِ بَعْدَ وَفَاتِهِ  
وَالْعِلْمُ حَاكِمٌ وَالْمَالُ مَحْكُومٌ عَلَيْهِ .

۱۳۶ مَنْ عَلَّمَنِي حَرْفًا فَقَدْ صَيَّرَنِي عَبْدًا .

۱۳۷ يَا يَحْيَى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ .

۱۳۸ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَتْهُمْ  
بُنيَانٌ مَرْصُوصٌ .

۱۳۹ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ  
تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ .

۱۴۰ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ  
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ .

۱۴۱ لَا يَسُبُّوا لِلْمُؤْمِنِينَ أَنْ يَكُونُوا بَغِيلاً وَلَا جَبَانًا .

۱۴۲ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبُحْلِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجَبَنِ .

۱۴۳ أَلْمُؤْمِنُ لِنَفْسِهِ أَصْلَبُ مِنَ الصُّلْدِ .

۱۴۴ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَوَّضَ إِلَى الْمُؤْمِنِ أُمُورَهُ كُلَّهَا وَلَمْ يَقُوضْ

إِلَيْهِ أَنْ يَكُونَ ذَلِيلًا أَمَا تَسْمَعُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى يَقُولُ:

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ فَأَلْمُؤْمِنُ يَكُونُ عَزِيزًا

وَلَا يَكُونُ ذَلِيلًا إِنَّ الْمُؤْمِنَ أَعَزُّ مِنَ الْجَبَلِ الْجَبَلُ يُسْتَفَلُّ

مِنْهُ بِالْمَعْوَلِ وَالْمُؤْمِنُ لَا يُسْتَفَلُّ مِنْ دِينِهِ شَيْءٌ .

۱۴۵ فَوَاللَّهِ مَا عَزَّرَنِي قَوْمٌ قَطُّ فِي عَقْرِ دَارِهِمْ إِلَّا ذُلُّوا .

۳۴۴

۱۴۶ لَا يَمْنَعُ الضَّيْمَ الَّذِينَ وَلَا يُدْرِكُ الْحَقَّ إِلَّا بِالْجِدِّ .  
 ۱۴۷ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ فِي  
 غَيْرِ مَوْطِنٍ لَنْ تُقَدَّسَ أُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيفِ فِيهَا حَقُّهُ  
 مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَعِّعٍ .

۱۴۸ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَ  
 يَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ  
 ۱۴۹ أَشْجَعُ النَّاسِ مَنْ غَلَبَ هَوَاهُ .

۱۵۰ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ  
 وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَيْشَهِدَ عَذَابُهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ .  
 ۱۵۱ كُونَا لِلظَّالِمِ خَصْمًا وَلَا تَحْطُومُوهُ عَوْنًا .

۱۵۲ الْغَيْبَةُ جُهْدُ الْعَاجِزِ .

۱۵۳ مَا زِلْنِي غَيُورًا قَطُّ .

۱۵۴ وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ .

۱۵۵ وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حَيْثُ مَسْكِنًا وَيَتِيمًا وَاسِيرًا  
 إِنَّمَا نَطْعُكُمْ لَوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا .